حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

خطباتِ حکیم الاسلام

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

۱۲

مُرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مُدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیرنگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جلد — ۱۲

آیات، احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

تفسیر سورۂ قلم

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا

اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ o مَآ اَنْتَ بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ o وَاِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ o. وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ o فَسَتُبْصِرُوَیُبْصِرُوْنَ o بِاَیِّکُمُ الْمَفْتُوْنُ o اِنَّ رَبَّکَ ھُوَاَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَاَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عزمِ دعوت...... بزرگانِ محترم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی دعوت دینی شروع کی ،قوم کو ابھارا اور للکارا۔ نیز جب آپ کو نبوت کی بشارت کی گئی اور فرمایا گیا کہ تبلیغ اور دعوت شروع کرو۔ تو آپ نے دعوت الی اللہ شروع کی ۔ انبیاء علیہم السلام کا عزم اور ان کی دعوۃ الی اللہ سے ایک لگن اور دھن اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم کا تو کیا مقام ہوسکتا ہے وہ یہ تھا کی آپ صبح وشام دعوت میں مصروف، جہاں کوئی موقع ملا قوم کے کچھ افراد جمع ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچ جاتے تھے ۔عرب میں دو بازار لگتے تھے سوق عکاظ، اور سوق مجنہ بڑی مارکیٹ لگتی تھی دور دور کے قبائل خرید و فروخت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ جہاں کوئی میلہ منعقد ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچ جاتے ، مجمعوں میں دعوت دیتے ۔لوگوں کے خیموں پہ جا کے دعوت دیتے ۔ غرض کوئی وقت ایسا نہیں تھا کہ آپ دعوۃ الی اللہ کے کام میں مصروف نہ ہوں ۔اس پر قوم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ یہ مجنون ہوگئے ہیں انہیں تو ایک جنون سوار ہے کہ جب دیکھو ایک ہی چیز زبان پر اور ایک ہی بات ہے کہ اللہ کی طرف آؤ۔ دیکھو انہیں جنون ہوگیا ہے اور معاذ اللہ عقل سلب ہوگئی ہے ہر وقت ایک ہی لگن ہے نہ موقع دیکھتے ہیں نہ زمانہ نہ وقت ۔ جب دیکھو اسی میں لگے ہوئے ہیں ۔

کفار کے الزام کی تردید...... حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کی بریت بیان فرمائی کہ آپ مجنون نہیں بلکہ کامل العقل

ہیں، اور اتنی عظیم عقل ہے کہ پوری امت میں جتنی عقل ہوسکتی ہے وہ تنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں آگے تصریحات بھی آئیں گی، غرض حق تعالیٰ نے ان کے اس دعوے کی تکذیب کی کہ وہ غلط کہتے ہیں کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں ہمارے رسول مجنوں نہیں بلکہ اعلیٰ ترین عقل اور دانش کے حامل ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال دانش مندی اور خدائی دعویٰ...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دانش منداور جنون سے بری ہونے کا دعویٰ حق تعالیٰ شانہ نے قسم کھا کر فرمایا: اول تو اللہ کا دعویٰ اس کے سچے ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ پھر اوپر سے قسم بھی کھائی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ اور مؤکد ہو جاتا ہے، تو حق تعالیٰ نے قلم اور قلم سے لکھی ہوئی چیزوں کی قسم کھا کر دعویٰ فرمایا کہ ﴿مَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ﴾ اے پیغمبر! آپ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں اور برکتوں سے بالکل مجنوں نہیں ہیں اور ان کے دعوے بالکل غلط ہیں۔ یہ جھوٹے ہیں تو نٓ اور قلم کی قسم کھائی اور قسم بمنزلہ گواہ کے ہوتی ہے، قسم کھا کر آدمی جو دعویٰ کیا کرتا ہے کہ خدا کی قسم یہ ہے بات تو وہ اللہ کو گواہ اور شاہد بناتا ہے اور کہتا ہے کہ جب خدا میرا گواہ اور شاہد ہے تو اس بات کے جھوٹا ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تو قسم بمنزلہ شاہد اور گواہ کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کا اصول یہ ہے: ''اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَ الْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ.'' (1) مدعی جب کوئی دعویٰ کرے تو دو گواہ پیش کرے تا کہ وہ دعویٰ ثابت ہو اور اگر اس کے پاس گواہ نہ ہوں تو مدعیٰ علیہ سے قسم دلائی جاتی ہے کہ تو قسم کھا کر کہہ دے کہ مدعی جو کہہ رہا ہے وہ غلط کہہ رہا ہے۔ میں اس دعویٰ سے بری ہوں۔ تو مدعیٰ علیہ پر یمین اور قسم کا رکھنا دراصل اس پر گواہ قائم کرنا ہے کہ مدعی کے دو گواہ ہیں اس کا ایک گواہ ہے مگر وہ اصل ہے تو قسم اٹھا کر دعویٰ کرے کہ مدعی کی بات غلط ہے تو اس کا دعویٰ متروک ہو جائے گا۔

نٓ اور قلم کی گواہی...... بہر حال جس چیز کی قسم کھاتے ہیں اس چیز کو گواہی میں پیش کرتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہٗ نے گواہی میں نٓ اور قلم کو پیش کیا نون ایک حرف ہے اور اس کے بظاہر کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس حرف میں اتنے عجائبات چھپے ہوئے ہیں کہ مرکب کلمات میں وہ عجائبات نہیں ہیں جو ان مقطعات حروف میں ہیں، باقی انبیاء علیہم السلام سمجھتے ہیں کہ ان حروف کے اندر کیا معانی چھپے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نون ایک حرف ہے کوئی اس کے معنیٰ نہیں ہو سکتے کوئی کلمہ ہو، کوئی مرکب ہو، کسی معنی پر دلالت کرے تو کہا جائے گا کہ اس کے کوئی معنیٰ ہے۔ لیکن الف، نون، میم، اس کے کوئی معنیٰ نہیں، تو کیسے سمجھا جائے کہ اس میں کوئی معنیٰ ہے؟ اِس لئے عام لوگ نہیں سمجھتے مگر انبیاء علیہم السلام سمجھتے ہیں کہ ان کے حقائق کیا ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام دنیا میں علوم دینے آتے ہیں...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جب پانچ برس کی عمر ہوئی تو ان کی والدہ ماجدہ نے انہیں مکتب میں بٹھلایا۔ ظاہر ہے کہ انبیا علیہم السلام دنیا میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہیں آتے، بلکہ تعلیم دینے کے لئے آتے ہیں۔ ان کے صدقے سے دنیا عالم بنتی ہے تو وہ کسی سے کیا علم لیں؟

---

(1) السنن للدارقطني، الحدود والديات ج:٧ ص: ٣٨٣ رقم:٣٢٣٧. السنن الكبرىٰ للبيهقي ج:٨ ص: ١٢٣.

لیکن والدہ ماجدہ کو کیا خبر تھی کہ یہ پیغمبر ہیں انہوں نے انہیں مکتب میں بٹھلایا جیسے بچوں کو بٹھلاتے ہیں۔ تو استاذ نے کہا کہو الف، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا الف کے کیا معنیٰ ہیں۔ اس نے کہا کہ الف کے بھی کوئی معنیٰ ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ تو مہملات اور بے معنی چیزوں کی تعلیم دینے بیٹھا ہے؟ تو کاہے کا استاذ ہے کہ تجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ جس چیز کو تو سکھا رہا ہے اس کے معنے کیا ہیں؟ مہمل چیزوں کی تعلیم دینے بیٹھا ہے تجھے شرم کرنی چاہیئے۔ اب وہ بے چارہ حیران ہوا کہ آج تک دنیا میں کسی نے الف کے معنیٰ نہیں پوچھے، یہ بچہ الف کے معنی پوچھ رہا ہے۔ استاذ نے کہا مجھے تو الف کے معنی معلوم نہیں، کیا تجھے معلوم ہیں؟ آپ نے فرمایا، ہاں مجھے معلوم ہیں۔ تو اس نے کہا بتاؤ۔ فرمایا تب بتاؤں گا جب تو اپنی جگہ چھوڑ کر شاگردوں کی لائن میں بیٹھ اور میں تیری جگہ بیٹھوں گا پھر بیان کروں گا۔ آخر مجبور ہو کر استاذ کو گدی چھوڑنی پڑی اور شاگردوں کی لائن میں بیٹھا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام استاذ کی جگہ پر بیٹھ گئے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی فطرتیں اس طرح سے بلند ہوتی ہیں، وہ پست ہو کر نہیں آتے، وہ عالی رتبہ ہوتے ہیں، تو یہ گوارا نہیں کیا کہ میں کسی کا شاگرد بنوں، حالانکہ پانچ برس کی عمر ہے اور یہ بھی گوارہ نہیں کیا کہ صورۃً بھی میں شاگرد رہوں اور شاگردوں کے لائن میں بیٹھوں خود جا کر مسندِ درس کے اوپر بیٹھے اور اسے سامنے بٹھلایا۔ اس کے بعد الف کے معنیٰ بیان کرنے شروع کئے۔ تو حرف کی خاصیتیں، ان کے معانی، عجائبات اور وہ علوم دقیقہ بیان کئے کہ استاذ دنگ تھا کہ اس بچے کے پیٹ میں کیا چیز بول رہی ہے۔ پانچ برس کا بچہ اور حقائق بیان کر رہا ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی بلندی فطرت...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہ ذات بابرکات ہیں کہ یہ تو پانچ برس کی عمر میں نکات بیان کر رہے تھے، جب پیدا ہوئے ہیں اور یہود نے آ کر حضرت مریم علیہا السلام سے کہا کہ: ﴿یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا ۝ یٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا ۝﴾ ① اے مریم! یہ تو نے کیا کیا، بلا باپ کا بچہ؟ معاذ اللہ! تو کوئی ناجائز کام کر کے آئی ہے؟ تیرا باپ بھی بُرا نہیں تھا۔ تیری ماں بھی بُری نہیں تھی۔ تو کس سے پیدا ہوئی کہ یہ حرکت کی کہ یہ بغیر باپ کے بچہ لے کر آئی؟ شادی تیری نہیں ہوئی؟ آج تک کسی مرد سے تو نہیں ملی۔ آخر یہ بچہ کہاں سے آ گیا؟ مریم علیہا السلام جانتی تھیں کہ میں پاک ہوں اور یہ بچہ خدا کی دَین ہے اور بطور معجزہ کے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، تو انہیں یقین تھا کہ یہی بچہ میری بریت بیان کرے گا۔ تو فرمایا کہ مجھ سے نہ پوچھو بلکہ بچہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس سے پوچھ لو: ﴿فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا﴾ ہم اس سے کیسے بات چیت کریں جو گود میں پڑا ہوا ہے، دودھ پیتا بچہ ہے کہ وہ ہماری سمجھے گا نہ سمجھا سکے گا۔ ہم کیسے بات کریں؟ تو اشارہ کیا کہ جو کچھ کہے گا یہی کہے گا، مگر بہر حال خود کچھ نہیں بولیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گود میں سے کہا:

﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ

① پارہ: ۱۶، سورۃ: مریم، الآیۃ: ۲۷، ۲۸.

بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ اِلٰى قَوْلِهٖ...... وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا﴾ فرمایا: میں عبداللہ ہوں، اللہ کا بندہ، اللہ نے مجھے کتاب عطا کی ہے، وہ کتاب آنے والی تھی۔ جو چیز یقیناً آنے والی تھی، وہ بمنزلہ اس کے ہے کہ گویا وہ آ گئی وہ کتاب انجیل مقدس ہے۔ مجھے پیغمبر بنایا۔ مجھے برکت والا بنایا میں جہاں بھی ہوں۔ ماں کے پیٹ میں ہوں جب بھی بابرکت ہوں، گود میں ہوں جب بھی بابرکت ہوں گود سے باہر جاؤں جب بھی بابرکت ہوں۔ زمین کے کسی حصے پر چلا جاؤں برکات میرے ساتھ ہیں۔ اور اللہ نے مجھے نماز پڑھنے کی وصیت کی ہے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وصیت کی ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں ان عبادات کے اندر ہوں اور میں اپنی والدہ کی بریت بیان کرنے کے لئے آیا ہوں۔ میری والدہ ان الزامات سے پاک ہے جو تم لگا رہے ہو۔ اور مجھے اللہ نے شقی بنا کر نہیں بھیجا۔ بلکہ سعید اور مبارک بنا کر بھیجا ہے۔ اور مجھ پر اللہ کی سلامتی ہو۔ جس دن پیدا ہوا، اس دن بھی، جس دن انتقال کروں اس دن بھی اور جس دن محشر میں اٹھوں اور پھر زندہ ہوں اس دن بھی، تو میرے لئے مرکزیت سلامتی ہی سلامتی ہے۔ جب میں بابرکت اور باسلامت ہوں۔ تمہارا کوئی الزام مجھ پر نہیں لگ سکتا۔ جب میں پاک بن کر اپنی پاک ماں کے پیٹ سے آیا ہوں تو میری ماں پر کوئی الزام نہیں آ سکتا میری ماں بھی اس الزام سے بَری ہے جو تم اس پر لگا رہے ہو غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہ ذات بابرکات ہیں کہ ان کی عمر مکتب میں پانچ برس کی تھی۔ مگر گود میں جب عبادات کے حقائق، توحید، رسالت، نبوت اور عبادات کے سلسلے بیان کئے۔ تو اس وقت پانچ دن کی بھی عمر نہ تھی۔ اسی وقت پیدا ہی ہوئے تھے۔ تو اس استاذ کے سامنے مکتب میں استاذ کی مسند پر بیٹھ کر حروف کے معانی علوم اور عجائبات بیان کرنے شروع کر دیئے تو لوگ حیران تھے۔

علوم الہامیہ...... مطلب یہ ہے کہ یہ حروف بے معنی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر بڑے بڑے عجائبات اور علوم چھپے ہوئے ہیں۔ مگر ان لوگوں کے لئے جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان علوم تک پہنچنے کا حصہ دیا ہے۔ تو ان علوم کو یا انبیاء علیہم السلام جانتے ہیں یا اولیاء اللہ ان سے واقف ہیں، یہ پڑھنے پڑھانے سے نہیں آتے ان پر ان کا انکشاف ہوتا ہے اور الہام ربانی سے یہ علوم آتے ہیں۔ میں نے حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یہ ہمارے جد امجد اور دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے۔ تو ان کے تمام تلامیذ نے جو دارالعلوم دیوبند کے مدرسین تھے۔ سب نے مل کر عرض کیا کہ! حضرت ایک تفسیر کی کتاب ہمیں پڑھا دیجئے۔ حالانکہ ساری کتابیں پڑھ چکے تھے۔ مگر مزید علوم حاصل کرنے کے لئے درخواست کی، حضرتؒ نے وہ قبول فرمائی اور ﴿الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ اس پر پہلی تقریر کی، حروف مقطعات کے وہ علوم و عجائبات بیان کیے کہ یہ تمام بڑے بڑے علماء جو خود آئمہ فنون تھے۔ حیران تھے یہ علوم کہاں سے آ رہے ہیں۔ غرض یہ علوم یا تو انبیاء علیہم السلام کو معلوم ہوتے ہیں یا حق تعالیٰ شانہٗ اپنے خزانہ غیب سے اپنے مخصوص اولیاء کرام کو دیتے ہیں۔

تاثراتِ حُروف...... شیخ محی الدین ابن عربیؒ جو امام الصوفیاء اور امام المحققین ہیں انہوں نے اپنی کتاب

''فتوحات مکیہ'' میں دعویٰ کیا ہے کہ عالم میں جتنی کارگذاریاں ہو رہی ہیں وہ سب حروف کے ثمرات ہیں، ہر حرف کی خاصیت ہے کہ کسی حرف سے مل کر اپنا کام کر رہے ہیں، کسی حرف کی خاصیت سے دنیا کی زمین کام کر رہی ہے۔ فضا کام کر رہی ہے، یہ سب حروف کی تاثیرات ہیں۔ اور یہ سارا عالم دو حروف سے ہی تو پیدا ہوا ہے اور وہ ہیں :کُنْ حق تعالیٰ نے فرمایا: کُنْ ہو جا، تو کاف اور نون دو حروف تھے اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ عالم بن کر کھڑا ہو گیا۔ تو عالم کی زندگی اور وجود فی الحقیقت ان دو حرفوں میں تھی۔

چنانچہ شیخ محی الدین ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں حروفِ مقطعات ہیں جیسے الٓمٓ، یا طٰسٓمٓ. یاحٰمٓ عٓسٓقٓ. یا حٰمٓ ان کے اندر دنیوی اقوام کی تاریخیں چھپی ہوئی ہیں اور اس کے کچھ قواعد بیان فرمائے ہیں کہ اگر ان قوعد سے تاریخیں نکالیں تو پورے عالم کی تاریخ نکل آئے گی۔ چنانچہ اس کی کچھ اصطلاحات ذکر کی ہیں مگر وہ فن اٹھ گیا۔ آج کسی کو پتہ نہیں کہ ان اصطلاحات کے کیا معنٰے ہیں وہ کس طرح سے معلوم ہوتی ہیں۔

نٓ اور قلم کی وجہِ قسم ...... بہر حال حروف کے اندر علوم اور عجائبات چھپے ہوئے ہیں تو حق تعالیٰ نے نٓ کی بلاوجہ قسم نہیں کھائی اور نہ ہی بے وجہ قلم کی قسم کھائی ہے بلکہ ان کے علوم کو شاہد بنایا ہے کہ ہمارا رسول مجنون نہیں ہے بلکہ اعلیٰ ترین دانش اور اعلیٰ ترین عقل کا حامل ہے اس میں جنون کے کیا معنٰی ہیں۔ غرض دو چیزیں پیش فرمائی ہیں ایک حرف نون اور ایک قلم۔ یہ اس لئے کہ دونوں چیزوں کو انبیاء علیہم السلام سے مناسبت ہے نون (نٓ) کو نبوت سے مناسبت ہے اور قلم کو نبی کی ذات سے مناسبت ہے تو نبوت کی حقیقت بھی بیان ہو گئی اور ذات نبوی کی حقیقت بھی بیان ہو گئی تو نٓ کو نبوت سے مناسبت کاملہ ہے۔ مثلاً تین حروف ایسے ہیں کہ وہ اپنی ابتداء میں بھی خود ہیں اپنی انتہا میں بھی خود ہی ہیں۔ ان تین حرفوں کے سوا اور حرفوں میں یہ بات نہیں ہے۔ وہ حروف یہ ہیں:۔ نون۔ میم، اور واؤ (ن۔م۔و) نون جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی نون آخر میں بھی نون۔ میم جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی میم اور آخر میں بھی میم اس طرح واؤ جب کہتے ہیں تو اوّل میں بھی واؤ اور آخر میں واؤ۔ تو تین لفظ ایسے ہیں کہ اوّل و آخر میں وہ خود بولے جاتے ہیں، گویا اوّل بھی آخر بھی ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے کہ اوّل بھی ہے آخر بھی ہے۔ کائنات کا ایک ذرہ موجود نہیں تھا۔ اللہ موجود تھے جب کائنات کو پیدا کر دیا۔ ایک وقت آئے گا جب کوئی ذرہ کائنات کا باقی نہیں رہے گا اور اللہ موجود ہوگا۔ تو اللہ ہی اوّل ہے اور اللہ ہی آخر ہے۔ چیزیں آئیں گی، جائیں گی، پیدا ہوں گی، ختم ہوں گی، مگر وجودِ حق ہر وقت موجود ہے، اوّل میں بھی اور آخر میں بھی۔

یہی شان جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخلوقات میں ہے، کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی اول ترین مخلوق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَوَّلُ ما خلق اللّٰہ نوری سب سے اول حق تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا۔ اور نور سے مراد حقیقت محمدیہ ہے۔ گویا سب سے پہلے میری حقیقت کو بنایا تو اولین مخلوق

میں ہوں۔اس کے بعد اس کے آثار اور طفیل میں اور چیزیں بننا شروع ہوئیں، مگر اولین مخلوق حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے، اس کا حاصل یہ نکلا کہ کائنات نہیں بنی تھی اور آپ بنائے جا چکے تھے۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات میں اول ہیں۔اسکے بعد خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) بنا کر آپ کا ظہور ہوا تو انبیاء علیہم السلام تمام منقلب ہو چکے تھے، کوئی نبوت دنیا میں باقی نہیں تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی تھے۔تو آپ ہی اخیر میں بھی نبی ہیں اور آپ ہی شروع میں بھی نبی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کُنْتُ نَبِیًّا وَّاٰدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ'' میں اس وقت نبی تھا جس وقت آدمؑ کا پتلا ہی بنایا جا چکا تھا۔ابھی ان کی مٹی کا خمیر کیا جا رہا تھا۔اور میں نبی بنایا جا رہا تھا۔یعنی میری حقیقت میں علم ڈال دیا گیا تھا۔اس لئے کہ نبوت کی حقیقت وحی ہے۔ اس لئے نبی اس کو کہتے ہیں کہ جس پر اللہ کی وحی آئے، اور وحی کی حقیقت علم کے سوا اور کیا ہے؟ واقعات اور احکام کی وحی کی جاتی ہے۔وحی کی حقیقت علم ہے۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات سے پہلے نبی تھی۔اور نبوت کی حقیقت وحی ہے اور وحی حقیقت علم ہے۔اس کا مطلب یہ کہ اللہ نے میری حقیقت کو علم سے بنایا یعنی میری حقیقت کے اندر علم گوندد یا گیا تو جب تک میری حقیقت ہے میرے اندر علم ہے، تو آپ کے اول میں بھی علم اور آخر میں بھی علم ہے تو اول میں بھی آپ نبی کہ سب سے پہلے بنائے گئے اور جب سارے انبیاء علیہم السلام دنیا سے اٹھالئے گئے تو آخر میں پھر آپ نبی ہیں۔غرض اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوۃ اول میں بھی ہے اور آخر میں بھی ہے جیسے حق تعالیٰ کی الوہیت اول میں بھی ہے آخر میں بھی ہے، تو نون (ن) کے حرف کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسبت ہے کہ آپ اول میں بھی ہیں آخر میں بھی ہیں۔اس طرح حرف نون ہے کہ نون اول میں بھی ہے اور آخر میں بھی ہے۔واؤ کو بھی یہی مناسبت ہو سکتی ہے اور میم کو بھی۔کیونکہ اول اور آخر میں نون والی کیفیت یہاں بھی ہے۔

کمال ''ن'' سے کمال نبوت پر استدلال......لیکن علماء لکھتے ہیں کہ ان تینوں حروف میں نون افضل ترین ہے، اس واسطے کہ واؤ اگر ترقی کرے گی تو آواز اوپر کو اٹھ جائے گی۔ایک خلاء پیدا ہو جائے گا۔اور میم ترقی کرے تو نیچے کی طرف جائے گی۔کیونکہ میم کی آواز نیچے کی طرف جھکتی ہے اور نون بیچ میں متوسط ہے کہ اس میں آواز اٹھتی ہے نہ جھکتی ہے۔بالکل بیچ بیچ کا ایک حصہ ہے تو ''خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا'' ''بہترین چیز وہ ہے جو متوسط اور معتدل ہو'' نہ اوپر نہ نیچے بلکہ اپنے موقف پر ہو۔ایسے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں کمالات بھرپور ہیں۔افراط وتفریط سے بری، کمالِ اعتدال کے مطابق ہیں۔

جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام میں شان جلال غالب ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں جمال کی شان غالب ہے۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں کمال کی شان غالب ہے، اور کمال اعتدال کو کہتے ہیں نہ ادھر جھکا ہوا نہ ادھر، بلکہ اپنے موقع پر فٹ ہے اور سیدھا اپنے موقع پر چسپاں ہے۔تو کمال اعتدال سے ذات بابرکات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھرپور ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت انتہائی عدل واعتدال پر ہے جبھی تو

نبی بھی کمال اعتدال پر ہے غرض نون میں بھی یہی کمال اعتدال ہے۔

کمال نبوت سے کمال اعتدال پر استدلال...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جُسۂ مبارک کو دیکھا جائے تو اس کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت طویل تھے نہ قصیر تھے۔ بلکہ معتدل قامت تھے ایسی معتدل اور میانہ قیامت کہ آدمی دیکھ کر یوں کہے کہ یہ اتنی ہی ہونی چاہیے تھی نہ اس سے زیادہ ہوسکتی تھی نہ اس سے کم ہوسکتی تھی۔

یہ آگے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بزرگی تھی کہ سب میں اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتے تھے صحابہ کرامؓ میں بڑے بڑے طویل القامت لوگ بھی تھے۔ حضرت عباسؓ دو آدمی کے برابران کا تنہا قد تھا۔ بیٹھتے تھے تو دو تین آدمی کی جگہ گھیرتے تھے یہ تو جُثہ تھا۔ مجلس مبارک میں لمبے لمبے صحابہ کرام بھی بیٹھے ہیں مگر اونچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نظر آتے تھے، تو یہ بزرگی اور اعزاز تھا۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قد وقامت میں بھی اعتدال تھا نہ افراط ہے نہ تفریط۔

اسی طرح آپ کے علوم وکمالات میں بھی اعتدال ہے کہ ان میں نہ افراط ہے نہ تفریط ہے اور یہی شان لفظ نون کی ہے کہ اس میں بھی نہ افراط ہے نہ تفریط ہے، اس واسطے حق تعالیٰ شانہٗ نے لفظ نون کو شہادۃ میں پیش کیا کہ جیسے نون میں حد کمال ہے اسی طرح ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بابرکات میں بھی کمال ہے۔ اور جس کا کمال کمال اعتدال لئے ہوئے ہو اسے جنون سے کیا واسطہ؟ جنون تو اسے ہی کہتے ہیں کہ یا عقل بالکل نہ رہے کہے کہ میں مجنوں ہوگیا یا اتنی بڑھ جائے کہ حد عقل میں نہ رہے اسے بہزار کہتے ہیں وہ بھی ایک قسم کا جنون ہے۔ لیکن کمال اعتدال جب ہوگا اس میں ظاہر بات ہے کہ جنون کا کوئی شائبہ نہیں آسکتا۔ تو نون کو شاہد بنا کر پیش کیا۔

خصوصیت نُون (نٓ) سے خصوصیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر استدلال...... اسی طرح سے نون (نٓ) کی کچھ اور بھی خصوصیات ہیں۔ جو لوگ عربیت سے واقف ہیں نیز صرف اور نحو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ نون جب فعل کے آخر میں آتا ہے تو تاکید کا کام دیتا ہے۔ اگر ہم یوں کہیں۔ لَاَفْعَلَ كَذَا میں ایسا کروں گا لیکن اگر نون ملا کر یوں کہیں لَاَفْعَلَنَّ كَذَا جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایسا ضرور کروں گا۔ تو فعل کی تاکید کر دیتا ہے۔ غرض فعل پر داخل ہوتا ہے تو نون تاکید کا ذریعہ بنتا ہے اور جب حرف پر داخل ہو تو حرف کے اندر تحسین اور آواز کی خوبی پیدا کر دیتا ہے۔ آواز کو جب گناتے ہیں تو غنہ بیچ میں آئے گا تو آواز کی خوبی پیدا ہوگی تو حسن صَوت اس سے متعلق ہے اور جس کی آواز اچھی ہوتی ہے اس میں اس قسم کا غنا ہوتا ہے۔ غِنا اور غُنّہ ایک چیز ہے۔ نون غنہ ہے۔ نون غنہ جب آئے گا تو آواز میں گونج ہوگی۔ جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور سینہ کی نالیاں کچھ بند ہو جاتی ہیں۔ غنہ باقی نہیں رہتا اس لئے خوش آوازی نہیں رہتی۔ جیسے مجھ جیسا آدمی۔ کہ آواز بہت عمدہ تھی بڑھاپے نے آکر نالیاں کچھ بند کر دیں، گونج باقی نہیں رہی اس لئے حسنِ صوت نہیں رہی۔ جیسے آپ نے باجے دیکھے ہوں گے مثلاً ہارمونیم ہے اس میں ایک سُر بہت اونچا ہوتا ہے۔ ایک اس سے کم اور معتدل اور ایک بالکل اخیر میں، ان تینوں کو ملائیں گے تو ایک ساز پیدا ہو جاتا ہے اس سے گانے بجانے میں خوش نمائی سی پیدا ہو جائے گی اگر ایک ہی آواز رہ جائے تو

ہارمونیم میں کوئی خوبی نہیں اوپر نیچے بیچ تینوں جمع ہو جائیں تو خوشنمائی پیدا ہو جاتی ہے۔غرض نون کے اندر خصوصیت سے یہ بات دیکھی گئی ہے کہ جس حرف میں اس کو ملا دو اس میں غنہ پیدا ہوتا ہے اور غنہ سے غنہ پیدا ہوتا ہے تو حسن صوت پیدا ہو جاتی ہے۔اگر اس کو اسم کے ساتھ ملا دیں اس کے اندر ایک خوبی پیدا ہو جاتی ہے،غرض فعل سے ملائیں تو تاکید ہو جائے،حرف سے ملائیں تو حسن صوت بن جائے گا۔اور اسم کے ساتھ ملا دیں تو اس میں خوشنمائی اور تفخر و مباہات پیدا ہو جائے گی۔یہی شان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔حق تعالیٰ شانہٗ کے ہاں کچھ افعال ہیں کچھ حروف ہیں،کچھ اسماء ہیں حق تعالیٰ شانہٗ کے جو افعال ہیں وہ درحقیقت ملائکہ علیہم السلام ہیں۔ملائکہ علیہم السلام بمنزلہ فعلِ حق کے ہیں،نہ جیسے دست و بازو ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا گیا ﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ ① عالم کی تدبیریں ملائکہ کے ذریعے ہو رہی ہیں۔بنانے والے حق تعالیٰ ہیں۔لیکن اس فعل کا واسطہ ملائکہ ہیں۔جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہم نے لکھا۔لکھا تو ہم نے لیکن لکھنے کا واسطہ ہمارا ہاتھ بنا۔مگر ہاتھ ہمارے قلب کے خلاف نہیں کر سکتا جب لکھنے کا ارادہ کریں گے ہاتھ حرکت کرے گا۔تو ہاتھ کو کہا جائے گا کہ یہ ہمارا آلہ فعل ہے۔اسی طرح آنکھ ہمارا آلہ ابصار ہے کہ اس کے ذریعے ہم دیکھتے ہیں۔دیکھنے والا قلب ہے مگر آنکھ اس کے لیے راستہ بنتی ہے۔دل جب چلنے کا ارادہ کرتا ہے تو پیر حرکت کرنے لگتے ہیں تو پیر گویا قلب کے چلنے کا آلہ ہے۔وہ اس کے واسطے سے چلتا ہے۔غرض ہاتھ پیر آنکھ ناک کان یہ تمام وسائل فعل ہیں اور افعال کا تعلق قلب سے ہے۔فعل قلب کا ہوتا ہے،مگر اعضاء اس کے لئے واسطہ ہوتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کے ہاں بھی یہی ہے کہ ماں کے رحم پر ملائکہ مقرر ہیں جو بچے کو بناتے ہیں،تو بنانے والے حق تعالیٰ ہیں مگر وہ ملائکہ بمنزلہ ہاتھ کے ہیں جن کے ذریعہ بنایا جا رہا ہے،جب زندگی چھینی جاتی ہے تو ملائکہ موت آتے ہیں موت دینے والے حق تعالیٰ ہیں مگر حضرت ملک الموت اور ان کے اعوان و انصار اس کے لئے واسطہ بنتے ہیں۔کھیتی اُگتی ہے تو ملائکہ مقرر ہیں جو بیج میں سے کونپل کو نکالتے ہیں کونپل بڑھا کر اوپر لے جاتے ہیں،تو بڑھانے والے حق تعالیٰ ہیں لیکن ملائکہ علیہم السلام واسطہ بنے ہوئے ہیں،غرض ملائکہ بمنزلہ فعل حق کے ہیں۔اس لئے جب وہ فعل تمام ہو جاتا ہے،اور ملائکہ اس کا ذریعہ بنتے ہیں تو پھر ان کو ترقی دی جاتی ہے اور عروج دیا جاتا ہے۔اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ افعال خداوندی بواسطہ ملائکہ کے ہیں اور ملائکہ کا عروج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے ہے،جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ آتا ہے تو وہ بڑھ جاتے ہیں اور ان کو ترقی ہوتی ہے،مثلاً حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا:"اِنَّ لِلّٰهِ مَلٰٓئِكَةً سَيَّاحِيْنَ" اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی ایک جماعت بنائی ہے جو اربوں اور کھربوں میں ہے،اللہ ہی ان کی تعداد جانتا ہے،یہ اس لئے ہیں کہ وہ دنیا میں گھوم کر دیکھیں کہ ذکر اللہ کہاں ہو رہا ہے،اللہ کا نام کہاں لیا جا رہا ہے،اس کے احکام کہاں بیان کئے جا رہے ہیں،تو جب کوئی جلسہ یا مجلس

① پارہ: ۳۰، سورۃ النازعات، الآیۃ: ۵.

تعلیم دین کی، تعلیمِ قرآن کریم، تعلیم حدیث کی یا وعظ و پند کی منعقد ہوتی ہے، تو یہ اربوں کھربوں ملائکہ جو اسی ٹوہ میں رہتے ہیں یہ اس مجلس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور اس مجلس کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں، پھر اپنے سے پچھلوں کو آواز دیتے ہیں کہ: ''هَلُمُّوْا اِلٰی مَقْصَدِکُمْ'' دوڑو تمہارا مقصد اس مجلس میں ہو رہا ہے، وہ اپنے سے پچھلوں کو آواز دیتے ہیں اور وہ اپنے سے پچھلوں کو، تو اس مجلس کے اردگرد ملائکہ کا اتنا ٹھٹ لگ جاتا ہے کہ آسمان تک ملائکہ ہی ملائکہ ہوتے ہیں، غرض مجلس کے اردگرد اربوں کھربوں ملائکہ جمع ہو جاتے ہیں، جب یہ مجلس ختم ہوتی ہے تو ان کو عروج ہوتا ہے اور وہ آسمان کی طرف چڑھتے ہیں، اور حق تعالیٰ ان سے سوال کرتے ہیں کہ کہاں گئے تھے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہاں گئے تھے، مگر سوال حکمت ہے، پوچھتے ہیں کہاں گئے تھے؟ عرض کرتے ہیں آپ کے بندوں میں گئے تھے، اور ان کی ایک مجلس میں حاضر ہوئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ بندے کیا کر رہے تھے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کیا کر رہے تھے، مگر ان کی زبان سے اقرار کرانا ہے، وہ کہتے ہیں کہ بندے آپ کی یاد میں مشغول تھے، آپ کی جنت کے طالب تھے، آپ کی جہنم سے خائف تھے، رحمت مانگ رہے تھے، غضب سے ڈر رہے تھے؟ آپ کے پیغمبروں کی زبان سے سنا ہے اور ایمان لائے ہیں، فرماتے ہیں کیا انہوں نے جہنم کو دیکھا ہے جو اس سے ڈر رہے تھے، عرض کرتے ہیں دیکھا تو نہیں ہے، آپ کے پیغمبروں کے کہنے پر ایمان لائے ہیں، گویا اشارہ اس طرف ہے کہ: اے ملائکہ! اگر تم ہم پر ایمان رکھتے ہو رات دن جنت اور جہنم کو آنکھ سے دیکھتے ہو، تو تمہارا ایمان عجیب نہیں ایمان ان کا ہے کہ دیکھا تو ہے نہیں، مگر یقینِ قطعی کے ساتھ مان رہے ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: اے ملائکۃ اللہ! میں تمہیں گواہ کرتا ہوں کہ اس مجلس میں جتنے موجود تھے، جو وہ مانگتے تھے میں نے ان کو دیا، اور جس چیز سے پناہ مانگتے تھے، پناہ دی، میں نے ان کی مغفرت کر دی، ملائکہ عرض کرتے ہیں، یا اللہ! اس مجلس میں بہت سے آدمی بیٹھے تھے مگر کچھ راستہ چلتے ایسے ہی کھڑے ہو گئے تھے ان کا مقصد مجلس میں آنا نہیں تھا مگر انہوں نے دیکھا کہ ایک اجتماع ہے ذرا دیکھیں کیا ہو رہا ہے، تماشہ دیکھنے کو ٹھہر گئے تھے تو وہ شرکاء مجلس نہیں تھے، محض مجلس دیکھنے کھڑے ہو گئے تھے، کیا ان کی بھی مغفرت ہے؟ فرمایا: ''هُمُ الْقَوْمُ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ''[1] (اِنَّ لِلّٰهِ مَلٰٓئِكَةً سَيَّاحِيْنَ فِي الْاَرْضِ) اس مجلس میں بیٹھنے والے ایسے ہیں کہ ان کے پاس کھڑے ہونے والے بھی محروم نہیں رہ سکتے۔

مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ اس مجلس میں آنے کے سبب سے ملائکہ کو عروج ہوتا ہے اور اتنی قبولیت ہوتی ہے کہ عرش تک پہنچتے ہیں، مجلس میں آنے سے پہلے عرش تک رسائی نہیں ہو سکتی، اس مجلسِ خیر کی برکت سے انہیں عرش تک رسائی ہوتی ہے، اور اتنا عروج اور قریب ہونا نصیب ہوتا ہے جو اس سے پہلے نہیں تھا۔ یہ قرب اور عروج کس

[1] السنن للترمذی، كِتَابُ الدَّعْوَاتِ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَابُ مَاجَاءَ، باب ماجاء ان لله ملائكة سياحين في الارض ج:۱۲ ص:۲۷ رقم:۳۵۲۴.

چیز پر مرتب ہوا؟ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو برکت ہے، آپ کی تو بتائی ہوئی باتیں مجلس میں بیان کی جارہی تھیں، ذکر اللہ کرے گا تو آپ کے تلقین فرمودہ کلمات ہیں، وعظ ہیں تو آپ کی تلقین کردہ ہے، احکام بیان کریں تو آپ کی تعلیم کردہ چیز ہے، عبرتیں بیان کریں تو آپ کی فرمودہ چیز ہے، تو ملائکہ یہی کچھ سننے کے لئے آئے ہیں، اس کے سننے سے وہ قبولیت اور عروج ہوا، تو معلوم ہوا کہ فرشتوں کو قربِ خداوندی میں ثبات اور استقلال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے نصیب ہوتا ہے۔ تو جیسے نون کے ملا دینے سے فعل کے اندر قوت پیدا ہوجاتی تھی تو ملائکہ بمنزلہ (قوت) افعالِ حق کے ہیں، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کا ذکر مل گیا تو ان کی قبولیت میں ثبات و استقلال کی تاکید پیدا ہوگئی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر افعالِ الٰہیہ سے ملتے ہیں تو ان کی عبادت اور قرب کا تأکد ہوجاتا ہے، جیسے نون فعل سے ملا تو فعل موکد ہوگیا تھا۔ اسی طرح سے اسماءِ الٰہیہ تمام کائنات کے لئے ظِلّ ہیں، اسماءِ الٰہیہ کے تصرّف سے یہ تمام چیزیں بنی ہیں، فرمادیا: کُن، ہوگئیں، کسی کو زندہ ہونے کا فرمایا تو زندگی مل گئی، کسی کے لئے موت کا فرمایا تو موت آگئی، غرض عالم میں جتنے تصرفات اور تغیرات ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اسماء سے ہورہے ہیں، اور اسماءِ الٰہیہ کا مورد اور محل وہ بنی آدم، جنات، حیوانات، اور نباتات ہیں ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی اسمِ الٰہی لگا ہوا ہے، جس کے ذریعہ وہ چل رہا ہے، اس کا مطلب یہ نکلا کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو انسانوں اور جنوں نے قبول کیا وہ اللہ کے اسماء کا مظہر ہیں تو وہ اللہ کے اسماء کے تصرفات کا ذریعہ بن گئے، اور ظاہر ہے کہ یہ مقبولیت کی علامت ہے، تو افعال (ملائکہ) سے ملے تھے تو قرب مرتب ہوگیا تھا، ملائکہ عروج پر آگئے تھے، اسماء سے ملے، تو ہمارے اندر خیر و برکت پیدا ہوگئی، اسی طرح سے کائنات کے اندر جتنی معدنیات ہیں، جتنے ذخیرے چھپے ہوئے ہیں سونا ہو، چاندی ہو، تیل ہو پٹرول ہو یہ درحقیقت حروف ہیں، حرف کے معنی کنارے کے ہوتے ہیں، اس عالم کے ہر کنارے میں کوئی نہ کوئی معدن رکھا ہوا ہے، کسی کنارے میں تیل ہے، کسی کنارے میں سونا ہے، تو یہ حروف ہیں، یہ حروف کب نمایاں ہوئے؟ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوگئی، اور آپ کو بنادیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں یہ حروف نمایاں ہوئے اور ان کو فخر کا موقع ملا، سونا کہے گا کہ میں ایسی فخر کی چیز ہوں کہ لوگ مجھے سر پر جگہ دیتے ہیں اور چاندی کہے کہ بازار مجھ سے آباد ہیں، یہ فخر کہاں سے نصیب ہوا، اس لئے کہ انہیں زندگی دی گئی، زندگی کہاں سے نصیب ہوئی؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طفیل ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ افعالِ خداوندی کے ساتھ ذاتِ بابرکات نبوی لگی تو ان میں ثبات و استقلال پیدا ہوا، اسماءِ الٰہیہ کے ساتھ آپ ملے تو ان کا تصرف ہوگیا، حروفِ کائنات کے ساتھ آپ ملے تو ان کو فخر و مباہات کا موقع مل گیا، تو جیسے نون تھا کہ فعل سے ملے تو موکد بنادے، اسم سے ملے تو اس میں زینت پیدا کردے، حرف سے ملے تو اس میں غنہ پیدا کردے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ہے کہ افعالِ الٰہیہ سے ملی تو ان میں ثبات ہوا، اسماء

الٰہیہ سے ملی تو ان میں تصرفات نمایاں ہوئے، حروف سے ملی جو اللہ کے حروف ہیں، تو ان میں زینت اور فخر ومباہات پیدا ہوگئی، غرض نون (نٓ) کو نبوت سے کمال درجہ مشابہت حاصل ہے اور نبوت کا کمال درحقیقت نبی کا کمال ہے، تو حق تعالیٰ شانہ نے نٓ کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بیان کرنے کے لئے کیا۔

''نٓ'' سے نفی جنون اور کمالِ عقل وعلم پر استدلال......اور سارے کمالات کی بنیاد علم ہے اور علم کی زمین عقل ہے، اگر عقل نہیں ہوتی تو علم کتنا ہی ڈال دیں وہ نمایاں نہیں ہوسکتا، چنانچہ سینکڑوں پوسٹر لکھ کر دیوار پر لگا دیں اس پر کوئی اثر نہیں، اس لئے کہ اس میں کوئی عقل وشعور ہی نہیں، ایک لکڑی کے اندر یا جزدان میں آپ پورا قرآن شریف رکھ دیں، جو علم کا خزانہ ہے، لیکن جزدان کو کوئی خبر نہیں، اس لئے کہ اس میں عقل تو ہے ہی نہیں، عقل ہوتی تو علم نمایاں ہوجاتا۔ یا ایک انسان ہے مگر وہ بے وقوف ہے اس پر اگر کوئی علم ڈال دے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے لکڑی کے اوپر ڈال دیا، کچھ بھی اثر نہیں ہوگا، لیکن اگر عقل موجود ہے تو وہ اس علم کو سمجھے گا، اور زیادہ عقل ہے تو اور زیادہ سمجھے گا گہری عقل ہے تو گہرائی سے سوچے گا تو علم کا دارومدار عقل کے اوپر ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام کو عقل بھی اعلیٰ دی جاتی ہے، کیونکہ ان کے اوپر علم اعلیٰ ڈالا جاتا ہے، اور علم کی زمین عقل ہے، وہ نہ ہو تو علم جمتا نہیں، اس لئے لازمی ہے کہ نبی کو عقل اتنی دی جائے کہ امتوں میں اتنی عقل نہ ہو، پوری امت کے برابر تنہا نبی کی عقل ہو، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اس درجہ کا ہے کہ حروف سے ملے تو وہ باکمال بن جائیں، افعال سے ملے تو وہ باکمال بن جائے اسماء سے ملے تو وہ باکمال بن جائیں اتنا بڑا علم ہوا، تو اس کا لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ عقل بھی اتنی ہی بڑی دی گئی، تو جاہل اور مجنون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے کہتے ہیں؟ (نعوذ باللہ) اس سے تو خود یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل اتنی کامل ہے کہ جنون کا وہاں شائبہ بھی نہیں ہوسکتا، تو نون کو گواہی میں پیش کیا اس لئے کہ حرفِ نون کو نبوت سے مناسبت تھی۔

حرکاتِ قلم سے علوم نبوت پر استدلال......اس کے بعد قلم کی قسم کھائی، قلم کی قسم کھا کر کہا کہ آپ اپنے رب کی نعمت وفضل سے مجنون نہیں ہیں، اور ہم قلم کو گواہی میں پیش کرتے ہیں، اس واسطے کہ قلم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے مناسبت ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قلم کو جب دیکھا جائے تو کبھی تو کاغذ کے اوپر ہے کبھی دوات کے اندر ہے کبھی وہاں سے ہٹا کر اوپر کی طرف ہے، کبھی سیاہی کم ہوگئی تو اُسے جھکا دیتے ہیں، اگر کوئی بے عقل آدمی قلم کی یہ حرکتیں دیکھے گا، تو قلم کو مجنون ہی تو کہے گا کہ یہ کیا بے عقلی ہے کہ کبھی اوپر جارہا ہے کبھی نیچے آرہا ہے، کبھی ادھر کبھی ادھر تو جاہل اگر قلم کو دیکھے گا تو وہ مجنون کہے گا، عقل مند دیکھے گا تو کہے گا کہ یہ تو کوئی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے، اسی طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے کہ کفار دیکھیں گے تو مجنون کہیں گے، اور دانش مند دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ان سے بڑا کوئی عاقل نہیں ہے، تو قلم نے یہ بات سمجھا دی کہ قلم کی حرکات ظاہر میں مجنونانہ ہیں، لیکن ان حرکات کے اندر علوم اور کمالات چھپے ہوئے ہیں۔

اعجازِ قلم سے اعجازِ نبوت پر استدلال...... قلم ایک لکڑی کی چیز ہے، ایک کِلک ہے یا پلاسٹک ہے جس کی کوئی وقعت نہیں، لیکن علوم وہ لکھتا ہے کہ اگلوں اور پچھلوں کی خبر دیتا ہے، ظاہر بات ہے کہ قلم انتہا درجے کی اعجازی چیز یعنی معجزہ ہوا، قلم کو کاٹ کر آپ نظر اُٹھا کر دیکھو کہیں بھی کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن جب حرکت کرتا ہے تو ہزاروں علوم لکھتا چلا جاتا ہے، آج ماضی کی لاکھوں چیزیں قلم کی بدولت ہی تو ہمارے علم میں آئی ہے، اور مستقبل کی چیزیں جو آج لکھ دی ہیں وہ قلم ہی کی بدولت تو ہوں گی، اور حال میں جو چیزیں حوادث وواقعات کے سلسلہ میں ہیں وہ قلم ہی تو لکھتا ہے، تو قلم کی ذات کو دیکھو تو وہ محض ایک لکڑی ہے یا پلاسٹک ہے اور آثار کو دیکھو تو کروڑوں علوم، اسی طرح سے اگر ہمارے نبی کو دیکھو تو ظاہر میں تو بشر ہی ہے، جیسے اور انسان ہوتے ہیں، لیکن ان کی حرکات سے جو علوم نمایاں ہیں تو اگلے اور پچھلوں کی سب چیزیں کھلتی چلی گئیں، تو قلم کو ہم گواہی میں پیش کرتے ہیں کہ ہمارا نبی مجنون نہیں ہے، ورنہ پھر قلم کو مجنون کہو اور قلم کو مجنون کہو گے تو یہ تمہارے پاس علم کہاں سے آیا......؟ یہ قلم ہی کے تو طفیل سے آیا، تو دنیا میں جتنے بھی علوم ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہیں۔

قلم اربوں علوم کے ظہور کا ذریعہ ہے...... پھر تیسری ایک بات اور بھی ہے کہ قلم کو آپ الگ رکھ دیں نہ حرکت کرے گا نہ ہلے گا نہ لکھے گا نہ علم ظاہر کرے گا، لیکن کاتب اپنے ہاتھ میں لے لے، اس سے سینکڑوں علوم ظاہر ہوتے چلے جائیں گے، معلوم ہوتا ہے کہ قلم خود اپنے قبضے میں نہیں بلکہ کاتب کے قبضہ میں ہے، جو وہ لکھتا ہے وہ لکھتا ہے اس کے ہاتھ سے چھین لیا جائے تو قلم میں کچھ بھی نہیں، اس سے حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ ہمارا پیغمبر جو کچھ کہہ رہا ہے وہ قلم ہے ہمارے ہاتھ میں ہے جو ہم لکھا رہے ہیں لکھتا چلا جا رہا ہے اس کا کیا ہوا ہمارا کیا ہوا ہے خود قلم کی ذات میں کچھ نہیں ہے اسی کو فرمایا: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ ① ہمارا پیغمبر ہوائے نفسانی سے بات نہیں کرتا، وحی سے بات کرتا ہے، وحی بھیجنے والے ہم ہیں ہم چلا رہے ہیں، اس لئے قلم چل رہا ہے تو ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام بشر ہے، حقیقت میں دیکھو تو سارے بشر ایک طرف اور وہ تنہا ایک طرف، اس لئے کہ وہ بمنزلہ قلم حق تعالیٰ کے ہیں وہ چلاتے ہیں تو چلتا ہے مطلب یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وہ ہے کہ خواہشاتِ نفسانی سے کوئی حرکت نہیں ہوتی، ہماری مرضیات کے مطابق حرکت ہوتی ہے، جدھر ہم چلاتے ہیں چلتے ہیں، ہم کہہ دیں کہ جان دے دو تو وہ میدانِ جہاد میں کود پڑیں گے، ہم کہہ دیں گے کہ گھر میں آرام کرو تو سونے کے لئے آ جائیں گے، ہم کہتے ہیں کہ بیویوں کے پاس جاؤ تو وہ وہاں چلے جائیں گے، ہم کہتے ہیں کہ اولاد کی پرورش کرو تو اولاد کی پرورش کرنے لگیں گے، غرض وہ اپنی من مانی سے کچھ نہیں کرتے، جو ہم کراتے ہیں وہ کرتے ہیں۔

ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نفیِ جنون کے لئے قلم کی شہادت...... تو ہمارا پیغمبر قلم کی طرح ہمارے ہاتھ میں ہے کہ کاتب کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے، جدھر کو چلائے چل پڑے، ایسا ہی ہمارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ: النجم، الآیۃ: ۳، ۴۔

ہاتھ میں ہے،ان کی ساری حرکات وسکنات ہماری مرضیات کے مطابق ہیں،اس کو اگر تم نے مجنوں کہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمیں مجنوں کہہ رہے ہو،اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس علم نہیں،تو درحقیقت پیغمبر کو برا کہنا اللہ کی ذات میں گستاخی کرنا ہے،پیغمبر کی تعریف کرنا اللہ کی تعریف کرنا ہے۔﴿مَنْ اَطَاعَ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللہَ﴾ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔تو ان کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے،اسی لئے ایک جگہ فرمایا:﴿وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللہَ رَمٰی﴾ ① غزوۂ بدر میں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریاں ماری تھیں اور ایک کنکری جس کے سر پر پڑی تو پاش پاش کرتی ہوئی ٹخنوں تک نکل گئی تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں بشر کی طاقت نہیں کہ کنکری مارے اور جس کو لگے اس کو پاش پاش کرتی ہوئی جسم کے پار ہوجائے،یہ تو ہماری طاقت ہے،ہم کنکر مار رہے تھے،ہاتھ پیغمبر کا تھا طاقت ہماری تھی،جب پیغمبر بولتے ہیں تو زبان پیغمبر کی ہوتی ہے،کلام ہمارا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قلم کو پیغمبر کی ذات کے ساتھ بہت مناسبت ہے۔تو حق تعالیٰ نے فرمایا:قلم کی قسم کھاتے ہیں اور قلم کو گواہ بنا کر پیش کرتے ہیں کہ ہمارا نبی مجنوں نہیں ہے،اس لئے کہ قلم بھی ظاہر میں ایک لکڑی کی چیز ہے،مگر علوم وہ بیان کر رہا ہے جو مجنوں بیان نہیں کر سکتا،تو جیسے قلم کو مجنوں نہیں کہہ سکتے نبی کو بھی مجنوں نہیں کہہ سکتے۔

افعال وحرکاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی علوم ہیں......اس کے ساتھ ساتھ قلم کی اور خصوصیت بھی ہے،قلم ایک دم روشنائی کے اندر جا کر غرق ہوجائے گا اور اس کے بعد لکھنا شروع کرے گا اور لکھنے میں کبھی اوپر کبھی نیچے کبھی دائیں اور کبھی بائیں کو حرکت کرے گا یہ مثال ایسی ہے کہ گویا دوات کی روشنائی سے قلم وضو کرتا ہے،وضو کرنے کے بعد کاغذ کے مصلّے پر عبادت کرتا ہے،اور سجدے کرتا ہے،ہمارے پیغمبر ایک طرف وضو کرتے ہیں اس کے بعد کبھی اٹھتے ہیں،کبھی بیٹھتے ہیں یہ ہماری عبادت کے لئے کرتے ہیں اگر پیغمبر کو دیکھنا ہے تو قلم کو دیکھ لیں تو قلم جیسے روشنائی کے اندر جا کر غسل کرتا ہے اس میں غرق ہوتا ہے اور استغراق ہوتا ہے اس کے بعد آ کر اس سے لکھتا ہے،جس سے علوم پیدا ہوتے ہیں تو ہمارے پیغمبر کامل الطہارت ہیں اور طہارت بھی اعلیٰ ہے اس طہارت کے بعد جو عبادت کرتے ہیں وہ عبادت طرح طرح کے علوم کا ذریعہ بنتی ہے۔

آج جو ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا ذکر کریں گے،روزہ کا ذکر کریں گے یا حج کا ذکر کریں گے،اسی سے تو مسائل نکلتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال میں علوم چھپے ہوئے ہیں،بظاہر تو حرکات ہی ہیں کہ سجدہ کیا،رکوع کیا،لیکن اس سجدے اور رکوع سے کتنے مسئلے پیدا ہوئے اس رکوع سے اور سجدے سے کتنے حقائق پیدا ہوئے التحیات میں بیٹھنے سے کتنے مسئلے پیدا ہوئے،یہ جو فقہ کی ہزاروں کتابیں بھری پڑی ہیں،یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال ہی کا مجموعہ ہے،اور آپ کا فعل اس لئے ہے کہ آپ حق تعالیٰ میں مستغرق ہیں،آپ صلی اللہ علیہ وسلم

① پارہ: ۹،سورۃ: الانفال،الآیۃ:۱۷.

علم الٰہی میں غرق ہوتے ہیں پھر وہاں سے تر ہو کر آتے ہیں تو افعال واقوال بنتے ہیں جس سے علوم پھیلتے ہیں، جیسے قلم روشنائی میں جا کر سرنگوں ہوتا ہے سر کا غوطہ دے کر پھر جو آتا ہے تو طرح طرح کے علوم وعجائبات اس سے ظاہر ہوتے ہیں، تو اگر قلم کو دیکھ کر تم اسے مجنوں کہہ دو گے کہ کبھی اوندھا ہو کر روشنائی میں گر گیا، کبھی سیدھا ہو کر باہر آ گیا، یہ مجنوں نہیں ہے بلکہ یہ تو ہزاروں عقل مندوں کو بنانے والا ہے، تو ہمارا پیغمبر بھی ہزاروں عقل مندوں کو دنیا میں وجود دینے والا ہے، تو اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات میں جنوں ہو تو نہ علم کا پتہ رہے نہ عقل وشعور کا پتہ رہے تو عقلیں علم سے جلا پاتی ہیں، اور علم پیغمبر لے کر آتے ہیں۔

عقول کے لئے جلا بخش علوم لانے والے نبی مجنوں ہو سکتے ہیں؟...... دیہات کے اندر یہ نہیں کہ لوگ عقل مند نہیں ہوتے بلکہ دیہات میں بعض ایسے ذکی الطبع ہوتے ہیں کہ شہر والے بھی ایسے نہیں ہوتے، لیکن چونکہ تعلیم نہیں ہوتی اس لئے عقلیں کندرہ جاتی ہیں جلا نہیں پاتیں، عقلوں کو چلنے کا راستہ نہیں ملتا، تعلیم کے ذریعہ عقل کو چلنے کا راستہ ملتا ہے تو علم حقیقت میں عقل کو چلانے والا ہے یہ سارے عقلاء جو ہیں، ان کی عقلیں کند تھیں، جب علم سامنے آیا تو گویا چلے، اور علم حضرات انبیاء علیہم السلام لے کر آئے ہیں، لوگ جسے علم کہتے ہیں، وہ تخیلات اور اوہام کا مجموعہ ہے، دماغ میں کچھ پریشان خیالات آ گئے، آپ نے سمجھا عالم ہو گئے، علم وہ ہے جو پیغمبر سے منقول ہو کر آئے، اس سے عقلوں کو جلا ملتی ہے، آج یورپ والے علم نہیں رکھتے، مگر عقلیں اتنی بڑی ہیں کہ دنیا کو جگمگا رکھا ہے، مگر عقل معاد نہیں ہے، کہ انجام بینی کریں یا انجام کو سوچیں، اس لئے کہ اس علم کو قبول نہیں کیا جس سے عقلِ معاد جلا پاتی تھی، اور آخرت منکشف ہوتی تھی، غرض عقل مندوں کی عقلیں علم سے روشن ہوتی ہیں، اور علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں تو جو ہزاروں مجنونوں کو عقل مند بنا دیں اسے تم مجنوں کہتے ہو......؟ تمہاری عقل میں یہ بات نہیں آتی، تو پوری طرح سے رد کر دیا کہ تم جاہل ہو تم پہچانتے نہیں ہو کہ پیغمبر کیا ہوتے ہیں......؟ کیا کسی مجنوں کا یہ کام تھا کہ اتنی عظیم الشان کتاب لا کر پیش کر دے، کہ دنیا کے عقل مند حیران ہو جائیں، صدیاں گزر جائیں جس میں ایک شوشے کی ترمیم وتنسیخ کی گنجائش نہ ہو اتنے بڑے عجائبات اتنے بڑے علوم، اتنا بڑا دستور اور اتنا بڑا قانون پیش کر دینا کہ عقل مند مجبور ہو کر کہیں کہ اس سے زیادہ بہتر ممکن نہیں، یہ کسی مجنوں کا بنایا ہوا کلام ہے یا کسی مجنوں میں صلاحیت تھی کہ اتنا بڑا قانون دنیا کے آگے پیش کرے، اس واسطے آثار کو دیکھیں تب بھی تمہارا دعویٰ غلط ہے کہ مجنونوں سے یہ آثار نمایاں نہیں ہو سکتے۔

جو خود مسلوب العقل ہیں وہ نبی کو مجنوں کہتے ہیں...... حدیث کا ذخیرہ دیکھو، اتنا عظیم عقل ودانش کا ذخیرہ ہے کہ عقلا نے سپریں ڈال دیں کہ اس سے زیادہ دانش کی باتیں نہیں ہو سکتیں اس سے زیادہ فصاحت اور بلاغت نہیں آ سکتی، جو کلام کرنے والا انتہائی فصاحت وبلاغت سے کلام کرے اور فصیح وبلیغ کلام میں وہ اصول پیش کرے کہ دنیا جھکنے پر مجبور ہو، کیا یہ مجنوں کا کام ہے کہ اتنے بڑے اصول دنیا کو دے دے؟ کروڑوں انسان اس کی راہ پر

چل کر جنت میں پہنچ گئے، تو حق تعالیٰ نے ان کی انتہا درجے کی تردید فرمادی کہ تم اتنے بیوقوف ہو کہ تمہیں اتنی موٹی بات سمجھ میں نہیں آتی......؟ اب اگر کوئی دن کے وقت نصف النہار پر سورج ہو اور یہ کہنے لگے کہ صاحب! اندھیرا پھیلا ہوا ہے، سورج میں روشنی کا نشان نہیں ہے تو دنیا اس کو کیا کہے گی، یہی کہے گی کہ تو اندھا ہے، ساری دنیا کو سورج نظر آرہا ہے، ہر طرف چاندنا پھیلا ہوا ہے اور تو کہتا ہے کہ نہیں ہے تو سوائے اس کے یا تو اندھا یا تو مجنوں ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب نبوت ہیں، جن کی نبوۃ کا آفتاب نصف النہار پر ہے، عرب وعجم میں پھیل گیا، اور تمہیں یہ توفیق نہ ہوئی کہ مان لو، بلکہ یہ کہا کہ آپ تو مجنوں ہو، ایسا ہی ہے جیسے کوئی آفتاب کے بارے میں کہہ دے کہ یہ ظلمتِ محض ہے اس میں روشنی کا کوئی نشان نہیں تو دنیا اسے مجنوں کہے گی، تو جنونی خود بن گئے ہو، اور ہمارے پیغمبر کو مجنوں کہتے ہو، عقل تم میں نہیں اور بے عقلی کا الزام ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر لگاتے ہو......؟

دوسرے کو مجنوں بتلانا خود کے مجنوں ہونے کی علامت ہے......اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جو زیادہ مجنوں اور بیوقوف ہو وہ یوں سمجھا کرتا ہے کہ ساری دنیا مجنوں ہے، میں ہی عقل مند ہوں، پاگل خانے میں کبھی جانے کی نوبت آئی ہو، خدا کرے نہ آئی ہو اور آئندہ بھی نہ آئے، مگر سیر وتفریح کے لئے بھی جانا پڑ جائے تو قسم قسم کے مجنوں دکھائی دیتے ہیں، بعض مجنوں نہایت سنجیدہ گفتگو کرتے ہیں، لوگ حیران ہوتے ہیں کہ انہیں کیوں پاگل خانے میں بھیج دیا یہ تو بڑی سنجیدہ باتیں کررہے ہیں، ساری باتیں کر کے اخیر میں کہیں گے کہ دنیا ساری مجنوں ہوگئی جو مجھے مجنوں کہتی ہے حالانکہ ساری دنیا میں مجنوں ہیں، مگر میرے اندر کوئی جنون نہیں ہے، اسی میں قلعی کھول دی ، مجنوں ساری دنیا کو مجنوں سمجھتا ہے اور اپنے کو عقل مند سمجھتا ہے۔ یہی کیفیت ان مجنونوں کی ہے کہ اپنے کو عقل مند سمجھتے ہیں اور جو سید العاقلین ہے انہیں مجنوں بتلا رہے ہیں، یہ ان کی عقل کی بات ہے یا ان کے جنون کی بات ہے......؟ اس لئے فرمایا: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ﴾ ''نٓ'' کو دیکھ لو، اس سے نبوت کی حقیقت واضح ہوگی، اس کو نبوت سے مناسبت ہے، قلم کی اور وہ جو سطور لکھتا ہے ان کی بھی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اے پیغمبر! اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے ساتھ آپ کبھی مجنون نہیں ہوسکتے یہ جھوٹے ہیں، جو تمہیں مجنوں کہہ رہے ہیں، کسی مجنوں پر یہ (وحی وعلم) کی نعمتیں اترتی ہیں؟ سب سے بڑی نعمت علم کی ہے، مجنوں کبھی علم قبول ہی نہیں کرسکتا، اور اگر پہلے تھوڑا بہت اس میں علم ہو تو بے ترتیب بیان کرے گا، نہ سرنہ پیر اس واسطے کہ عقل تو ہے ہی نہیں جو کلام مرتب کرے، تو خداوندی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت علم کی ہے وہ اللہ کی صفت ہے وہ بندے کو دی، وہ انسان کو دی جاتی ہے، علم سے ہی دنیا اور آخرت کے بھی راستے کھلتے ہیں۔ آج دنیا میں تمدن اور معاشرت کی جو جگمگاہٹ ہے یہ علم ہی کا طفیل ہے، یہ جاہلوں نے تھوڑا ہی کیا ہے، کسی گدھے گھوڑے نے تھوڑا ہی تمدن بنایا ہے۔؟ انسانوں نے بنایا اور انسانوں میں سے پاگلوں اور مجنونوں نے تھوڑا ہی بنایا عقلمندوں

نے بنایا، اور عقل مندوں میں سے انہوں نے بنایا جن کی عقلوں کو علم نے جلا دی تو یہ ساری جلوہ گری علم کی ہے، علم سے راستے نکلتے ہیں تو دنیا آپ کی بنی تو علم سے اور آخرت آپ کی بنی تو وہ بھی علم سے، تو ساری نعمتوں کا اور کمالات کا دارومدار علم کے اوپر ہے، جہالت پر نہ کبھی کوئی اچھا ثمرہ مرتب ہوا نہ قیامت تک کبھی ہوگا، غرض سب سے بڑی نعمت علم ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اللہ نے آپ کو نعمت علم دی ہے، آپ مجنون ہو سکتے ہیں؟ مجنوں سے یہ علم اترتا ہے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا، مجنوں وہ ہیں جو اس علم کے قابل نہیں ہیں اور جن میں اس علم کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، تو سب سے بڑی نعمت علم ہے۔

اخلاقِ عظیم کے حامل بھی مجنون نہیں ہو سکتے ...... اور اس کے بعد دوسری بڑی نعمت اخلاق ہے وہ کامل ترین اخلاق اور اعلیٰ ترین اخلاق جن سے دنیا مسخر ہو جائے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے اخلاق دیئے گئے کہ دنیا قدموں کے اوپر جھک گئی، دنیا نے ہار مان لی، اسلام اخلاق کے زور سے پھیلا، وہ اخلاقِ نبوت ہی تو تھے، تو جس ذات میں اتنے اخلاق کی نعمت بھری جائے وہ مجنوں ہو سکتا ہے؟

عملِ صالح اور دوام بھی نفیٔ جنوں پر دال ہے ...... اور تیسری نعمت عمل صالح ہے، تو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ عمل صالح کرنے والا کون ہے؟ ان کا کوئی وقت عمل صالح سے خالی نہیں ہوتا، حدیث میں آپ کی شان فرمائی گئی: ''کَانَ یَذْکُرُ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِهٖ'' ① آپ کا کوئی لمحہ ذکر اللہ اور یادِ خداوندی سے فارغ نہیں ہوتا تھا، ہر وقت کبھی عملی ذکر، کبھی زبان کا ذکر، کبھی قلب کا ذکر، کبھی دماغ کا ذکر، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل، فراست، قوتِ قلب اور قوتِ ید الغرض تمام قوتیں ذکر اللہ میں لگی رہتی ہیں اپنے اپنے مناسب عمل کرتے ہیں، دماغ سوچ بچار کا عمل کرتا ہے، قلب اخلاق کا عمل کرتا ہے، ہاتھ پیر حرکات کا عمل کرتے ہیں، نبی کا ہاتھ نبی کا قلب و دماغ سب اللہ کے عمل میں محو ہوتا ہے، ہر وقت ذکر اللہ میں مصروف، تو جس کو ذکر اللہ اور عملِ صالح کی نعمت مل جائے، کیا وہ مجنون ہوتا ہے؟ یا وہ وحی اور ایسی چیزیں قبول کر سکتا ہے؟

مجنوں بھی اصلاحِ عالم کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے؟ ...... تو نعمتیں یہ ہیں، علم کی نعمت، عمل کی نعمت، اخلاق کی نعمت، اور اس کے بعد عظیم نعمت ''اصلاحِ عالم'' اور دعوۃ الی اللہ کی نعمت ہے، تو ایک ذات بابرکات نے کروڑوں کے اندر رُوح پھونک دی، کروڑوں کو صحیح راستہ پر لگا دیا، کروڑوں بچھڑے ہوؤں کو اللہ کی بارگاہ سے جا ملایا، تو یہ اصلاحِ عالم کیا مجنوں کا کام ہے۔

اِجتماعیت عالم کی نعمت مجنوں کے ذریعہ ممکن نہیں ...... اس کے بعد پانچویں نعمت دیکھی جائے تو اجتماعیت عالم ہے، پورے عالم کو ایک نکتہ پر ڈال کر ساری دنیا کو ایک کنبہ بنا دیا، اخوتِ اسلامیہ پھیلا دی کہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں جہاں جہاں مسلمان ہیں، اگر وہ صحیح معنی میں مسلمان ہیں، تو وہ سب ایک دوسرے سے ملے

① الصحیح لمسلم، کِتَابُ الْحَیْضِ، بَابُ ذِکْرِ اللّٰهِ تَعَالٰی فِیْ حَالِ الْجَنَابَةِ وَغَیْرِهَا ج: ۱ ص: ۲۹۷ رقم: ۵۵۸.

ہوئے ہیں، اخوۂ اسلامی اور اسلامی برادری کا رشتہ ان کے اندر قائم ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں فرمایا: ''مَثَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَرَجُلٍ وَّاحِدٍ اِذَا اشْتَكٰى عَيْنُهٗ اشْتَكٰى كُلُّهٗ وَاِذَا اشْتَكٰى رَأْسُهٗ اشْتَكٰى كُلُّهٗ'' ① سارے مسلمانوں کی مثال ایک بدن کی سی ہے، اگر اس ایک بدن میں سر میں درد ہوگا سارا بدن بے چین ہوگا، آنکھ میں کھٹک ہوگئی تو سارے بدن میں بے چینی ہوگی، انگلی میں زخم ہوگیا، سارے بدن میں بے چینی ہوگی، نیند نہیں آئے گی، زخم انگلی میں لگا ہے اور نیند آنکھ کو ختم ہوگئی، آنکھ کہہ سکتی تھی، مجھے کیا تعلق؟ زخم تو انگلی میں لگا ہے، مگر وہ بے چین ہے۔ اس لئے کہ سارے اعضا میں حیات کا رشتہ مشترک ہے، اوپر سے نیچے تک حیات پھیلی ہوئی ہے، تو ایک مادہ اشتراک کی وجہ سے بدن کا ایک جز دوسرے جز پر راحت کا ہو یا کلفت کا ہو اثر ڈالتا ہے، اسی طرح سارے مسلمان ایک جسم واحد کی طرح سے ہیں، ان میں ایمان اور اسلام کا رشتہ پھیلا ہوا ہے اگر ایک مسلمان کو مغرب میں چوٹ لگے گی تو مشرق والا مسلمان بے چین ہوگا کہیں دعا کر رہا ہے، کہیں چندے دے رہا ہے، کہیں اعانت کی فکر کر رہا ہے۔ عربوں پر، ترکوں یا مصریوں پر مصیبت آتی ہے، اور ہندوستانی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، کہیں چندے کر رہے ہیں، کہیں انجمنیں بنا رہے ہیں، کوئی کہے کہ بھائی! تمہیں کیا تعلق؟ تم ہندوستان میں وہ مصر میں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں وطنیت کوئی چیز نہیں، اصل چیز اسلامیت ہے، وہ رشتہ مشترک ہے کوئی کہیں کا مسلمان ہو اسے ایذاء پہنچے ہمارے دل کو ٹھیس لگے گی، جہاں اسلامی رشتہ ہی کمزور پڑ جائے وہاں وطنیت غالب آتی ہے، پھر وہ دوسرے وطن کی رعایت نہیں کر سکتے، لیکن جہاں اسلامی اخوت غالب رہتی ہے اور وطنی جذبات مضمحل ہو کر نیچے پڑ جاتے ہیں تو مسلمانوں میں مشرق و مغرب ایک ہو جاتا ہے، یہ نعمت کس ذات کی برکت سے آئی؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ ایسا دین لا کر دیا کہ مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں کو ایک کر دیا، تو نعمتوں کی کوئی حد ہے؟ علم کی نعمت انتہائی، اخلاق کی نعمت دیکھیں تو انتہائی، اخلاق عمل صالح کی نعمت دیکھو تو انتہائی، عمل صالح، اصلاحِ عالم کی نعمت دیکھو تو انتہائی، اصلاح اجتماعیت عالم کی نعمت دیکھو تو انتہائی، غرض کون سی معنوی نعمت ہے جو انہیں نہیں دی گئی۔

عالمی سلطنت وخلافت کی عظمت نفی جنوں کی مستقل دلیل ہے...... اب ظاہری نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت سلطنت ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سلطنت دی گئی کہ عالم میں اتنی بڑی سلطنت کسی کی بھی نہیں ہوئی، جہاں جہاں مسلمان نظر آرہے ہیں یہ آپ ہی کی سلطنت ہے، آپ کے زمانہ خیر و برکت میں پورا حجاز پورا نجد اور پورا بحرین اسلامی فتوحات میں شامل ہو چکا تھا، حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ میں دائرہ اور وسیع ہوا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں شام، مصر اور تمام دوسرے ممالک تک پہنچا، حضرتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے

① الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تراحم المسلمين وتعاطفهم وتعاضدهم ج: ۱۲ ص: ۴۷۰ رقم: ۴۶۸۷.

زمانے میں آدھی دنیا پر اسلامی حکومت کا پرچم لہرانے لگا، یہ خلافتِ نبوت نے نبوت ہی کے کاموں کی تکمیل کی، تو یہ سلطنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، اگرچہ بتدریج ظاہر ہوئی، آپ حدیث میں فرماتے ہیں کہ: مجھ پر اللہ تعالیٰ نے مشرق اور مغرب سب روشن کر دیئے اور میری امت کا ملک وہاں تک پہنچے گا، جہاں تک میری نگاہوں نے دیکھ لیا ہے اور میں نے مشرق ومغرب کو دیکھ لیا ہے، وقت آئے گا کہ یہ امت پوری کائنات پر غالب ہوگی، اور پورے عالم میں دینِ واحد ہوجائے گا، تو سلطنت کی نعمت کو دیکھا جائے تو اتنی بڑی سلطنت کی حدِ تکمیل تک پہنچ جائے، باقی یہ سلطنت جب بھی بنتی ہے پہلے چھوٹی ہوتی ہے پھر بڑھتی ہے، پھر بڑھتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سلطنت کی ابتداء مدینہ منورہ سے ہوتی ہے اور مکہ مکرمہ فتح ہوا، اس کے بعد آگے کام چلا، اس کے بعد آپ کے خلفاء کی فتوحات ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں بارہ خلفاء ہوں گے۔ ① آخری خلیفہ مہدی علیہ السلام ہیں، اور مہدی علیہ السلام کے وقت میں پورے عالم میں دینِ واحد ہوجائے گا، تو میرے خلفاء پورے عالم میں اسلام کی حقیقت کو پھیلا دیں گے، تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی حکومت ہوگی، خلافت وہی کام کرتی ہے جو اصل کام کرتی ہے، تو آپ کے خلفاء کا پورے عالم میں پھیل جانا اور سلطنت قائم کر دینا یہ درحقیقت آپ ہی کی سلطنت ہے، تو علم کی جتنی بڑی نعمت تھی سلطنت کی بھی اتنی ہی بڑی نعمت آپ کو عطا کی گئی تو علم میں، عمل میں، ذکر میں اخلاق میں اجتماعیت میں اور سلطنت وخلافت میں غیر معمولی طور پر آپ کو نوازا گیا، ہر چیز میں شانِ غالبیت نمایاں ہے۔ تو اتنی نعمتوں پر فرمایا گیا کہ آپ مجنوں ہوں گے ایسی ایسی نعمتیں کیا مجنونوں کو دی جاتی ہیں، سارے عالم کی اصلاح فرماویں، سارے عالم میں علم پھیلائیں، عالم میں اخلاق پھیلائیں، کیا یہ مجنوں کا کام ہے؟ تو فرمایا: ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اے پیغمبر! اپنے رب کی نعمتوں کے ساتھ آپ مجنوں نہیں ہوسکتے یہ نعمتیں مجنوں کے لئے آ ہی نہیں سکتیں، مجنوں وہ ہیں جو ان نعمتوں سے محروم کر دیئے گئے ہیں، نہ ان کے پاس علم ہے نہ ان کے پاس عمل ہے، نہ ذکر اللہ ان کے پاس نہ اجتماعیت ان کے پاس نہ حکومت واقتدار ان کے پاس وہ مجنون ہیں نہ کہ وہ جس کے پاس یہ ساری نعمتیں ہوں۔

غرض ن شہادت میں پیش کیا، قلم کو شہادت میں پیش کیا اور جو قلم لکھے اس کو شہادت میں پیش کیا، پھر نعمتوں کا حوالہ دے کر ارشاد فرمایا کہ: آپ مجنون نہیں ہیں۔ تو ن اور قلم کی تو حسّی مثالیں پیش کر دیں جس سے نبی اور نبوت کو سمجھا جاسکے اور نبی کے لئے نعمتوں کی ایک جنس بتلا دی جس میں ساری نعمتیں شامل ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے نبی مجنون نہیں ہوسکتا، عیاذاً باللہ اگر نبی مجنون ہو تو پھر سارے عالم میں عقل کہیں نہیں ہوسکتی، عالم میں سارے بیوقوف ہوں گے، لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کی عقل ساری امتوں کے عقل کے برابر بلکہ برتر ہوتی ہے، تو حق تعالیٰ نے یہ دعویٰ فرمایا، اور ان کے دعویٰ کو رد فرمایا۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الامارہ، باب الناس تبع لقریش ج: ۹ ص: ۳۳۳ رقم: ۳۳۹۳.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے گئے الزامات کا دفعیہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا......اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت ہے کہ اور انبیا علیہم السلام پر تہمتیں لگائی گئیں۔ انہوں نے خود اپنا دفعیہ کیا چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کو قوم نے کہا کہ تمہارے اندر تو ضلالت اور گمراہی ہے تو خود فرمایا: ﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① میرے اندر ضلالت نہیں، میں تو اللہ کا رسول ہوں، رسول بھی کبھی گمراہ ہوتا ہے رسول تو ہدایت لے کر آتا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام کو قوم کی طرف سے کہا گیا کہ آپ میں سفاہت اور بد عقلی ہے، انہوں نے خود دفعیہ کیا۔ ﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ② مجھ میں بد عقلی نہیں میں تو اللہ کا رسول ہوں، رسول تو کامل العقل ہی کو کہتے ہیں، میں بدعقل کہاں؟ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جتنی تہمتیں لگائی گئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہیں فرمایا کہ آپ اپنی مدافعت خود کرلو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود مدافعت فرمائی،، چنانچہ لوگوں نے کہا کہ آپ شاعر ہیں، تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾ ③ ہم نے آپ کو شعر نہیں سکھلائے اور نہ آپ کی شایانِ شان ہے کہ آپ شاعر بنیں یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں میں شاعر نہیں ہوں بلکہ خود دعویٰ فرمایا ہمارا نبی شاعر نہیں، تم لوگ جھوٹ بولتے ہو، انہوں نے کہا کہ اس نبی کے اندر گمراہی ہے، تو حق تعالیٰ نے فرمایا ہمارا نبی گمراہی پر نہیں ہوسکتا، ہمارا نبی صحیح راستہ پر ہے۔ لوگوں نے کہا یہ نبی مجنون ہے، تو حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا: ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ آپ مجنون نہیں ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ جتنی تہمتیں قوم نے لگائیں، حق تعالیٰ نے آپ آگے بڑھ کر دفعیہ کیا کہ آپ پیچھے رہیں ہم دفعیہ کریں گے آپ کو لڑنے کی ضرورت نہیں، ہم لڑنے کے واسطے کافی ہیں، آپ ہمارا نام اونچا کیے جایئے، دعوت الی اللہ کا کام کرتے جایئے، تہمتیں جو لگائے گا، وہ خود بھگت لے گا، ہم ان سے از خود نمٹ لیں گے، آپ کو آگے آنے کی ضرورت نہیں، یہ ایک انتہائی محبت اور انتہائی خصوصیت کی بات ہے جس سے آپ کی محبوبیت واضح ہوتی ہے کہ اس درجہ حق تعالیٰ کو آپ سے محبت ہے کہ وہ اس میں پھانسنا ہی نہیں چاہتے کہ آپ اپنی مدافعت خود کریں یہ کام آپ ہم پر چھوڑ دیں، آپ تو ہمارا وہ کام کریں جو ہم نے آپ کو سونپا ہے، آپ ذکر اللہ میں لگیں، علم میں لگیں، عمل میں لگیں، اصلاح عالم کریں، اجتماعیت پیدا کریں، لوگ برا بھلا کہیں گے تو ہم بھگت لیں گے، چنانچہ ایک جگہ خود فرمایا ﴿وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا﴾ ④ یہ جو جھٹلانے والے ہیں انہیں اور مجھے چھوڑ دیں، آپ اپنا کام کریں، ہم ان جھٹلانے والوں سے نمٹ لیں گے۔ ﴿ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا﴾ ⑤ اے پیغمبر! آپ مجھے چھوڑ دیں اور جس کو میں نے تنہا پیدا کیا اس کو چھوڑ دیں، ہم یہ نمٹتے رہیں گے آپ اپنا

---

① پارہ:۸، سورة: الاعراف، الآية: ۶۱. ② پارہ:۸، سورة: الاعراف، الآية: ۶۷. ③ پارہ: ۲۳، سورة: يٰس، الآية: ۶۹. ④ پارہ: ۲۹، سورة: المزمل، الآية: ۱۱. ⑤ پارہ: ۲۹، سورة: المدثر، الآية: ۱۱.

کام کریں اس درجہ گویا حق تعالیٰ کو آپ سے محبت ہے کہ کسی چیز میں آپ کو پھانسنا نہیں چاہتے کوئی اعتراض کرے، تو خود اعتراض کا جواب دینے کے لئے آگے تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ اپنا کام کیجئے آپ ان قصوں میں نہ پڑیئے۔

محبوبِ حق اور مجنون؟...... اگر آپ کو اس سے گھٹن پیدا ہوگئی کہ لوگوں نے میری بات کو نہیں مانا تو خود تسلی دی فرمایا: ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ ① آپ کو ہم نے کوتوال بنا کر تھوڑا ہی بھیجا تھا، ڈرانے والا بنا کر بھیجا تھا آپ ڈراتے رہیں، کوئی نہ مانے تو جھک مارے گا آپ غم مت کریں، ہدایت اور گمراہی ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم جس کو چاہیں گے دے دیں گے، آپ اپنا کام کریں، اور فرمایا ﴿قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ﴾ ② آپ کہہ دیجئے مجھے وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا، مجھے تو داعی الی اللہ بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ دعوت دیں وکالت نہ کریں، کوتوالی نہ کریں، تو جب حق تعالیٰ کو یہ گوارا نہیں ہے کہ ذرہ برابر اعتراض وجواب کے اندر آپ کو پھانسیں، اس کی کفالت خود ذمہ لے لی، کہ اگر کوئی اعتراض کرے گا جواب ہم دیں گے، تو یہ انتہائی محبوبیت کی علامت ہے، اور حق تعالیٰ جسے محبوب بنائیں وہ مجنون ہوسکتا ہے؟ کیا اللہ کو مجنون ہی سے محبت ہوسکتی ہے، جبکہ وہ کمالات اور برکات وخیرات کا سرچشمہ ہے، تو اور کسی طرف جھکے گا جس کے اندر خود خیر اور برکت ہو، خیر کے اندر علم عقل اور کمال یہ ہے، جہاں عقل نہ ہو جنون ہو وہ سرچشمہ کمالات کا نہیں ہے، حق تعالیٰ اس سے محبت نہیں فرماتے اس واسطے دعویٰ دلائل کے ساتھ نہایت مبرہن ہو کر ثابت ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجنون نہیں ہیں۔ اب عقل مندی کے آثار کیا ہیں؟ وہ اگلی آیت میں ارشاد فرمائے گئے ہیں: ﴿وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾ کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو دو الزامات لگائے تھے، ایک یہ کہ آپ مجنون ہیں اور یہ کہ معاذ اللہ آپ کی عقل اور اخلاق ٹھکانے نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے ان دونوں کا رد کیا، دعویٰ ایک ہی تھا بعضوں کا خیال تھا کہ معاذ اللہ آپ کو جنون کی بیماری ہے جس کی وجہ سے آپ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں، اور یہی الزام ہمیشہ کفار کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر لگایا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کے دربار میں تشریف لے گئے اور توحید خداوندی اور نبوت کی دعوت دی اور آیتیں اور نشانیاں بھی بیان کیں، تو اس نے بھی یہی جواب دیا تھا کہ آپ کچھ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں اس نے کہا تھا کہ ﴿اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا﴾ ③ اے موسیٰ! میں سمجھتا ہوں تم پر سحر کر دیا گیا ہے، تم جادو زدہ ہو اس لئے بہکی بہکی باتیں کرتے ہو، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا﴾ ④ اے فرعون! میں سمجھتا ہوں تو ہلاکت زدہ اور تباہ شدہ ہے جو ایسی بہکی بہکی اور بیہودہ باتیں کر رہا ہے کہ

① پارہ: ۳۰، سورة: الغاشية، الآية ۲۲۔ ② پارہ: ۷، سورة: الانعام، الآية: ۶۶۔

③ پارہ: ۱۵، سورة: الاسراء، الآية: ۱۰۱۔ ④ پارہ: ۱۵، سورة: الاسراء، الآية: ۱۰۲۔

اللہ کے نبی پر سحرزدہ اور جادوزدہ ہونے کا الزام لگا رہا ہے، جب دلیل ہاتھ میں نہیں ہوتی تو معاندین اس وقت اسی قسم کے الزامات دیا کرتے ہیں کہ یہ گمراہ ہے یا ان کو جنون ہوگیا ہے، یا ان پر کسی نے سحر کرادیا ہے، اس لئے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جنون کا الزام لگایا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے اس کا جواب دیا کہ آپ ہرگز مجنون نہیں، اوراس پر دلیل کے طور پر چند شواہد اور آثار پیش کئے جن کی طرف ن کے لفظ سے اشارہ کیا، اوراس کے ساتھ ساتھ کچھ دلیلیں پیش فرمائیں جن کی طرف قلم سے اشارہ کیا کہ قلم میں جو بات ہے وہی ہمارے پیغمبر میں ہے، اس لئے یہ دعویٰ غلط ہے کہ معاذ اللہ ان کو جنون ہوگیا ہے، جنونی وہ ہیں جو ایسے دانا اور دانش مند پیغمبر کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح دلائل کی طرف نعمت کے لفظ سے اشارہ کیا تھا کہ جب ہم نے نعمتِ علم دی، نعمتِ عمل دی، نعمتِ اخلاق دی، نعمتِ اصلاح دی، اور نعمتِ تربیت دی، تو یہ مجنون کا کام نہیں ہوتا کہ وہ عالم کو تربیت دیدے، عالم کے سامنے بہترین علم وکمال کے نمونے پیش کرے، گویا مختلف قسم کے دلائل سے ان کا دعویٰ رد کردیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعقل الانبیاء علیہم السلام ہیں...... اس کے ساتھ ساتھ محض اصول سے سمجھا دینا اس وقت تک دلوں میں نہیں بیٹھتا جب تک تاریخی طور پر کچھ مثالیں بھی نہ پیش کردی جائیں، یہ کام جنون کا نہیں بلکہ اعلیٰ ترین عقل کا ہے، تو میں نے عرض کیا تھا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں جہاں علم کامل ہوتا ہے، وہیں عقلِ کامل بھی ہوتی ہے، اوراتنی بڑی عقل کہ پوری امت کو وہ عقل میسر نہیں ہوتی، اور جنابِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری نبوتوں اور کمالات کا منتہیٰ ہیں ان کی تو عقل بھی سارے انبیاء علیہم السلام سے اعلیٰ ہونی چاہئے۔ چنانچہ وہب بن منبہ جلیل القدر تابعین میں سے ہیں اور کتبِ سابقہ کے بہت بڑے عالم تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ۷۱ کتابیں سابقہ انبیاء علیہم السلام کی پڑھی ہیں اور ساری کتابیں پڑھ کر میں نے ایک نتیجہ نکالا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب عقل پیدا کی تو اس کے سو حصے کئے، ایک حصہ پورے عالم کو دیا اور ۹۹ حصے تنہا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے، تو جلیل القدر تابعی ہیں، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل مبارک سارے انبیاء اور اولیاء اگلے پچھلے ان سب سے زیادہ اکمل اور اعلیٰ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقلی فیصلے سے سردارانِ عرب کی تلواریں میان میں چلی گئیں......

چنانچہ حضور علیہ السلام کی عقل مبارک پر بھی مختلف کتابیں لکھی گئیں، ایک تو آپ کا وحی کا علم ہے، وہ تو اپنی جگہ مسلمہ ہے، اس کے لئے قرآن کریم اور حدیث پاک سب سے بڑی دلیل ہے، لیکن جہاں تک آپ کی عقل مبارک کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی کتابیں لکھی گئیں، اور ایسے واقعات درج کئے گئے ہیں کہ آپ نے کیسے کیسے فیصلے محض عقل مندی سے فرمائے، اور کتنے بڑے بڑے جھگڑوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹوں میں سلجھا دیا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۲۵ سال کی تھی، جوانی کا زمانہ

تھا، اور نبوت ملنے میں بھی ابھی پندرہ برس باقی تھے، تو اس وقت مکہ مکرمہ (زَادَهَا اللّٰهُ شَرَفًا وَّ كَرَامَةً) میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا، اور مکہ مکرمہ چونکہ نشیب میں ہے تو اِدھر اُدھر کا پانی جمع ہو کر حرم شریف میں جمع ہو گیا، جس کی وجہ سے بیت اللہ شریف کی دیواروں میں شق پڑ گئے، حجر اسود اپنی جگہ سے ہل گیا، اور قریب تھا کہ پوری عمارت گر جاتی، سیلاب جب ہٹ گیا اور قریش نے مشورہ کیا کہ بیت اللہ شریف کو ازسرِ نو بنانا چاہئے اور ساتھ میں مشورہ میں یہ بھی طے پایا کہ یہ اللہ کے گھر کی عمارت ہے، اور ہم لوگ ڈکیتیاں بھی ڈالتے ہیں، غصب بھی کرتے ہیں، لُوٹ مار بھی کرتے ہیں تو ناجائز مال اس پاک عمارت میں نہیں لگنا چاہئے، اس لئے ہر ایک اپنی دانست میں جو اس کی بہت ہی حلال کمائی ہو اس میں سے روپیہ دے، لوٹ مار یا ناجائز مال کا اس میں کوئی دخل نہ ہو، چنانچہ چندہ کیا گیا، وہ اتنا نہیں تھا کہ پورے بیت اللہ شریف کو بنائے ابراہیمی پر قائم کر دے، اس میں زیادہ مال لگتا تھا، اس لئے حطیم کا حصہ چھوڑ دیا گیا، وہ اگرچہ بیت اللہ کا جز ہے، مگر تعمیر میں ہم اس کو نہیں لا سکتے، اتنا پیسہ ہمارے پاس نہیں ہے، بہرحال تعمیر شروع ہوئی، اس کا واقعہ تو طویل ہے کہ کس انداز سے تعمیر کرتے تھے، تعمیر جب قدِ آدم کے قریب پہنچی اور حجرِ اسود کو اس کی جگہ پر رکھنے کا معاملہ پیش آیا تو یہ ایک بہت بڑی فضیلت تھی کہ حجر اسود کس کے ہاتھ سے رکھا جائے اس لئے کہ جو بھی اس کو وہاں رکھ دیتا، تاریخ میں قیامت تک اس کا نام رہتا، تو قریش کے جتنے بڑے بڑے سردار تھے، ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ میں اس کا مستحق ہوں، دوسرے نے کہا کہ میں مستحق ہوں، غرض اس میں تکرار شروع ہوئی، اور اس درجے تک بات پہنچی کہ تلواریں نکل آئیں اور بیت اللہ کی تعمیر رک گئی، اور اس پر جھگڑا شروع ہو گیا کہ حجر اسود کو اس کی جگہ پر کون رکھے؟

جھگڑا کرنا اور لڑنا یہ اہلِ عرب کی سرشت میں تھا، بہادر لوگ تھے، کوئی تھوڑی سی رنجش ہوتی تھی، وہ باتوں میں آ کر ایک جنگ کی صورت اختیار کر جاتی تھی، چنانچہ یہاں تلواریں کھنچ گئیں اور قریب تھا کہ کشت و خون شروع ہو جائے، تو ایسے میں ابوسفیان نے کہا کہ: بھائی لڑو مت اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ ہاتھ کو روک لو، اور کل صبح کو یہاں جمع ہو جاؤ سب سے پہلے جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو وہ جو فیصلہ کر دے اس پر راضی ہو جاؤ، خواہ کسی سردار کے حق میں بھی فیصلہ کر دے۔ اس پر سب آمادہ ہو گئے، چنانچہ جب جمع ہوئے تو انتظار شروع ہوا کہ جو داخل ہو وہ فیصلہ کر دے، تو سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے، سب ایک دم چلاّ پڑے کہ جَاءَ مُحَمَّدُ نِ الْاَمِيْنُ محمد امانت والے آ گئے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور یہ وہ نوجوان ہے کہ ان کی عقل پر سب کو اطمینان اور اعتماد ہے اور قریش میں اتنا بڑا دانش مند کوئی پیدا نہیں ہوا، جتنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یہ حق فیصلہ کریں گے۔ جس سردار کو یہ کہیں گے وہ سردار حجر اسود رکھے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو سردارانِ قریش نے آ کر معاملہ پیش کیا، اور کوئی سردار اس پر تیار نہیں کہ وہ اس فضیلت سے پیچھے ہٹے ہر ایک چاہتا ہے کہ میں حجر اسود رکھوں، اور اپنی اپنی وجوہِ استحقاق بھی بیان کر رہا ہے۔

آپ نے معاملہ سن کر ایسا عجیب وغریب فیصلہ فرمایا کہ حجرِ اسود کو خود اپنے دست مبارک سے رکھا، اور سب کو رسمی شریک کرلیا، کسی کو لڑنے کا موقعہ نہیں آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارک بچھادی اور حجر اسود اس کے اوپر رکھ دیا اور فرمایا سارے سردار مل کر اس چادر کو اٹھائیں، سب نے مل کر اٹھایا، گویا اٹھانے میں سب شریک ہوگئے، اس کے بعد فرمایا تم سب مل کر مجھے وکیل بنادو کہ میں تم سب کی طرف سے اٹھا کر رکھ دوں، سب نے وکیل بنادیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھا کر حجر اسود رکھ دیا، تو ان پاک ہاتھوں سے پتھر رکھا گیا جو حقیقۃً مستحق تھے، اور سب کی وکالت جو کی تو سب کے سب شریک ہوگئے، سب راضی ہوگئے لڑائی جھگڑا سب ختم ہوگیا۔ ظاہر ہے یہ فیصلہ آپ نے دانش سے ہی فرمایا تھا، اس وقت وحی کا تو قصہ ہی نہیں تھا، نبوت ملنے میں پندرہ برس باقی تھے، تو یہ محض کمالِ عقل سے فیصلہ تھا، تو اتنے بڑے بڑے سرداران اور دانش مندوں کا مجمع تھا، سارے مل کر وہ مسئلہ نہ سلجھا سکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منٹ بھر میں سلجھادیا، اور سب کو شریک کر کے خود ان کے سردار بن گئے، اور ان کو اپنے تابع کرلیا، لڑائی کا موقع نہ آیا، محض عقل ودانش سے یہ فیصلہ فرمایا تو اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل ودانش کا اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی بڑی عقلِ مبارک تھی کہ سب بڑے بڑے دانش مندوں کی لڑائی اور جھگڑے کو آپ نے سلجھادیا، یہ ایک واقعہ ہے۔

دوسرا عقلی فیصلہ...... ایک واقعہ اور یہ پیش آیا کہ ایک شخص کے بھائی کو کسی نے قتل کردیا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اور عرض کیا کہ کسی نے میرے حقیقی بھائی کو قتل کردیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دیّت لے لے، یعنی قاتل سے اتنا مال لے لے جتنا ایک نفس کا بدل ہوا کرتا ہے، تو اس زمانے میں سو اونٹ ایک نفس کے بدلے میں دیئے جاتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو دیت اور خون بہا لے لے اس نے کہا میں اس پر تیار نہیں، فرمایا پھر معاف کردے اس نے کہا میں اس کے لئے بھی تیار نہیں، فرمایا پھر قاتل کو قتل کردے، یہ تجھے حق حاصل ہے، وہ اس پر راضی ہوگیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں چاہتے تھے کہ قتل ہو، مگر اس کا یہ قانونی حق تھا، کیونکہ وہ نہ دیت لینے پر آمادہ تھا نہ معاف کرنا چاہتا تھا، تو تیسری صورت یہی تھی کہ قاتل کو قصاصاً قتل کردیا جائے تو وہ تلوار لے کر اس کو قتل کرنے چلا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ یہ قتل کر کے ایسا ہی ہوگا جیسا قاتل ہے، قاتل کے اوپر یہ ناراض ہے اس لئے کہ اس نے قتل کیا، جب یہ قتل کرے گا یہ بھی ویسا ہی ہوجائے گا، لوگوں نے اس کے کانوں میں ڈال دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمارہے ہیں کہ تو نے اگر قتل کیا تو تو بھی قاتل کے درجے میں ہوجائے گا، ایک فعل بد اس نے کیا ایک تو کرے گا۔ اس نے کہا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمارہے ہیں، اور میں قتل کر کے قاتل کے زمرے میں شامل ہوجاؤں گا، اس نے کہا میں خدا کے واسطے معاف کرتا ہوں، چنانچہ معاف کردیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، آپ نے فرمایا: میرا مطلب یہ تھا کہ قتل کرنے والا وہ قاتل ہی جیسا ہوگا، یہ مطلب نہیں تھا کہ جیسا وہ گناہ گار ہے ویسا تو

بھی ہوجائے گا، اس نے اگر قتل کیا تو گناہ کیا، تو جب قصاص میں قتل کرتا ہے تو گناہ گار نہیں، مگر قتل کرنے والے کے مشابہ ہوجائے گا تو میری مراد صرف یہ تھی کہ تو مشابہ ہوجائے گا، یہ نہیں تھی کہ تو گنہگار بھی ہوگا، مگر اب معاف کرچکا تھا، اس لئے قاتل بچ گیا، تو آپ نے ایک جملہ سے اس کو بچا لیا، اور بچایا بھی اس طرح کے اس کی رضامندی بھی شامل ہوگئی، اس لئے کہ وہ مقتول کا وارث تھا، اس لئے اگر وہ معاف نہ کرتا تو بچنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ قتل نہ ہوتا، تو اُسے قتل سے بھی بچا دیا، اور دوسرے کو معافی بھی دِلا دی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء بھی پورا ہوگیا کہ وہ قتل نہ ہو۔ تو ایک جملہ بول کر کتنی چیزیں فائدے کی حاصل کیں، کہ اس کو قتل ہونے سے بچا لیا، دوسرے کو معافی دلا دی، آپ کا منشاء مبارک بھی پورا ہوگیا، یہ گویا دوسرا واقعہ ہے۔

تیسرا عقلی فیصلہ...... تیسرا واقعہ یہ ہے کہ غزوہ بدر کے اندر کفار کا لشکر پہاڑی کے اس طرف تھا، اور مسلمانوں کا لشکر اِدھر تھا، کفار کا لشکر ایک ہزار سے کچھ زائد افراد پر مشتمل تھا، اور مسلمان کل تین سو تیرہ تھے، کفار کے پاس سواریاں گھوڑے وغیرہ سب کچھ تھا اور مسلمانوں کی ابتدائی حالت تھی، نہ دولت پاس تھی نہ پیسہ تھا نہ کیل کانٹے سے لیس تھے، بس دین اور جہاد کا جوش تھا، تو یہاں سامان کچھ نہیں تھا، چند گھوڑے چند اونٹ، باقی سب پیدل، تلواریں بھی باقاعدہ نہ تھیں، کسی کے پاس تلوار اور کسی کے پاس خنجر اور کسی کے پاس نیزہ، باقاعدہ اگر کوئی چیز وہاں تھی وہ جوش ایمانی کی چیز تھی، سامان کوئی باقاعدہ نہیں تھا، اس بے سروسامانی میں اللہ والوں کا یہ مختصر قافلہ ایک طرف تھا، اور وہ دشمنانِ خدا پوری طرح کیل کانٹے سے لیس دوسری طرف تھے، مشرکین کی فوج کا کوئی آدمی راستہ بھول کر صحابہ کرام کی طرف آنکلا، صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے اسے پکڑ لیا اور اس کو پوچھنا شروع کیا کہ بتاؤ تمہارے لشکر میں کتنے آدمی ہیں، تا کہ ہم اس کی طاقت کا اندازہ کرلیں، اس نے کہا وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ بہت بھاری جمعیت اور اکثریت ہے یہ رعب ڈالنے کے لئے اس نے کہا، صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین عدد پوچھنا چاہتے تھے، وہ عدد بتاتا نہیں تھا، اس پر دباؤ ڈالا سختی کی کہ کسی طرح سے یہ بتلادے کہ کفار کے لشکر کی کتنی تعداد ہے مگر وہ بھی پکا آدمی تھا، بول کے نہیں دیا، اور یہ کہتا رہا۔ وَاللّٰہِ لَکَثِیْرٌ بہت بڑی جمعیت اور بڑا ساز و سامان ہے، تا کہ مسلمانوں کو مرعوب کردے، اس میں جب ذرا آوازیں بلند ہوئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خیمے سے باہر تشریف لائے، اور ارشاد فرمایا: کیسا شور ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! دشمن کے کیمپ کا ایک آدمی اِدھر آپھنسا ہے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ دشمن کی تعداد معلوم کریں اور وہ بتاتا نہیں۔ ارشاد فرمایا چھوڑ دو، کیوں خواہ مخواہ اسے پریشان کیا ہے، اسے چھوڑ دیا، وہ بھی بے چارہ ممنون ہوا، ورنہ اسے اندیشہ تھا کہ قتل کردیتے اور جائز بھی تھا اس لئے کہ دشمن کا آدمی تھا اور مباح الدم تھا، اس کو جنگ میں قتل کرو یا ویسے قتل کرو، دونوں طرح جائز تھا اس لئے کہ وہ اسلام کا مدِّ مقابل تھا تو چھوٹنے کے بعد وہ مطمئن ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اِدھر اُدھر کی ایک دو بات کرکے فرمایا: تمہارے لشکر میں روز کتنے اونٹ میں ذبح ہوتے ہیں؟ اس نے کہا دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے ہیں، فرمایا معلوم ہوگیا ہزار آدمی ہیں اس لئے کہ ایک اونٹ

سو آدمی عادۃً کھانا کھا سکتے ہیں، تو نہ کوئی جھگڑا ہوا نہ کوئی قصہ ہوا، اسی سے کہلوا دیا کہ ایک ہزار کی جمعیت ہے، صحابہ بھی خوش ہو گئے، تعداد بھی معلوم ہو گئی اور اسے چھوڑ دیا کہ اس پر احسان بھی ہوا کہ جا اپنے لشکر میں بھاگ جا اور یہ اثر لے کر گیا کہ مسلمان کریم النفس ہیں کہ دشمن آدمی قبضے میں آ جائے پھر بھی اس کے ساتھ عنایت کرتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا کریمانہ اثر مان کر وہ دعائیں دیتا ہوا چلا گیا، اب اس نے وہاں جا کر جو کچھ بھی کہا ہو گا بہر حال اس کی جان بچ گئی، لشکر کی تعداد بھی معلوم ہو گئی، کوئی جھگڑا اور سختی بھی نہ ہوئی یہ محض دانش مندی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم فرمایا، وحی کے ذریعہ سے علم نہیں بھیجا گیا تھا، تو حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی دانش وری بڑی ہوتی ہے اور وہ منٹوں میں اپنی دانش سے فیصلے کر لیتے ہیں۔

چوتھا عقلی فیصلہ...... چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا کہ دو عورتیں ایک بچے کو لے کر آئیں ایک بچے پر دو عورتوں کی لڑائی تھی، ایک کہتی تھی میرا بچہ ہے دوسری کہتی تھی میرا بچہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کچھ قرائن سے بڑی عورت کے حق میں فیصلہ کر دیا کہ بچہ اس کا ہے، جب وہ چلنے لگی تو چھوٹی عورت راضی نہ ہوئی جس کا واقعی میں بچہ تھا، اس نے کہا ہم سلیمان علیہ السلام سے فیصلہ کرائیں گے ان کے فیصلے زیادہ دانش مندانہ ہوتے ہیں، تو دونوں وہاں حاضر ہوئیں، اور وہی دعویٰ پیش کیا اور بڑی نے کہا کہ لکھئے حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ بھی کر دیا کہ میرا بچہ ہے، مگر چھوٹی کا اصرار تھا کہ میرا بچہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ معلوم کرنا تھا کہ حقیقت میں کس کا بچہ ہے تو اس کی ایک تدبیر اختیار فرمائی، فرمایا ایک چھری منگواؤ بچے کو کاٹ کر آدھا آدھا تقسیم کر دو، چھری کا نام سنتے ہی تو بڑی عورت پر اس کا کوئی زیادہ اثر نہ ہوا اس لئے کہ اس کا بچہ نہیں تھا، مگر چھوٹی تلملا گئی اس نے کہا آپ اسے قتل نہ کریں، اسے ہی دے دیں، یہ زندہ رہے گا تو میں کبھی کبھی دیکھ تو لیا کروں گی، تو بڑی پر اثر نہ ہوا، اور چھوٹی کی اس کیفیت سے اندازہ ہو گیا کہ چھوٹی اس کی ماں ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بچہ اسے دے دیا اور اس کے حق میں فیصلہ کر دیا، یہ محض دانش مندی سے فیصلہ کیا، ایک ایسی تدبیر فرمائی اور ایسا جملہ کہہ دیا کہ چہرے سے معلوم ہو گیا کہ یہ ماں ہے اور یہ ماں نہیں ہے، ماں کا چہرہ بتلا دیتا ہے کہ واقعی میں اس کی اولاد ہے تو حضرات انبیاء علیہم السلام کو جیسے کمالِ علم دیا جاتا ہے ویسے ہی کمالِ عقل بھی دی جاتی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، تو جتنی بڑی نبوت ہے، اتنی بڑی عقل بھی ہونی چاہئے۔

عقل علم کے لئے اور طبیعت عمل کے لئے محل نزول ہے...... اس لئے کہ انسان میں دو چیزیں ہوتی ہیں عقل اور طبیعت، یہ دو طبعی چیزیں ہیں جو انسان میں پیدائشی ہیں، علم جتنا اترتا ہے وہ انسان کی عقل پر اترتا ہے، وہ اسے قبول کرتی ہے، تو جتنی بڑی عقل ہوتی ہے، اتنا ہی علم بڑا ہو کر پھیل جاتا ہے، وہی علم اگر کسی بیوقوف کے اوپر پیش کیا جائے تو ذرہ برابر نہ وہ پھیلے گا نہ اس کے دل میں جمے گا اس لئے کہ علم کے لینے والی طاقت وہ عقل ہے، وہ اس میں نہیں ہے غرض عقل پر تو علم اترتا ہے، اور طبیعت پر عمل اترتا ہے، اس لئے کہ طبیعت کے جذبات

ہیں، طبیعت میں سوجھ بوجھ نہیں ہے جذباتی چیز ہے، جذبے سے عمل کرتی ہے، نہ وہاں دلیل کا دخل ہوتا ہے نہ سوجھ بوجھ کا۔ آپ کو بھوک لگتی ہے تو کیا آپ دلیلوں سے بھوک لگاتے ہیں کہ کچھ دلائل قائم کریں کہ مجھے بھوک لگنی چاہئے اور بھوک لگ گئی، ہزار دلیلیں آپ قائم کریں کہ بھوک نہ لگے مگر وہ ایک طبعی جذبہ ہے وہ تو لگ کے رہے گی تو بھوک عقل سے نہیں آتی وہ طبعی جذبے سے آتی ہے، پیاس طبعی جذبے سے آتی ہے، آدمی استنجا کرنے طبعی جذبے سے جاتا ہے، یہ نہیں کہ پہلے دلائل قائم کرتا ہے کہ مجھے اب عقلاً استنجاء کے لئے جانا چاہئے، اور اتنا وقت مجھے لگانا چاہئے، اور اگر دلیل میں کچھ خلل ہوگیا تو بیٹھ گئے کہ ابھی دلیل مکمل نہیں ہوئی اس لئے مجھے ٹھہر جانا چاہئے، تو استنجاء کے لئے جانے پر آپ ہزار دلیلیں قائم کریں، مگر وہ طبعی جذبہ ہے، وہ تو اندر سے جذبہ اٹھے گا، تو طبیعت کے اندر عقل، شعور اور سمجھ نہیں ہے، اس کے اندر جذبات ہیں، اور عمل کے لئے جذبات کی ضرورت ہوتی ہے، اگر جذبہ نہ ہو تو آدمی عمل نہیں کرسکتا، تو اللہ نے طبیعت کو عمل کی دلیل بنایا ہے اور عقل کو علم کی دلیل بنایا ہے، طبیعت پر عمل اترتا ہے اور عقل راستہ بتلاتی ہے کہ اس جذبے کو یوں استعمال کرو، تو دو چیزیں ہوتی ہیں ایک عقل اور ایک طبع، تو نبی کی عقل بھی تمام امت کی عقل سے زیادہ کامل ہونی چاہئے تاکہ اتنا بڑا علم اس کے اوپر اُتر سکے جس سے پوری امت کی تربیت ہو، اور طبیعت اتنی مضبوط ہونی چاہئے کہ بڑے سے بڑا عمل سامنے آئے تو کوئی رکاوٹ اور تامل نہ ہو، جذبہ اتنا صادق اور قوی ہو کہ بڑے سے بڑا عمل کر گذرے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طبعی قویٰ بھی تمام امت کے قوی سے افضل اور اونچے تھے، اور عقلی قویٰ بھی تمام امت کے قویٰ سے افضل اور اونچے تھے، انہی قویٰ عقلیہ کے اوپر اتنا اونچا علم اترا جس سے پورے عالم کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت فرمائی۔

پڑوسی کی ایذاء رسانی سے تحفظ کی عقلی تدبیر...... اسی میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ ایک شخص کا پڑوسی تھا، اور وہ بہت تنگ کرتا تھا، تکلیفیں پہنچاتا تھا ایذائیں دیتا تھا، اس شخص نے خوشامدیں کیں، اور منتیں بھی کیں اور کہا خدا کے لئے مجھے مت ستا، میں نہ تجھے تکلیف دیتا ہوں نہ ستاتا ہوں اپنے گھر میں رہتا ہوں، مگر وہ باز نہیں آتا تھا، ہر قدم کے اوپر تکلیف کا سامان اور ایذاء رسانی زبان سے عمل سے، غرض یہ شخص عاجز آگیا اور شکایت لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ یا رسول اللہ! پڑوسی نے مجھے عاجز کردیا ہے، میں نے منت سماجت اور خوشامد میں کسر نہیں چھوڑی، لیکن وہ ایسی گندی طبیعت کا آدمی ہے کہ بس ستائے جاتا ہے باز نہیں آتا، میں کیا کروں؟ آپ نے تدبیر بتلائی، فرمایا سارا سامان نکال کر اور عورتوں بچوں کو نکال کر گھر کے سامنے بٹھلا دے، اور گھر خالی کردے، اگر کوئی آکر پوچھے کہ بھائی! تمہارا گھر موجود ہے، یہ سڑک پہ سامان کیوں ڈالا؟ بیوی بچوں کو سڑک پہ کیوں بٹھایا؟ تو کہہ دینا کہ پڑوسی ستاتا تھا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھائی! گھر چھوڑ کر سڑک کے اوپر بیٹھ جا۔ اس نے جا کر یہی کیا، سارا سامان لے کر سڑک پہ رکھ دیا، بیوی بچوں کو لا کر بٹھا دیا، اب لوگ آئے کہ بھائی! تمہارا تو گھر موجود ہے سڑک پہ کیوں بیٹھے ہو؟ اس نے کہا کیا کروں پڑوسی

ستاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھر چھوڑ دے، سڑک کے اوپر بیٹھ جا، لوگوں نے کہا اس مردود کے اوپر لعنت ہے، اس کے بعد ایک دوسری جماعت آئی کہ بھائی کیوں باہر بیٹھے ہو؟ اس نے کہا پڑوسی ستاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ باہر بیٹھ جا، انہوں نے کہا لعنت ہے اس مردود کے اوپر، اب جو جماعت آرہی ہے، صبح سے شام تک لعنت لعنت اور سارے مدینہ میں لعنت لعنت کا شور ہوا، اور ہر گھر میں اس پر لعنت چلی آرہی ہے، وہ پڑوسی بے چارہ عاجز آ گیا اس نے آکر ہاتھ جوڑے کہ اللہ کے واسطے تو گھر چل میں عہد کرتا ہوں کہ قیامت تک تجھے کبھی نہیں ستاؤں گا، اس نے کہا نہیں بھائی! میں نہیں جانا چاہتا، مگر وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کہ اللہ کے واسطے چل، تو نے تو مجھے ملعون بنا دیا، ساری دنیا کی زبان پر لعنت لعنت آ گیا، غرض زبردستی اس کا سامان لے جا کر رکھا، جگہ جگہ قرینے سے لگایا، اور عہد کیا کہ میں عمر بھر کبھی نہیں ستاؤں گا، چنانچہ پھر کبھی نہیں ستایا بلکہ خادم بن کے رہا، یہ تدبیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی سے نہیں فرمائی تھی بلکہ عقل و دانش سے تدبیر فرمائی پڑوسی بھی تائب ہو گیا، برائیوں سے بچ گیا گھر والا اپنے گھر میں آباد ہو گیا، اور اسے سزا بھی ایسی مل گئی کہ عمر بھر اس نے کبھی ایسی سزا نہ دیکھی ہوگی کہ ساری زبانوں پر ملعون بن گیا، یہ دانش کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا، کہ گھر مالک سے آباد ہو گیا، اور پڑوسی خادم بن گیا، اس کی بد عادتیں چھوٹ گئیں تو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ تدابیر ایسی فرماتے ہیں کہ ظالم اپنے ظلم سے بھی توبہ کرے اور ساتھ میں جو صاحبِ حق ہے اس کا کام بھی بن جائے۔ اسی طرح جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے زیادہ قریب ہوتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے علم و عقل اور عمل میں زیادہ رتبہ والے ہوتے ہیں، ان میں بھی یہی عقل کامل آتی ہے جس سے وہ فیصلے کرتے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف کتابیں لکھی گئیں۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ''کتاب الاذکیا'' ہے یعنی جو بڑے بڑے اذکیاء گزرے ہیں ان کی ذکاوت اور ذہانت کے واقعات کہ عقل سے انہوں نے کیا کیا کام کئے اور ان کے مقولے لکھے ہیں۔

مجموعہ عالم کے لئے حماقت بھی نعمت ہے...... اسی طرح ایک ''کتاب الحمقاء'' لکھی ہے کتاب الاذکیاء میں دانش مندوں کے واقعات جمع کئے ہیں اور کتاب الحمقاء میں بے وقوفوں کے واقعات جمع کئے ہیں اس لئے کہ جب تک بے وقوفوں کی بے وقوفیاں نہ معلوم ہوں دانش مندوں کی دانشمندی نہیں کھلتی وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ ایک ضد سے ہی دوسری ضد پہچانی جاتی ہے۔ اگر دنیا میں بے وقوف نہ ہوتے تو عقل مندوں کی عقل کبھی نمایاں نہ ہوتی، تو حقیقت میں بے وقوفوں کا وجود بھی دنیا میں بہت غنیمت ہے، خدا انہیں سلامت رکھے اگر یہ بیوقوفی نہ کریں تو عقل نہیں کھل سکتی، تو جہاں مجموعہ عالم کے لئے عقل نعمت ہے، وہاں حماقت بھی نعمت ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں پارٹیاں پیدا کیں، ذہینوں کی بھی اور بلیدوں کی بھی، ذکیوں کی بھی اور احمقوں کی بھی دونوں کا ٹکراؤ رہتا ہے اور دونوں کے ٹکراؤ سے حقیقت کھلتی ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بلندی عقل...... امام ابو حنیفہؒ ان کی دانش مشہور ہے، اور تمام علماء کرام ان کی

عقل ودانش کے قائل تھے،علم تو تھا ہی مگر عقل بھی بہت اونچی تھی ،ایک دفعہ دمشق کی جامع مسجد میں امام ابی حنیفہؒ نے نماز پڑھی،سلام پھیرا تو ایک ہجوم ان کے اردگرد آ گیا،کوئی ہاتھ چوم رہا ہے کوئی مصافحہ کر رہا ہے،امام مالکؒ ایک طرف کھڑے ہوئے تھے،ساری مخلوق امام ابی حنیفہؒ پر جھک گئی،ایک شخص نے امام مالکؒ سے پوچھا یہ کون شخص ہے کہ ساری دنیا اس پر گر رہی ہے،اور اس پر جھکی جا رہی ہے،اور نثار ہونا چاہتی ہے،کوئی ہاتھ چوم رہا ہے کوئی پاؤں پڑ رہا ہے،امام صاحبؒ نکلنا چاہتے ہیں مگر لوگ نکلنے نہیں دیتے ہر طرف بے شمار آدمی ہیں؟

امام مالکؒ نے فرمایا تو نہیں جانتا یہ کون شخص ہے؟اس نے کہا میں تو واقف نہیں،ارشاد فرمایا یہ وہ شخص ہے اگر جامع دمشق کے اس پتھر کے ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہے تو ثابت کر دے گا اور دنیا ماننے پر مجبور ہوگی کہ یہ واقعی سونے کا ہے،یہ ایسا شخص ہے۔اس لئے امام صاحبؒ کے عجیب عجیب واقعات ہیں،جو دانش مندی سے انہوں نے طے فرمائے،جھگڑے یا مقدمات تھے،ان میں مسئلہ سے باہر نہیں نکلے مگر عقل ودانش سے معاملات کا فیصلہ فرما دیا۔چنانچہ ایک شخص کی اپنی بیوی سے کچھ لڑائی رہتی تھی،آپس میں دونوں کی بنتی نہیں تھی،بیوی خاوند کو منہ لگانا نہیں چاہتی تھی خاونداس پر سو جان سے عاشق تھا مگر کچھ مزاج سے بھی مجبور تھا،اس لئے کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی تھی،تو ایک دن دونوں چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے،بات چیت ہو رہی تھی تو اس نے کوئی جملہ ایسا کہہ دیا جس سے عورت کا دل دکھا اور وہ صدمے کی وجہ سے چپکی ہو کے بیٹھ گئی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس نے ہر چند کہا کہ بولتی کیوں نہیں؟اب وہ بولتی نہیں،اس نے کہا اگر صبح کی اذان سے پہلے نہ بولی تو تیرے اوپر طلاق،وہ تو بولنا نہیں چاہتی تھی،خاوند بلوانا چاہتا تھا،وہ چپ بیٹھی تھی،اس نے کہا اچھا چپ بیٹھی رہ،اگر تو صبح سے پہلے نہ بولی،اسی طرح ثابت رہی صبح کی اذان تک تو تیرے اوپر طلاق۔عورت کے ہاتھ میں بات آ گئی اس نے سوچ لیا کہ اب میں صبح کی اذان تک بولوں گی نہیں،تاکہ میں مطلقہ ہو جاؤں اور اس کے پنجے سے چھوٹوں۔اب یہ بے چارہ کہہ تو گذرا،مگر یہ اب اور زیادہ چپ ہو کر بیٹھ گئی،خاوند نے کہا اگر واقعی یہ نہ بولی اور اذان ہوگئی،تو یہ ہاتھ سے نکل جائے گی اس نے منتیں کی اور ہاتھ جوڑے،مگر اس نے کہا اب تو بات قبضے میں آ گئی،الغرض خاوند نے منتیں کیں خوشامدیں کیں جب کسی طرح راضی نہ ہوئی اور مایوس ہو گیا کہ صبح کی اذان ہوئی اور یہ میرے ہاتھ سے نکلی،تو علماء کا دروازہ جھانکنا شروع کیا اور آئمہ فتویٰ کے گھروں پہ آیا کہ یہ صورت ہوگئی ہے،انہوں نے کہا بہر حال اگر وہ بول پڑی تو تیرے قبضے میں رہے گی ورنہ تیرے قبضے سے نکل جائے گی،وہ بہت بے چارہ حیران ہوا اور اب اسے یقین ہو گیا کہ بیوی میرے ہاتھ سے گئی،آخر امام ابی حنیفہؒ کے پاس پہنچا،حضرت یہ قصہ ہے اور میں خود اپنے قول کی وجہ سے مبتلا ہو گیا،میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر تو صبح کی اذان تک چپ رہی تو تیرے اوپر طلاق ہے وہ تو چپ ہو کر بیٹھ گئی تو طلاق پڑ جائے گی،فرمایا کہ طلاق نہیں پڑے گی،جا اپنے گھر جا کے آرام کر،اور گھر والی کو بولنے پر آمادہ کر،لیکن اگر نہ بھی بولی تو بھی طلاق نہیں پڑے گی،اس نے کہا کیسے نہیں پڑے گی،فرمایا تو جا،جا کر بلوانے کی کوشش کر،وہ پھر گھر

آیا،اس نے ہر چند منتیں کیں، گدگدیاں اٹھائیں، ہنسی میں کہا،مگر وہ عزم کر کے بیٹھی ہوئی ہے کہ میں اب نہیں بولوں گی اور مجھے طلاق ہو جائے گی،اور فرمایا تھا کہ جاگتے رہنا،اور کوشش جاری رکھ شاید بول پڑے۔امام ابوحنیفہؒ چلے رات کے تین بجے ہوں گے اور مسجد میں آکر اذان دے دی، وہ سمجھی کہ صبح کی اذان ہے،اس نے کہا دیکھا اذان ہوگئی ہے اب میں تجھ سے جدا ہوگئی ہوں،اب یہ بے چارہ حیران کہ طلاق تو ہوگئی،مگر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ بھئی غلطی ہوگئی کہ یہ صبح کی اذان نہیں تھی یہ تہجد کی اذان تھی،اب یہ بے چاری پچھتائی تو امام صاحبؒ نے دانش مندی سے ان کی بیوی بچادی، یہ مسئلہ کی بات نہیں تھی، یہ دانش مندی اور عقل مندی کی بات تھی،اسی بات کو مسئلہ کے اندر لیا،مسئلہ سے باہر نہیں ہوئے مگر فضا ایسی پیدا کر دی کہ طلاق سے بچ جائے۔

حضرات اہل اللہ عقل میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں......تو جیسے حضرات اہل اللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں خلیفہ ہوتے ہیں ویسے ہی عقل ودانش میں بھی خلیفہ ہوتے ہیں،امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں ایک شخص حاضر ہوا کرتا تھا،ایک روز مجلس میں رو رہا تھا،ایک دن وہ اپنے گھر جا کر سویا،مال دار آدمی تھا،تو رات کو گھر چور آگئے،سارا مال واسباب انہوں نے سمیٹنا شروع کیا،تو یہ پڑا ہوا دیکھتا رہا،چور بہت تھے، یہ تنہا تھا،لیکن جب سارا مال واسباب سمیٹ کر جانے لگے تو اس نے کچھ ایسی حرکت کی وہ سمجھ گئے کہ یہ جاگ رہا ہے،چوروں نے مال واسباب کو چھوڑا اور آکر اس کے گلے پر چھری رکھی،اور کہا خبردار جو بولا،اب یہ بے چارہ جان بچانے کی خاطر دب گیا،ورنہ چلاّ تا تو شور ہوتا محلّہ والے جمع ہو جاتے چور پکڑے جاتے،مگر چوروں نے زبردستی اس کو چپکا کرادیا،اس کے منہ میں روئی وغیرہ دے دی اور مال بٹورتے رہے،ہاتھ پیر اس کے باندھ دیئے،جب یہ جانے لگے تو چوروں کو یہ فکر ہوئی کہ جب صبح ہوگی تو آکر اس کے منہ سے کوئی تو روئی نکالے گا، یہ ہمیں پہچان چکا، ہیں تو ہم محلّہ ہی کے،اور صبح یہ خبر دے گا بات وہیں کی وہیں رہی پھر پکڑے گئے،تو کسی نے کہا اسے قتل کر دو،تو کہا کہ چوری کا جرم تو کیا ہے قتل ناحق کا بھی جرم سر لو، یہ صحیح نہیں۔اس زمانے کے چور بھی آدھے مولوی تھے،اس لئے کہ فقہاء کا دور تھا،تو انہوں نے آکر اسے یہ کہا کہ تو اس بات کا عہد کر کہ ہمارا پتہ نشان کسی کو نہیں بتلائے گا،اس نے جان بچانے کی خاطر عہد کیا،مگر چوروں کو یہ شبہ تھا کہ اس نے عہد تو کرلیا،لیکن اگر یہ عہد شکنی کرے پکڑے تو پھر بھی جائیں گے،کسی ایسے انداز سے باندھ دو کہ یہ ہمارا پتہ نہ دے سکے،تو چوروں نے یہ کہا کہ تو طلاقِ مغلظہ کی قسم کھا کہ: اگر میں نے تمہارا کسی کو پتہ دیا تو میری بیوی کو تین طلاق۔اس نے جان بچانے کے لئے طلاقِ مغلظہ کا حلف اٹھالیا،اب چور مطمئن ہوگئے،اس واسطے کہ وہ جانتے تھے دیانت کا زمانہ ہے جھوٹا حلف اٹھانا قتل ہو جانے سے اہم سمجھا جاتا ہے تو یہ جھوٹ نہیں بولے گا،اگر بولے گا تو بیوی ہاتھ سے جائے گی،سزا بھی بھگتے گا،حلف ہی ایسا تھا،اب چور مطمئن ہو کر مال لے کر چلے گئے،اور یہ بے چارہ بندھا ہوا بیٹھا ہے،چوروں کو جانتا ہے مگر بتا نہیں سکتا،اس لئے کہ اگر بتاتا ہے تو بیوی پر طلاق پڑتی ہے،عجیب کیفیت میں مبتلا ہے۔فقہاء کے

دروازوں پہ گیا اور کہا یہ قصہ ہے، چوروں کو جانتا ہوں مگر بتلا نہیں سکتا، اس لئے کہ بتلاؤں گا تو بیوی پر طلاق پڑ جائے گی، تو سارے فقہاء نے یہ کہا کہ بھائی! یا مال رکھ لے یا بیوی رکھ لے، اگر تو پتہ بتلا دے گا تو بے شک بیوی ہاتھ سے نکل جائے گی مگر مال مل جائے گا، اور اگر نہیں بتلاتا تو مال نہیں ملے گا، مگر بیوی تو قبضہ میں ہے، دونوں چیزیں جمع نہیں ہوسکتیں کہ مال بھی مل جائے اور بیوی بھی رہے ایک چیز پسند کر لے، غرض یا لاکھوں روپے کا مال جاتا ہے یا لاکھوں کی بیوی جاتی ہے۔

اخیر میں بے چارہ بہت پریشان اور دم بخود ہو کر امام صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ مجلس میں پریشان بیٹھا ہوا تھا، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ بھائی! تم آج بہت اداس ہو اور غمگین نظر آتے ہو۔ انہوں نے کہا، جی ہاں! کچھ واقعہ ایسا ہی ہے۔ فرمایا کیا واقعہ ہے؟ بولوں گا تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا، آپ نے فرمایا بندۂ خدا کچھ تو بتا کیا ہوا، عرض کیا: حضرت! یہ قصہ پیش آیا کہ چور آگئے مال لے گئے، اور مجھے طلاقِ مغلظہ کا حلف دے گئے، اور اب میں چوروں کو جانتا ہوں لیکن بتلاتا ہوں تو بیوی ہاتھ سے جاتی ہے، اور نہیں بتلاتا تو مال ہاتھ سے گیا۔

امام صاحبؒ سمجھ گئے فرمایا: تو اطمینان رکھ مال بھی نہیں جائے گا، بیوی بھی رہ جائے گی اور تو بتا بھی دے گا، اس نے کہا حضرت یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فرمایا: تو فکر نہ کر، ہو جائے گا۔ فرمایا: تو ایسا کر کہ اپنے محلہ میں اعلان کردے کہ کل امام ابوحنیفہؒ میرے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھیں گے، اور چوروں کے بارے میں فیصلہ فرمائیں گے۔ یہ اعلان ہوا، تو ہزاروں آدمی جمع ہوئے اس لئے کہ معاملہ ایسا سنگین تھا کہ دو چیزوں میں سے ایک چیز رکھ سکتا تھا، دور کھنے کے کوئی معنی نہیں تھے، اور شہرت یہ ہوگئی کہ امام صاحبؒ نے مسئلہ کوئی ایسا بتادیا ہے کہ مال بھی ہاتھ آجائے بیوی بھی نہ جائے اور پتہ بھی بتلا دے، تو تمام فقہاء نے غم وغصہ کا اظہار کیا، کیا ابوحنیفہؒ حرام کو حلال بنانا چاہتے ہیں؟ جب وہ بتائے گا تو یقیناً بیوی مطلقہ ہو جائے گی۔ امام صاحبؒ نے مقررہ وقت پر آکر نماز پڑھی تو محلہ ہی کے چور تھے وہ بھی آئے، ہزاروں کا مجمع ہو گیا کہ امام صاحبؒ اجتماع ضدین کا مسئلہ کیسے حل کریں گے، امام صاحبؒ کھڑے ہو گئے، اور اس شخص کو بھی کھڑا کیا، اور فرمایا لوگ مجمع بن کر مسجد سے نہ نکلیں ایک ایک آدمی نکلے اور اس سے یہ کہا کہ جب آدمی گزرے تو یہ کہنا کہ یہ چور نہیں ہے، یہ چور نہیں ہے اور جب چور آجائے تو چپ کھڑے ہو جانا، تو آدمی جب گذرے تو یہ کہتا رہا کہ یہ چور نہیں، اور جب چور آئے تو یہ چپکا کھڑا تو چور پکڑے گئے اور اس نے بتلا بھی دیا کہ یہ چور ہے مگر اس طرح نہیں بتلایا کہ یہ چور ہے اس طرح بتاتا تو بیوی پر طلاق پڑتی، مگر وہ چپ رہا تو چپ رہنے سے تو طلاق نہیں پڑتی وہ تو بولنے سے پڑتی ہے، تو امام صاحبؒ نے چپ رہنے سے چور کا پتہ چلا لیا، اور بیوی کو طلاق سے بچالیا، تو یہ کمالِ دانش تھی کہ چور بھی پکڑے گئے، مال بھی مل گیا، بیوی بھی ہاتھ سے نہ گئی، اور مسئلہ اپنی جگہ قائم رہا، مسئلہ میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوا، تو یہ کمالِ دانش تھی یہ حقیقت میں اس کے اندر عقلیں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔

تھوڑے علم کے لئے بہت زیادہ عقل کی ضرورت ہے...... مثل مشہور ہے کہ ''یک من علم را دہ من عقل می باید'' ایک من علم کے لئے دس من عقل کی ضرورت ہے۔ علم من بھر ہو اور عقل بیس سیر ہو تو علم اوندھا ہو جائے گا، الٹا ہوگا، تو محض عالم بننے سے کام نہیں چلتا، جب تک قلب کے اندر ذکاوت نہ ہو اور تمام چیزوں کو اپنی اپنی حد کے اندر رکھنے کا سلیقہ نہ ہو تو عالم مطلقاً علم سے کامیاب نہیں ہوتا جب تک اس کے اندر عقل کا جوہر نہ ہو اور دماغ میں کوئی سلیقہ نہ ہو، اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي'' ⓵ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو دعا دی، ہے جو آپ کی احادیث یاد کرے آپ کے کلامِ مبارک کو ذہن میں لے، تو فرمایا اللہ اس شخص کا چہرہ تر و تازہ رکھے جو میرے کلام کو اپنے دل میں جگہ دے رہا ہے، اور اسے محفوظ کر رہا ہے، اور اپنے اندر جگہ دے رہا ہے اور اُسے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا، اور فرمایا بہت سے علم و فقہ کے اٹھانے والے غیر فقیہ ہوتے ہیں، ان میں سمجھ نہیں ہوتی، ان کا کام یہ ہے کہ کسی عالم کے سامنے اس کلام کو نقل کر دیں، اس میں اپنی طرف سے کچھ نہ کہیں، اس لئے کہ ان میں اتنی ذکاوت نہیں ہے، کہ وہ مسئلہ نکالیں اور وہ صحیح بھی ہو، اس لئے وہ نقل پر قناعت کریں، مسئلہ نہ بیان کریں، ان میں چونکہ کلام سے مسئلہ استنباط کرنے کا مادہ نہیں ہے، اس واسطے مسائل نکالنے کی کوشش نہ کریں ورنہ الٹے سیدھے مسائل نکالیں گے اور دنیا حیرانی و پریشانی میں مبتلا ہوگی، تو نفسِ کلام نقل کر دیں مگر اس کے اندر سے مسائل کا استخراج نہ کریں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعض علماء وہ ہوں گے کہ علم اور فقہ ان کے اندر ہے مگر سمجھ ان کے اندر نہیں ہے، اور بعض وہ ہوں گے کہ علم تھوڑا ہے، مگر سمجھ بہت ہے لیکن تھوڑے کو اپنی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے زیادہ کر کے دکھا دیتے ہیں۔ بعض لوگوں نے امام ابی حنیفہؒ پر الزام لگایا ہے کہ انہیں کل سترہ احادیث یاد تھیں، حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، امام ابی حنیفہؒ رواۃِ حدیث میں سے ہیں اور روایاتِ حدیث کی ایک مستقل کتاب مسند ابی حنیفہؒ کے نام سے مشہور ہے، اس میں اپنی روایت سے سینکڑوں حدیثیں نقل فرمائی ہیں تو تاریخی طور پر یہ دعویٰ غلط ہے، لیکن میں کہا کرتا ہوں کہ اس دعوے کو مان لیا جائے تب بھی اس سے امام ابی حنیفہؒ کی ذکاوت ثابت ہوگی کہ کل سترہ احادیث سے اتنی بڑی فقہ کو مدوّن کر دیا کہ ہزار ہا مسائل آ گئے، یہ تو کمالِ دانش کا ثبوت ہے، اور ایسے مسائل کہ حدیث و قرآن کے مخالف نہیں ہوئے، بلکہ حدیث و قرآن سے نکل رہے ہیں، تو ایسے شخص کی دانش کی کیا انتہا ہے بہر حال عالم کے لئے جیسے علم کمال ہے اس سے زیادہ ضرورت عقلی کمال کی ہے عقل کے بغیر علم چلتا نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل تمام انبیاء علیہم السلام کی عقل سے زیادہ ہے...... تو چونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام پورے عالم کے لئے مربی ہوتے ہیں، اور سید الانبیاء والمرسلین عالمین کے لئے مربی ہیں، اس لئے سارے انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر آپ میں عقل بھی ہونی چاہئے، اس لئے کہ سارے انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر

⓵ السنن لابن ماجه، المقدمة، باب من بلغ علما ج: ١ ص: ٢٦٧.

آپ کو علوم عطا کئے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود حدیث میں فرماتے ہیں: ''اوتیت علم الاولین والاخرین'' مجھے اگلے اور پچھلوں کے تمام علوم عطا کردیئے گئے، یہ تو اجمالی دعویٰ ہے احادیث میں تفصیلی دعوے بھی موجود ہیں، فرماتے ہیں، شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں یہ روایت نقل کی ہے۔ ''اُوْتِیْتُ عِلْمَ الْاَسْمَاءِ کُلِّھَا کَمَا اُوْتِیَ اٰدَمُ عِلْمَ الْاَسْمَاءِ کُلِّھَا'' قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا﴾ ① حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھلائے گئے، تو آپ فرماتے ہیں جیسے آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھائے گئے مجھے بھی ساری چیزوں کے نام سکھلائے گئے غرض آدم علیہ السلام کا جو علم ہے وہ مجھے عطا کیا گیا، حضرت نوح علیہ السلام کو جو صور واشکال کا علم دیا گیا وہ علم آپ کو عطا کیا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقائق کا علم دیا گیا وہ علم آپ کو بھی عطا کیا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تفصیلاتِ احکام کا علم دیا گیا، وہ تفصیلات احکام آپ کو بھی عطا کی گئیں، اور اس سے بڑھ کر وہ علم عطا کیا گیا جو تمام انبیاء علیہم السلام کے بعد آپ ہی کی خصوصیت ہے وہ یہ کہ بندہ اور خدا میں کیا ربط ہے، ان نسبتوں کے جو علوم عطا کئے گئے ہیں، وہ تمام علوم سے بڑھ کر علوم ہیں، تو تمام انبیاء علیہم السلام کے علوم آپ کو دیئے گئے اور آپ کے مخصوص علم بھی آپ کو دیئے گئے، اس لئے قدرتی طور پر جتنی عقلیں سارے انبیاء علیہم السلام کو دی گئیں وہ ساری آپ کے اندر ہونی چاہئے، تبھی تو آپ ان علوم کا تحمل فرما سکیں گے غرض آپ کی عقل تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام دانشوروں سے بالا ہے۔

اعتدالِ مزاج سے اعتدالِ عقل، علم اور اخلاق ہوگا...... ابن سینا مسلمانوں کا بہت بڑا طبیب ہے، اور علم طب کا موجد سمجھا جاتا ہے، اس کو معلم ثانی کہتے ہیں، فارابی کو معلم اول کہا جاتا ہے اور ابن سینا کو معلم ثانی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے گویا طب کی تجدید اور اس کو از سرِ نو زندہ کیا، اور بہت سے مسائل اپنی طرف سے بڑھائے، وہ کہتا ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عالم میں اتنا معتدل مزاج کسی کا نہیں جتنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، مزاج کے اندر کمالِ اعتدال، کمال عقل کی دلیل ہوتی ہے، اگر مزاج کے اندر اعتدال نہ ہو، بلکہ افراط اور تفریط ہو اتنی ہی مزاج میں کمی اور زیادتی ہو جاتی ہے، لیکن مزاج معتدل ہوگا تو عقل بھی معتدل ہوگی اس لئے اس کا قول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل العقل ہیں۔ اور جس کی عقل کامل ہے اس کے اخلاق بھی کامل ہیں اس کا علم بھی کامل ہوگا، اس کے معاملات بھی کامل ہوں گے اس کی دیانت بھی کامل ہوگی، ابنِ سینا چونکہ عقلاء اور حکماء کی لائن کا آدمی ہے اس لئے عقل وحکمت کی لائن سے اس نے دعویٰ کیا کہ جب عقل کامل ہے کیونکہ مزاج کامل ہے اس لئے علم بھی آپ ہی کا کامل ہوسکتا ہے، اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ اعتدال مزاج سے اعتدال عقل پیدا ہوتا ہے۔

ارسطو کے اعتدالِ مزاج اور سکندر رُومی کی خرابیِ مزاج کا عجیب واقعہ...... اس پر مجھے ارسطو اور سکندر

① پارہ: ۱، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۳۱.

رومی کا واقعہ یاد آ گیا، سکندر رومی بہت بڑا بادشاہ گذرا ہے، اور اس کا وزیر اعظم ارسطو تھا، ارسطو یونان کا بہت بڑا حکیم ہے اور یوں کہنا چاہئے کہ طب کا بہت بڑا مجتہد ہے، سکندر رومی کو بارہ مہینے سر کے درد کا عارضہ رہتا تھا، اور سر میں ٹیس اٹھتی رہتی تھی، ارسطو نے ہر چند علاج کئے، ہر قسم کی دوائیں استعمال کرائیں مگر فائدہ نہیں ہوتا تھا، تو سکندر تنگ آ گیا اور اس نے کہا مجھ جیسا بادشاہ اور تجھ جیسا طبیب اور پھر مجھے شفا نہ ہو، یہ تو حیف اور افسوس کی بات ہے، اب اگر تجھے علاج کرنا ہے تو کر، مگر دوا ایسی ہو کہ نہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی ہو نہ لگانے کی ہو، نہ سونگھنے کی ہو، اور میرا درد جاتا رہے، ارسطو نے کہا، یا اللہ! یہ تو جادو ہی ہو سکتا ہے کہ نہ کھانے نہ پینے نہ لگانے نہ سونگھنے کے دائرہ کی دوا ہو، یہ تو جادو ہی ہو سکتا ہے، میں جادوگر تھوڑا ہی ہوں، میں تو طبیب ہوں اب ایسی دوا کہاں سے لاؤں، تو سوچ میں پڑ گیا۔

اس نے سکندر سے کہا کہ مجھے تین مہینے کی مہلت دو تا کہ ایسی دوا سوچوں، اس نے کہا ہم نے تجھے تین مہینے کی مدت دے دی، تو ارسطو نے ہندوستان کا سفر کیا، اس لئے کہ اس زمانے میں طب کا سب سے زیادہ زور ہندوستان میں تھا اور مؤرخین کہتے ہیں فن طب ہندوستان سے ہی شروع ہوا ہے، اس لئے کہ فن طب حضرت ادریس علیہ السلام کے اوپر نازل ہوا ہے وہ اس علم کے موجد تھے اور وحی کے ذریعہ ان پر نازل ہوا ہے اور ہندوستان میں ہی علم طب کو فروغ ہوا ہے تو علم طب یونان وہ درحقیقت علم طب ہندوستان ہے یونانی ہندوستانیوں کے شاگرد ہیں، اور ہندوستان سے یونان کے اندر طب کو لے کر گئے ہیں، پھر اسلام آنے کے بعد یونان سے عربوں کے اندر آئی ہے تو ابتداء ہندوستان سے ہوئی ہے۔

اس زمانے میں ہندوستان کا ایک بہت بڑا نابینا طبیب تھا، تمام اطباء پر اس کو سبقت حاصل تھی پورے ملک میں اُسے حاذق شمار کیا جاتا تھا، تو ارسطو نے ہندوستان کا سفر کیا کہ ایسی دوا تو نابینا طبیب ہی بتا سکے گا کہ نہ لگانے کی ہو، نہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی، نہ سونگھنے کی، اور درد جاتا رہے، میری عقل تو کام کرتی نہیں ممکن ہے یہ نابینا طبیب کچھ بتا دے۔

اس نابینا طبیب کا قاعدہ تھا کہ مریضوں کی لائن لگا کر کھڑی کردی جاتی تھی اور وہ ایک طرف سے چلتا تھا، اور مریض کی نبض پر ہاتھ رکھا، حال پوچھا اور ساتھ کے لوگوں سے کہہ دیا کہ یہ نسخہ مرتب کردیں، غرض نبض دیکھتا ہوا ایک طرف سے ترتیب وار چلتا تھا، اس میں بڑے چھوٹے، امیر فقیر کا فرق نہیں تھا، ابتداء میں جو آ جائے فقیر آ جائے تو وہی سہی، تو ارسطو کا اس نابینا طبیب سے کوئی تعارف تو تھا نہیں تو مریضوں کی لائن میں سب سے آخر میں جا کے کھڑا ہو گیا کہ اس وقت میں اپنا عرض حال کردوں گا، ویسے تو ارسطو معروف تھا، دنیا جانتی تھی مگر اس طبیب سے خصوصی تعارف نہیں تھا، تو مریضوں کی لائن میں جا کے بیٹھ گیا، نابینا طبیب مریضوں کو دیکھتا اور نسخے بتاتا ہوا جب آخر میں پہنچا تو ارسطو کا ہاتھ لیا، اور نبض دیکھی، نبض دیکھتے ہی کہا ہے کہ ارسطو؟ ارسطو اسی وقت بول پڑا کہ جی

ہاں ارسطو.....تو معانقہ کیا اور بغل گیر ہوا، اور کہا کہ آپ جیسا اتنا بڑا طبیب مریضوں کی لائن میں بیٹھ گیا! اس نے کہا چونکہ آپ سے ملنا تھا تو میں کہاں اطلاع کراتا اس لئے مریضوں کی لائن میں بیٹھ گیا، تو بہت ہی مدارات کے ساتھ وہ نابینا طبیب ارسطو کو اپنے مکان پر لے آیا اور کہا کہ یونان سے ہندوستان کا اتنا بڑا سفر کیسے کیا.....؟

ارسطو نے کہا یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا پہلا سوال یہ ہے کہ اس طب میں کون سا اصول ہے کہ نبض دیکھ کر نام بھی معلوم کرلو، نبض دیکھ کر مزاج معلوم ہوتا ہے، اس کا اتار چڑھاؤ معلوم ہوتا ہے، بیماری معلوم ہوتی ہے، نبض دیکھ کر نام معلوم ہو جائے میں نے تو یہ اصول کہیں پڑھا نہیں، اس نے کہا ہاں یہ اصول طب کا نہیں مگر اس وقت ایک اصول میں نے طب کا لیا اور ایک اپنی عقل سے سمجھا، دونوں ملا کر میں نے نام معلوم کرلیا، وہ یہ کہ جب میں نے آپ کی نبض پہ ہاتھ رکھا اتنی کامل اعتدال کے ساتھ نبض چل رہی تھی کہ میں نے اتنی معتدل نبض دنیا میں کسی کی نہیں دیکھی، ہزاروں مریض آئے، ہزاروں لوگ آئے مگر اتنا صحیح المزاج اور قوی الاعتدال مزاج میں نے نہیں دیکھا، یہ تو میں نے نباضی کے اصول سے معلوم کیا، آگے میرے دل نے شہادت دی کہ ایسا کامل المزاج اس دور میں اگر کوئی ہوسکتا ہے تو ارسطو ہوسکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، اس لئے میں نے ذہن سے حکم لگا یا دیا کہ یہ ارسطو ہے۔

اب اس نے پوچھا کہ آپ کیسے آئے.....؟ ارسطو نے کہا کہ یہ قصہ ہے کہ میں سکندر رومی کا معالج ہوں بارہ مہینے اسے سر کا درد رہتا ہے ساری دوائیں دیتا دیتا تھک گیا ہوں اب اس نے یہ شرط لگائی کہ دوا نہ کھانے کی ہو، نہ پینے کی ہو، نہ لگانے کی ہو، نہ سونگھنے کی اور مجھے فائدہ ہو جائے، تو میرے پاس ایسی کوئی دواء نہیں ہے، اور نہ میں نے طب میں پڑھی ہے۔ اس نابینا طبیب نے کہا کہ میرے پاس ایسی دوائی ہے جو نہ کھائی جائے گی، نہ پی جائے گی، نہ سونگھی جائے گی، نہ مالش کی جائے گی اور فائدہ ہو جائے گا، اور میں وہ دوا بنوا کے دیتا ہوں چنانچہ اس نے دوا بنوائی، اور دوا کا کئی سیر کا مجموعہ تیار ہوا اسے پسوایا اور پسوا کر اتنا باریک کر دیا جیسے سرمہ ہوتا ہے۔

اس نابینا طبیب نے کہا اس کی شکل یہ ہوگی کہ چھوٹی چھوٹی ڈھولکیاں اور طبلے بنائے جائیں اور ان میں یہ تھوڑی تھوڑی دوا بھر دی جائے اور سکندر رومی کے سامنے ناچ رنگ اور گانے بجانے کی محفل منعقد کی جائے، اور یہ طبلے اور ڈھولکیاں بجائی جائیں ان کے بجنے سے دوائی کا ایک ذرہ بھی فضا سے اڑ کر سکندر کے ناک میں چلا گیا تو اس کے سر کا درد جاتا رہے گا، اور اسے پتہ بھی نہ چلے گا، یہ دوا نہ کھانے کی، نہ لگانے کی، نہ پینے کی، نہ سونگھنے کی، بس ایک ذرہ ناک میں پہنچ گیا تو درد جاتا رہے گا۔

چنانچہ ارسطو نے آکر اس دوا کے استعمال کے لئے طبلے اور ڈھولکیاں بنوائیں، اور ان میں دوائی بھری، اور اس کے بعد وہ محفل ناچ رنگ اور گانے بجانے کی منعقد کی اور طبلوں پر تھاپ پڑنی شروع ہوئی لکڑی اور کانے سے ان طبلوں اور ڈھولکیوں کو بجانا شروع کیا، اور ان کے بجانے سے ان کے اندر تموج ہوا، اس کی وجہ سے وہ ذرات خارج ہوئے اور مجلس میں معمولی سا خوشبودار غبار خارج ہوا، مجلس میں عام خوشبوئیں تھیں، اگر بتیاں جل رہی تھیں، اور بھی

خوشبو تھی تو ان خوشبوؤں میں شامل ہو کر یہ خوشبو بھی اس کے ناک میں پہنچی اور کچھ اس دوائی کے اجزاء سکندر کے ناک میں پہنچ گئے، اسی وقت درد بند ہو گیا، صبح دیکھتا ہے تو بالکل تندرست ہے اور برسہا برس کا درد جاتا رہا۔

تو ارسطو سے کہا آج تو میرا درد بالکل جاتا رہا، اس نے کہا میں نے علاج کیا ہے، یوں ہی تھوڑا جاتا رہا۔ سکندر نے کہا تو نے کیا علاج کیا؟ کوئی دوائی تو تو نے پلائی نہیں، وہ تو آپ نے کہا تھا کہ دوائی ایسی ہو جو نہ کھانے کی ہو نہ پینے کی ہو نہ سونگھنے کی ہو نہ لگانے کی ہو، بادشاہ نے کہا وہ کیا تھی؟ اس سے آپ کو کیا غرض؟ باقی درد تو نہیں رہا؟ اس نے کہا درد تو نہیں رہا، بہرحال بہت خوش ہوا، اور یہ کہا کہ ایک ترازو منگوا کر ایک پلڑے میں ارسطو کو بٹھایا اور ایک پلڑے میں سونا رکھوایا، سونا اس کے برابر تلوا کر اس کو انعام دیا۔

چنانچہ پانچ برس گذر گئے ذرہ برابر درد نہیں ہوا، چھ برس کے بعد پھر سر میں کچھ چبک محسوس ہوئی، تو ارسطو کو بلوایا اور کہا کہ سر میں دوبارہ چبک محسوس ہوئی، اس وقت جو تم نے علاج کیا تو اب دوبارہ کرو، اب وہ دوا ختم ہو چکی تھی، اور دوسرے اس کا نسخہ معلوم نہیں تھا، اس نے حیلے بہانے کئے کہ وہ دوائی تو تین چار ماہ سے کم میں تیار نہیں ہوتی، اس نے کہا کوئی مضائقہ نہیں تین مہینے کی آپ کو رخصت ہے آپ دوائی بنائیں۔

اَب ارسطو کا کمال ہے کہ اس کے پاس نسخہ تو نہیں تھا جو اس کے پاس تھوڑی سی دوا باقی رہ گئی تھی تو اسے چکھ چکھ کر سارے اجزاء معلوم کر لئے اور نسخہ لکھ لیا، نسخہ لکھ کر پھر وہ دوائیں بنائیں اور نسخہ مکمل تیار ہو گیا۔ پھر اسی طرح ناچ رنگ کی محفل منعقد کی، اگلے دن درد پھر غائب ہو گیا، ارسطو نے چکھ کر نسخہ کے تمام اجزاء معلوم کر لئے اور اس کا اثر بھی ہو گیا، مگر اس درجے کا فائدہ نہیں ہوا جو پہلی مرتبہ ہوا تھا، ارسطو نے کہا چونکہ دوائی پرانی تھی اس لئے اثر کم ہوا، اور تین ماہ کی مہلت دیں، نئی دوائی بنے گی تو پھر اثر زیادہ ہوگا، سکندر نے کہا آپ نئی دوائی بنائیں، تین ماہ کی مہلت ہے۔ پھر ارسطو سفر کر کے ہندوستان پہنچا، اور اب بھی طبیب کے گھر نہیں گیا، اور مریضوں کی لائن میں حسب سابق بیٹھ گیا، اور وہ نابینا طبیب آیا اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی معانقہ کیا اور کہا کہ ارسطو تو پھر آ گیا؟ اب کیسے آنا ہوا؟ اس نے کہا آپ نے دوا دی تھی اور واقعی وہ کارگر ہوئی اور چار پانچ برس تک بالکل درد نہیں ہوا، لیکن اس کے بعد پھر سکندر نے درد محسوس کیا ہے، اب میرے پاس وہ دوا چند تولے رہ گئی تھی، اس سے کام نہیں چلتا تھا، تو میں نے چکھ چکھ کر اجزاء معلوم کئے اور یہ نسخہ لکھا۔

اس نابینا طبیب نے ارسطو کی پیشانی چوم لی کہ تو نے ساری دوائیں لکھ دیں ایک بھی تو نے نہیں چھوڑی، یہ تیرا کمال ہے کہ تو نے چکھ چکھ کر سارا نسخہ معلوم کر لیا، اس نے کہا میں نے وہ نسخہ بنایا، اور حسب سابق سکندر کو استعمال بھی کرایا فائدہ مکمل نہیں ہوا۔ اس نابینا طبیب نے کہا آپ دواؤں کی کاشت کس طرح سے کرتے ہو، اس نے کہا جیسے اور کھیت ہوتے ہیں، اسی طرح دوائیں بھی بوتے ہیں۔ اس نے کہا بس یہی غلطی ہوئی ہے۔

سمجھئے ہر دوا میں کسی نہ کسی سیارے کا اثر ہے جب اس سیارے کے طلوع کا وقت ہو اس وقت وہ دوا کاشت

کی جانی چاہئے یہ فنِ نجوم کا اصول ہے آپ نے موقع بموقع کاشت کی، ستاروں کے عمل کے مطابق نہیں کی، اس نے کہا جیسے چنے گیہوں بوتے ہیں اسی طرح دوائیں بھی بوئیں، اس نے کہا بس یہی فرق ہے۔

میں ہر دوا کو جس میں اس سیارے کا عمل ہے اس سیارے کے طلوع کے وقت اس کو بوتا ہوں تو کامل اثر ہوتا ہے، کسی دوا میں مشتری کا اثر ہے، کسی میں زُحل کا اثر ہے، کسی میں مریخ کا اثر ہے جس وقت جو سیارہ طلوع ہوتا ہے تو اس وقت میں تخم ریزی کرتا ہوں، گویا فنِ طب اور فنِ نجوم میں چولی اور دامن کا ساتھ ہے، جب تک فنِ نجوم سے واقف نہ ہو، اس دور میں طبیب ماہر نہیں سمجھا جاتا تھا، اور اب فن نجوم تو بجائے خود ہے طب ہی پوری طرح نہیں پڑھتے، اردو میں کتابیں آگئیں بس کچھ مطالعہ دیکھا طبیب بن گئے، اور سند لے لی، اسی واسطے نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ جو مرض آجاتا ہے، جانے کا نام نہیں لیتا، عمر بھر مرض بھی قائم دوا بھی قائم، غذا کی طرح دوا کھانی پڑتی ہے، اور عطاروں نے رہی سہی بھی کسر نکال دی۔

ہمارے ہاں ایک عطار طبیب تھے، نور الدین ان کا نام تھا، نورد بہرہ کے نام سے پکارے جاتے تھے، بہرے بھی تھے، مگر بے بہرہ نہیں تھے، لیکن چوں کہ بہرے تھے اس لیے ''نورد بہرہ'' کہا کرتے تھے، انہوں نے ایک بڑا بھاری مٹکا رکھا ہوا تھا اس میں پانی بھرا ہوا تھا، سونف کے اس میں کچھ دانے ڈالے ہوئے تھے، کوئی عرق مکوہ لینے آیا تو اس میں سے دے دیا، عرق گاؤزبان لینے آیا تو اس میں سے دے دیا، عرق سونف لینے آئے تو اس میں سے دے دیا، ساری دنیا کو وہی پانی دے کر نمٹا دیتے تھے، ایک موقع پر راز کھل گیا تو لوگوں نے کہا خدا کے بندے! یہ کیا کر رکھا ہے یہ تو بالکل ناجائز اور حرام ہے تو لوگوں کی جان کے درپے ہے، اس نے کہا بھئی! طبیب تو اصل اللہ میاں ہے پانی میں شفا تھوڑا ہی ہے، میں نے بھی اس کے نام پر چند دانے سونف کے ڈال دیئے ہیں کہ طبیب خود دیکھ لے گا، شفا دینے والا تو وہ ہے لوگ اپنے اعتقاد سے شفا پاتے ہیں، میرے پیسے بن جاتے ہیں، تمہارا اس میں کیا نقصان ہے؟ تو جب عطار ایسے رہ جائیں اور طبیب ایسے رہ جائیں تو پھر مریضوں کا ناس نہیں مارا جائے گا تو اور کیا ہوگا؟ کہاں تو یہ کہ فن نجوم سے واقفیت ہو، اور ان نجوم کے طلوع کے وقت کی مناسبت سے دواؤں کی کاشت ہو، اور کہاں یہ کہ دواؤں کی شناخت نہ ہو، بہت سے اناڑی طبیبوں کو دیکھا کہ عناب کی جگہ بیر اٹھا کے دے دیئے، اس لئے کہ شکل ایک ہی ہوتی ہے، اسی طرح آپ زعفران خریدنے جائیں گے تو اس کی جگہ بھٹوں کا ریشہ اٹھا کے دے دیتے ہیں، اب زعفران کی جگہ جب یہ ریشہ کھایا جائے گا تو کہاں سے فائدہ ہوگا اور شفا ہوگی، اور اچھے خاصے مریں گے، سیاہ مرچ لینے جاؤ تو پپیتہ کے بیج اس میں ملے ہوئے ہوں گے تو پپیتے کے بیج کھا کے سیاہ مرچ کا فائدہ تھوڑا ہی ہوگا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ طب تو رہی ہی نہیں تھی، اور اوپر سے یہ ملاوٹ بھی ہوگئی تو مریض بیچارے اچھے ہوں بھی تو کہاں سے؟ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹروں کی تعداد مریضوں سے زیادہ ہے اور جتنے ڈاکٹر بڑھتے جاتے ہیں اتنے ہی امراض بڑھتے جاتے ہیں، جتنے ہسپتال کھل رہے ہیں اتنی ہی بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، میں تو عرض کرر ہا تھا کہ امام ابو حنیفہؒ کے واقعات کے سلسلہ میں انبیاء علیہم السلام کا جتنا علم کامل ہوتا ہے، اتنی ہی عقل بھی کامل ہوتی ہے، اسی طرح جتنے اہل اللہ ہیں ان کی بھی اتنی ہی عقل کامل ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کامل گویا اس درجے کی ہے کہ اولین وآخرین میں ایسی عقل کسی کو نہیں دی گئی، بلکہ سارے اولین وآخرین کو جتنی عقل دی گئی ہے وہ تنہا ایک ذاتِ واحد جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے، اسی واسطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء علیہم السلام بنایا گیا، تو اس کامل عقل کے ہوتے ہوئے بھی کفار کہیں کہ آپ مجنون ہیں، یہ ان کے مجنون ہونے کی علامت ہے کہ ان کے اندر عقل نہیں ہے کہ آپ کی عقل کو پہچانتے تو قرآن قرآن کریم نے کفار کے اس قول کو رد کیا، اور اس ذیل میں میں نے کچھ تاریخی واقعات بیان کئے، کل تو اصولی بحث تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کامل ہے، دلیل کی رو سے اور فلاں دلیل کی وجہ سے اور آج اس کمالِ عقل کے آثار میں چند واقعات بیان کئے اور ایسے ہزاروں واقعات ہیں، تو حق تعالیٰ شانہ نے آپ سے جنون کی نفی کی کہ: ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ﴾ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کے ہوتے ہوئے آپ مجنون نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ خود مجنون ہیں، جس کو اتنا بڑا علم دیا گیا جس کو ایسی عظیم الشان تربیت دی گئی جس کو اتنا بڑا اصلاح عالم کا جذبہ دیا گیا جس کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا، کیا معاذ اللہ وہ مجنون ہوگا؟ مجنون بھی ایسی تربیت کرتے ہیں اور اس کے بعد ایک تیسری دلیل پیش فرمائی: ﴿وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ اور سب چیزوں کو چھوڑ دو، آپ کے اخلاقِ کریمانہ کو دیکھ لو، کیا مجنون ایسے اخلاق برتا کرتے ہیں؟ تو اخلاق کو ثابت کر کے آپ کے لئے خلقِ عظیم ثابت کیا، اب خلقِ عظیم کی بحث انشاء اللہ کل ہوگی۔

یہاں صرف یہ بحث تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنون سے بری ہیں، یہ لوگ جو ایسے دعوے کرتے ہیں وہ خود مجنون ہیں، اخلاق کا عظیم ہونا، جنون کی نفی کی دلیل ہے اس کا بیان انشاء اللہ کل ہوگا، اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عقلِ سلیم بھی دے، اور اخلاق صحیح بھی دے۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَهْدِنِیْ لِاَحْسَنِهَآ اِلَّآ اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنَّا سَیِّءَ الْاَخْلَاقِ لَایَصْرِفُ عَنَّا سَیِّئَهَا اِلَّآ اَنْتَ، اَنْتَ رَبُّنَا وَنَحْنُ عِبَادُکَ فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَ نَاوَسَنَدَ نَا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُفَاَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ○ وَلَاتُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ○ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ○مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍاَثِيْمٍ ○عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ○اَنْ كَانَ ذَامَالٍ وَّبَنِيْنَ ○ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ○ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ﴾

کمالِ اخلاق سے نفی جنون...... بزرگانِ محترم! حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے جنون کی نفی کرتے ہوئے جو دلائل ارشاد فرمائے ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ آپ کو اخلاق عظیم دیئے گئے ہیں، یعنی اخلاق کی جو انتہائی حد ہے کہ بشریت میں اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی، وہ آخری حد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی گئی آپ نے اخلاق کا وہ آخری حد کا نمونہ پیش فرمایا کہ عالم بشریت میں اس سے زیادہ نمونہ ممکن نہیں۔ تو اس سے دلیل پکڑتے ہوئے فرمایا: جس کے ایسے پاکیزہ اخلاق ہوں کہ دنیا کو مسخر کرلے، ان اخلاق کے ہوتے ہوئے کیا انہیں مجنون کہا جاسکتا ہے، کیا دنیا میں کبھی کسی مجنون نے بھی ایسے اخلاق پیش کیے، تو گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شان بیان فرمائی گئی۔ ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلق عظیم پر ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو خُلق عظیم عطا فرمائے ہیں خلق عظیم کے کیا معنی ہیں؟ خلق عظیم کسے کہتے ہیں؟

مراتبِ اخلاق اور آثارِ اخلاق...... یہ اس وقت تک صحیح سمجھ میں نہیں آئے گا، جب تک اخلاق کے مراتب بیان نہ کیے جائیں کہ اخلاق کے درجے کیا ہیں؟ اور ان میں سے وہ کون سا آخری درجہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا۔ دوسرے یہ کہ ان اخلاق کے آثار کیا ہیں؟ کہ ان اخلاقِ عظیمہ سے آپ سے کس قسم کے افعال سرزد ہوئے کہ جس سے دنیا آپ کے قدموں پر جھک گئی، اور دنیا میں عرب کا خطہ جو حد سے زیادہ سرکش تھا اور انہوں نے کسی کی اطاعت قبول نہیں کی، وہ بھی اگر پانی پانی ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

ہوئے، تو وہ کیا آثار ہیں جن کی بناء پر ایک قوم کی قوم مسخر ہوگئی، اور پھر اس قوم نے ان خلاق کو دنیا کی طرف پھیلایا تو پوری دنیا مسخر ہوگئی، اور اب صدیاں گذر گئیں، آج بھی کوئی ان اخلاق کا ذکر سنتا ہے تو وہیں گردن جھکا دیتا ہے تو مراتبِ اخلاق میں سے وہ کون سا آخری مرتبہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا۔ تو ہم نے جہاں تک غور کیا، اور ہمارا غور ہی کیا، بہرحال اساتذہ کرام اور شیوخ کی دی ہوئی روشنی میں جہاں تک دیکھا اور غور کیا تو اس میں اخلاق کے تین مرتبے محسوس ہوئے۔

اخلاقِ حسن …… پہلے درجہ کا نام اخلاقِ حسنہ ہے، حسنِ اخلاق یعنی اچھے اخلاق سے دنیا سے پیش آؤ، دوسرا درجہ اخلاقِ کریمہ کا ہے، کہ کریم النفس بنو، کریم الاخلاق بنو، اپنے اندر کریمانہ اخلاق پیدا کرو، اور تیسرا مرتبہ اخلاقِ عظیمہ کا ہے کہ برتر اور سب سے جو اونچے اخلاق ہیں ان کو دنیا کے سامنے پیش کرو، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: ''بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ'' ① میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ دنیا کے سامنے اخلاق اعلیٰ کے نمونے پیش کروں، آپ نے اپنے مبعوث ہونے کی دو غرضیں ظاہر فرمائیں، ایک فرمایا: ''اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا'' ② میں دنیا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ، اعمال صالحہ، احوالِ صادقہ اور آخرۃ حسنہ کی تعلیم پیش کردی۔ تو پہلا درجہ اخلاقِ حسنہ کا ہے، جسے حُسن اخلاق کہتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''يَا خَلِيْلِيْ حَسِّنْ خُلُقَكَ وَلَوْ مَعَ الْكُفَّارِ'' ③ اے میرے خلیل! اخلاق حسنہ سے پیش آؤ، چاہے کفار ہی تمہارے سامنے پیش آئیں، اس وقت بھی اخلاق کو مت چھوڑو، پاکیزہ اخلاق کے ساتھ ان سے بات چیت کرو اور معاملہ کرو، اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ اخلاق کا ایک درجہ ''خلق حسن'' ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور ان کی تفصیل کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کو اخلاقِ حسنہ کی تربیت دی، یعنی یہود بنی اسرائیل کو اخلاقِ حسنہ پر تربیت دی، جو اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے۔ حسنِ اخلاق کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی ہیں: اَلْوَفَاءُ بِالْعَدْلِ یعنی حقوق کے اندر دوسرے کو پورا پورا حق دو جو اس کا حق ہے، اپنا بھی پورا پورا حق لو جو تمہارا حق ہے، اس میں نہ کمی کرو نہ بیشی کرو، بھلائی ہو یا برائی ہو، حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھو، کہ دوسرے کا ایک رتی بھی حق مارا نہ جائے اور تم بھی بے شک ایک رتی بھی اپنا حق نہ چھوڑو، مثلاً اگر کوئی شخص تمہیں ایک پیسہ بھر نفع پہنچائے تو تمہارا فرض ہے کہ ایک پیسہ بھر تم بھی نفع پہنچا دو اگر تم نے اس ایک پیسے میں کمی کی تو یہ بداخلاقی ہوگی، پورے پورے اخلاق سے پیش آؤ۔

اسی طرح سے برائی کے اندر اگر کسی شخص نے تمہارے ساتھ برائی کی تو اس درجے کی برائی تم بھی اس کے

---

① السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب بيان مكارم الاخلاق ومعاليها ج: ١٠ ص: ١٩٢.

② السنن لابن ماجه، المقدمة، فضل العلماء والحث على طلب العلم ج: ١ ص: ٢٦٥.

③ المعجم الاوسط للطبراني، باب الميم، من اسمه: محمد ج: ١٤ ص: ٢٧٢ رقم: ١١١٥.

ساتھ کر سکتے ہو، تا کہ دوسرے کو معلوم ہو کہ بداخلاقی سے پیش آنا کیا نتیجہ رکھتا ہے، دوسرے کو بداخلاقی سے تکلیف پہنچانا جب کہ اتنی ہی تکلیف اسے پہنچائی جائے گی تو وہ سمجھے گا کہ میں نے کیا تکلیف پہنچائی تھی، اور اگر آپ نے تکلیف نہ پہنچائی وہ یہ سمجھے گا کہ جو بھی کسی کے ساتھ کچھ کرلو، اس کا ثمرہ تو کچھ نکلتا نہیں اس واسطے بداخلاقی سے پیش آتے رہو، نیکی ہو یا بدی، بھلائی یا برائی مگر حقوق کی رعایت رکھو نہ لینے میں کمی کرو نہ دینے میں کمی کرو، اسی واسطے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اگر کوئی ذرہ برابر برائی سے پیش آئے تو تم پر واجب ہے کہ اتنی ہی ذرہ برابر برائی سے پیش آؤ، شریعت موسوی میں معاف کرنا جائز نہیں تھا، شریعت موسوی جلال کی شریعت تھی اور سخت شریعت تھی، بدلہ لینا اور بدلہ دینا یہ واجب تھا، برائی کے اندر معاف کرنا یہ جائز نہیں تھا، بلکہ انتقام لینا واجب تھا، چنانچہ قرآن کریم میں تورات کی تعلیم بیان فرمائی گئی۔

﴿وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَ نْفَ بِالْاَ نْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ ہم نے بنی اسرائیل پر واجب کر دیا تھا اور ان کے اوپر لکھ دیا تھا کہ اگر کوئی نفس کو قتل کرے تو فرض ہے کہ تم بھی قتل کرو، معاف کرنا جائز نہیں، اگر کوئی تمہاری آنکھ پھوڑ دے تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی اس کی آنکھ پھوڑ و، عفو و درگزر ہرگز جائز نہیں، انتقام ضروری ہے، اگر کوئی تمہاری ناک کاٹ دے تمہارا فرض ہے تم بھی اس کی ناک کاٹ دو کوئی تمہارا کان پھوڑ دے تمہارا فرض ہے تم بھی اس کا کان پھوڑ دو، کوئی دانت توڑے تم پر واجب ہے کہ تم بھی اس کے دانت توڑ دو، اور اگر کوئی زخم لگائے تو اتنا ہی بڑا زخم تم بھی لگاؤ، شریعت موسوی کے اندر یہ جائز نہیں تھا کہ درگزر کر و یا معافی دو، بلکہ واجب تھا کہ انتقام لیا جائے، تو یہ خلقِ حسن ہے کہ اپنے حق میں کمی نہ کرو، دوسرے کے حق میں بھی کمی نہ کرو، کوئی بھلائی کرے تو تم پر واجب ہے کہ تم بھی بھلائی کرو اور اتنی ہی کرو، اس سے کم کی تو بداخلاقی شمار ہوگی، یا بدلے میں کچھ زیادہ بدلہ لے لیا تو یہ بداخلاقی ہوگی۔ اگر کسی نے تھپڑ مارا تمہارا فرض ہے تم بھی تھپڑ مارو، اگر تم نے مکا مار دیا تو یہ بداخلاقی ہوگی، دنیا کہے گی بڑی زیادتی ہوئی اس نے ایک تھپڑ مارا، تھا اس نے مکا مار دیا، ایک شخص نے لاٹھی ماری، تمہارا فرض ہے کہ تم بھی لاٹھی مارو، اگر تلوار اٹھائی تو یہ بداخلاقی ہوگی اور حدود سے گزرنا ہوگا ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ [1] کوئی تمہارے اوپر زیادتی کرے تو تمہارا فرض ہے کہ تم بھی اتنی ہی زیادتی اس پر کرو، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تعلیم تھی اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایسی سخت اور تند خو قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جس کی جبلّت کے اندر سختی اور تشدد گھسا ہوا تھا، تو انہیں اگر نرمی کی تعلیم دی جاتی تو وہ دین پر نہ آتے، وہ سمجھتے کہ یہ دین تو بزدلی کا دین ہے، اس لئے واجب قرار دیا گیا کہ بدلہ پورا پورا لو، اور تمہارے لئے معاف کرنا جائز نہیں بہر حال یہ خلق حسن ہے اس کے معنی وفا بالعدل کے ہوں گے کہ اپنا بھی پورا پورا حق لو اور پورا پورا دوسرے کو بھی حق دو، اگر اس میں کمی زیادتی کی تو یہ خلق

[1] پارہ: ۲، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۱۹۴.

حسن کے خلاف ہوگا، غرض اخلاق حسنہ کے اندر عدل اور اعتدال پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ① اللہ تعالیٰ نے اپنا کلمہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا کر دیا کہ انہیں کمالِ عدل کی تعلیم دی اور انصاف پسندی کی تعلیم دی، یہ اخلاق کا ابتدائی درجہ ہے جسے خلقِ حسن کہتے ہیں۔

خلقِ کریم...... اس سے آگے دوسرا درجہ خلقِ کریم کا ہے جس کے معنی ایثار کے ہیں کہ دوسرے کا حق پورا پورا دو، اور اپنا حق چھوڑ دو، اس میں ایثار اور قربانی کرو، ایک شخص نے تمہارے تھپڑ مارا ہے تمہیں حق تھا کہ تم بھی تھپڑ مارو، مگر ایثار کا تقاضا ہے کہ تم مت مارو، بلکہ معاف کرو اور درگزر کرو، یہ پہلے مرتبہ سے اونچا مرتبہ ہے، وہاں بدلہ لینا واجب تھا، یہاں معاف کرنا واجب ہے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت ہے، ان کے یہاں ایثار کی تعلیم دی گئی ہے، انجیل کا ایک اصول ہے کہ اگر تمہارے کوئی بائیں گال پر تھپڑ مارے تو تم دایاں بھی سامنے کر دو کہ بھئی! ایک اور مار تا چل خدا تیرا بھلا کرے، میں تو بدلہ نہیں لوں گا، باقی تو یہ بُری حرکت کر رہا ہے یہ تیرے لئے ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾ ② فرمایا: دوسرے کی برائی کو اپنی بھلائی سے دفع کرو، تمہاری بھلائی کا نتیجہ یہ ہوگا اگر باہم عداوت بھی ہوگی تو دوسرا فریق عداوت کو چھوڑ دے گا کہ میں برائی کر رہا ہوں، اور یہ شخص میرے ساتھ بھلائی کر رہا ہے، اس نے اپنا حق (بدلے کا) چھوڑ دیا، اسے حق تھا کہ یہ بھی اتنا ہی بدلہ لیتا، مگر اس نے بدلہ نہیں لیا، درگزر کیا اور معاف کر دیا، غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں معاف کرنا واجب تھا، انتقام لینا جائز نہیں تھا، اور یہ بالکل شریعتِ موسوی کے برعکس ہے، وہاں انتقام واجب تھا یہاں معاف کرنا واجب ہے، وہاں معاف کرنا جائز نہیں تھا، یہاں انتقام لینا جائز نہیں ہے، بلکہ اپنے حق کو ترجیح نہ دینا اور اپنے کو گرا دینا، اس سے یہ ہوتا ہے کہ عداوتیں ختم ہو جاتی ہیں، بدلہ لینے میں بے شک یہ ضرور ہوگا کہ عام لوگ یہ کہیں گے کہ بھائی بدلہ لے لیا، اس کا حق تھا لیکن قدرتی اثر یہ ہے کہ دلوں کے اندر اس سے لوچ نہیں پیدا ہوگا، دلوں میں نرمی نہیں آئے گی، بلکہ اگر قلوب ایسے ہیں کہ حدود پر نظر نہیں ہے تو عداوت اور زیادہ بڑھ جائے گی، مگر بہر حال خلقِ کریم خلقِ حسن سے اونچا مقام ہے جس کا معنی ہیں کہ اپنا حق چھوڑ دو اور ایثار دکھلاؤ تو اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تعلیم دی کہ ایثار پیشہ بنو، اپنے حقوق کی رعایت مت کرو، ہمیشہ دوسرے کے حق کو سامنے رکھو۔

خلقِ عظیم...... تیسرا درجہ خلقِ عظیم کا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دوسرا جب برائی کرے تو نہ صرف یہ کہ انتقام نہ لو، نہ صرف یہ کہ معاف کر دو، بلکہ اس کے اوپر الٹا احسان کرو کہ وہ برائیاں کرے تم احسان کرو جیسا کہ حدیث شریف میں آپ نے فرمایا: ''صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَاَحْسِنْ اِلٰى مَنْ اَسَاءَ اِلَيْكَ'' ''جو تم سے قطع تعلق کرنا چاہے تم اس سے جوڑ لگاؤ، جو تم پر ظلم کرے تم معافی اور درگذر کی صورت اختیار کرو اور جو تم سے برائی کرے تم اس

① پارہ: ۹، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۱۳۷۔ ② سورۃ فصلت: ۳۴۔

کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ‘‘ تو ایک درجہ انتقام کا ہے ایک درجہ ایثار کا ہے، مگر ایک درجہ احسان کا ہے کہ دوسرا برائی کرے تو تم اس کے ساتھ بھلائی کرو، یہ بہت ہی اعلیٰ مرتبہ ہے چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ﴾ ① ’’یہ وہی کر سکتا ہے جو صابر ہو، جو صبر اور ضبط سے کام لے، آپے سے باہر نکل جانے کی خُو نہ ہو‘‘، دوسرے نے گالی دی، آپے سے باہر نہیں نکلا، اسے دعائیں دینی شروع کیں، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق تھا، کہ دوسرے گالیاں دے کر رہے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ یہ کہ صرف معاف فرما رہے ہیں بلکہ ان کے لئے ہدایت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ غزوہ احد کے اندر آپ کے بہت ہی چہیتے اور پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، شہید کرنے کے بعد غیظ وغضب کے اظہار کے لئے کفار نے ان کی ناک کاٹ لی، کان کاٹ دیئے، ان کی ہیبت کو بے ہیبت بنایا، پھر ہندہ شقیہ نے ان کا جگر کاٹ کر نکالا اور غیظ وغضب میں اس کو چبایا اور خون پیا، گویا اس قدر غیظ کا اظہار کیا، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکے گئے، سر مبارک پر چوٹ آئی، خون سر سے بہہ کر منہ پر آیا، دندانِ مبارک شہید ہو گئے، ایسی حالتوں کو دیکھ کر صحابہؓ بے چین ہوئے اور عرض کیا۔ یارسول اللہ! ان کفار کے حق میں بددعا فرمایئے، اس درجہ یہ حدود سے گذر گئے کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ یہ برتاؤ کہ پتھروں سے الگ مارا، خون الگ بہایا، چہیتے چچا کو الگ شہید کیا، اب کون سا موقعہ باقی ہے جو آپ بددعا نہ فرمائیں، اس لئے بددعا فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’اِنِّىْ بُعِثْتُ رَحْمَةً وَّلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا‘‘ ② ’’میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں ہدایتیں دینے کے لئے آیا ہوں بددعائیں دینے کے لئے نہیں آیا‘‘ اور فرمایا: ’’اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِىْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ‘‘ ③ اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، یہ جاہل ہے، نبی کے رتبہ کو نہیں پہچانتے اس لئے جاہلانہ حرکتیں کر رہے ہیں، تو ان کے حق میں دعائیں دینا شروع کیں، یہی وہ مقام ہے جس کو قرآن کریم میں آپ کی شان کے بارے میں فرمایا ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ ④

فرماتے ہیں اے پیغمبر! اللہ نے جو رحمت تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے، تمہیں رحمۃ للعالمین بنایا ہے اس کی وجہ سے تمہارا دل نرم ہے، پگھل جاتے ہو، دوسرے کی مصیبت نہیں دیکھی جاتی، اگر سخت دل ہوتے غیظ القلب ہوتے یہ سب لوگ اردگرد سے اٹھ کر بھاگ جاتے، آپ کے اخلاق نے انہیں مسخر کر رکھا ہے، آپ کے اخلاق کی کشش نے انہیں آپ کی ذات سے جوڑ رکھا ہے، کہ یہ جاہلانہ حرکتیں کرتے ہیں اور آپ پھر بھی دعائیں

---

① سورۃ فصلت: ۳۵. ② الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والاداب، باب النهى عن لعن الدواب وغيرها ج:۱۲ ص:۳۹۴ رقم:۴۷۰۴. ③ شعب الايمان للبيهقي، فصل فى حدب النبى صلى الله عليه وسلم على امته ورأفته ج:۳ ص:۳۸۴ رقم:۱۴۲۸. ④ پاره:۹، سورة: آل عمران، الآية: ۱۵۹.

دیتے ہیں، یہ اس رحمت کا اثر ہے جو ہم نے آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھر رکھی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا فرض ہونا چاہئے، پہلا فرض یہ ہے کہ آپ معاف کریں یعنی دوسرے جاہلانہ حرکتیں کریں، سختیاں کریں، گالم گلوچ کریں، اور کیا کچھ نہیں کیا، ساحر آپ کو کہا، کذاب آپ کو کہا، مجنون آپ کو کہا، اشرّ آپ کو کہا، پتھر آپ کو مارے گئے، سحر آپ پر کرایا گیا، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، نماز پڑھتے ہوئے اونٹ کا اوجھ آپ پر ڈال دیا گیا، تو کون سی حرکت ہے جو نہیں کی، تو کیا کچھ نہیں کیا، مگر اس کے باوجود یہ نہیں فرمایا: "فَانْتَقِمْ مِنْهُمْ" "آپ ان سے بدلہ لیں" بلکہ ابتدائی درجہ یہ فرمایا فَاعْفُ عَنْهُمْ آپ ان کو معاف فرمادیں، ان جاہلوں کی باتوں کا کوئی خیال نہ کریں، اور ایک موقع پر فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ o فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ oوَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ﴾ اے پیغمبر! ہم جانتے ہیں کہ ان کی بے ہودہ حرکتوں سے آپ کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہے، گھٹن آتی ہے، مگر آپ کی شان بہت بلند ہے، آپ اپنے پروردگار کی تسبیح و تقدیس میں لگیے، کافروں کی بات کا خیال نہ کیجئے رکوع و سجود اور عبادت میں لگیے، ان کی بے ہودگیوں کی طرف دھیان بھی مت دیجئے اور یہی نہیں کہ یہ کام اسی وقت کیجئے، عبادت کرتے رہئے، یہاں تک کہ موت کا وقت آپہنچے مسلسل اس پر آپ قائم رہیے، تو یہ وہ خلق عظیم ہے کہ دوسرے برائی کریں اور آپ نہ صرف یہ کہ انتقام نہ لیں نہ صرف یہ کہ آپ معاف کردیں بلکہ انہیں دعائیں دیں ان کے ساتھ خوش خلقی کا معاملہ کریں، ابتداء یہاں سے فرمائی گئی کہ آپ انہیں معاف کردیں، آپ معافی کی خُو ڈالیں، آپ کے اندر انتقامی جذبات نہ ہوں اور یہ بھی آپ کے رتبہ سے کم ہے، ایک درجہ اور اوپر بڑھیئے آپ سے جو زیادتی کرتے ہیں ان کے لئے مغفرت کی دعائیں بھی کیجئے، اب ظاہر بات ہے کہ ایک شخص تو گالیاں دے رہا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں دے رہے ہیں، وہ بے ہودگیاں کررہا ہے آپ اس کے لئے مغفرت کی دعائیں کررہے ہیں، اس کے بعد فرمایا کہ یہ بھی کم درجہ ہے، آپ ایک درجہ اور اس سے آگے بڑھیں، انہی لوگوں کو بلاکر کبھی کبھی مشورہ بھی کرلیا کیجئے، تاکہ وہ یہ سمجھیں کہ ہمیں اپنا جانتے ہیں، تو وہ لوگ غیروں کو غیر بنانے کی کوشش کررہے ہیں اور آپ اپنوں کی اپنائیت پر آرہے ہیں، آپ انہیں بلاتے ہیں۔

مشاہد و آثار کی عظمت...... سردارانِ قریش جو گالیاں دینے میں کسر نہیں چھوڑتے تھے، اور آپ کی قتل و غارت کی فکر میں تھے، لیکن چند قریش کے سردار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے اپنی ردا مبارک اتاردی، اور اس پر ان لوگوں کو بٹھایا مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی ردا مبارک بچھا کر ان کو اس پر بٹھایا، یہ چادر مبارک ہمارے عقیدے کے لحاظ سے عرش و کرسی سے بھی بہتر ہے، اس واسطے کہ عرش و کرسی حق تعالیٰ کا مکان نہیں ہے، حق تعالیٰ شانہ اس پر بیٹھے ہوئے نہیں ہیں، وہ تو جسم سے بری ہیں، اور چادر مبارک وہ ہے جو جسم مبارک سے لگی ہوتی ہے تو اس میں جو برکات کے آثار ہیں، وہ دوسری چیز میں نہیں ہوسکتے۔ اسی واسطے اسلام میں مشاہد

اور آثار کی عظمت کی گئی ہے، کہ انبیاء علیہم السلام کے بدنِ مبارک سے کوئی چیز لگی ہوئی ہو اس کی عظمت اور توقیر کرو، اس واسطے کہ بدن مبارک سے لگی ہوئی چیز آثار اور برکت سے محروم نہیں رہ سکتی۔ اور اس سے علماء نے اخذ کیا ہے کہ اہل اللہ کے بدن سے چھوتی ہوئی چیزوں سے برکت حاصل کرو، لوگ بزرگوں سے کہتے ہیں کہ ہمیں اپنا پہنا ہوا کپڑا دے دیں، اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس بدن میں جو عبادت کی جا رہی ہے اس کو جو کپڑا لگے گا اس میں بھی اس عبادت کی برکت کے آثار آئیں گے، نبی زمین کے جس حصے پر بیٹھ گئے ہیں، اس میں بھی برکت کے آثار پیدا ہوں گے، اہل اللہ کے اندر اثار ہیں ان چیزوں پر آثار آ جاتے ہیں جہاں ان کے بدن لگتے ہیں، اس واسطے کہ اصل چیز ان حضرات کی روح ہے، جو اصل برکتوں کا خزانہ ہے چونکہ یہ روح اس بدن میں گذارہ کر رہی ہے، تو اس بدن میں بھی برکت کے آثار ہوں گے، اس بدن کو کپڑا لگ گیا تو اس میں بھی برکت کے آثار ہوں گے، وہ کپڑا کسی بدن کو لگ جائے گا تو اس میں برکت کے آثار پیدا ہو جائیں گے، تو اثر در اثر پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

وجوہِ عظمت...... آپ آج بیت اللہ کی تعظیم کرتے ہیں، تو بیت اللہ کوئی شاندار عمارت نہیں، آپ کے ہاں بمبئی میں کروڑوں روپوں کی عمارتیں ہیں، بیت اللہ تو سیاہ پتھروں کا ایک کوٹھ بنا ہوا ہے، پھر اس کی عظمت کیوں ہے؟ اس لئے کہ تجلیات ربانی اس کے اندر سمائی ہوئی ہیں، انوارِ خداوندی اس میں آئے ہوئے ہیں، ان انوار کے اثرات سے وہ پتھر بھی متبرک بن گئے کہ کروڑوں روپوں کی عمارتیں چاہے یاقوت اور جواہرات سے بنادی جائیں، ان میں وہ برکت کا اثر نہیں جو ان کالے پتھروں میں ہے، اس لئے کہ تجلیات ربانی نے ان کو اپنا مورد بنا رکھا ہے، ان پر تجلیات وارد ہوتی ہیں، تو ان میں برکت آ گئی اس لئے آپ بیت اللہ کے پتھروں کو چومتے ہیں، برکت حاصل کرتے ہیں، نیز بیت اللہ کو جو غلاف چُھو جاتا ہے، اس کی تعظیم کرتے ہیں، ہزاروں روپوں میں ملے تو اس کا ٹکڑا خرید کر لاتے ہیں، لوگ وصیت کرتے ہیں کہ میرے کفن میں رکھ دیا جائے، کوئی وصیت کرتا ہے کہ میری آنکھوں پر رکھ دیا جائے، نیز غلاف شریف کا کوئی ٹکڑا آ جاتا ہے تو لوگ سر پر رکھتے ہیں آنکھوں پر لگاتے ہیں حالانکہ سب خود ہی تو اس کو بیٹھ کر بنا رہے ہیں، ہم ہی نے تو اس کو بُنا تھا، اور آج اُسے ہم سر پر رکھ رہے ہیں، اس لئے کہ جب ہم اسے بُن رہے تھے، وہ ہماری چیز تھی، جب بیت اللہ پر ٹانگ دی، اب اس میں وہ اثرات آ گئے، جو تجلیات خداوندی کے تھے، اس لئے وہ مبارک اور متبرک بن گئی، تو ہم آنکھوں پر لگاتے ہیں، سر پر لگاتے ہیں۔ بلکہ جو حاجی حج کرنے جاتا ہے اور وہ اس غلاف اور بیت اللہ کو چُھو کر آتا ہے لوگ اس سے توقیر سے مصافحہ کرتے ہیں کہ یہ ہاتھ غلاف شریف سے لگے ہوئے ہیں، ان ہاتھوں کو چوم لیں، غرض آثار واسطہ در واسطہ ہو ہو کر چلے آتے ہیں۔

حدیثِ مسلسل بالمصافحہ سے استدلال...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اپنی جگہ ہے، اگر آپ سے کسی نے مصافحہ کر لیا، ہم سمجھتے ہیں کہ اس ہاتھ کو چھونا دارین کی سعادت ہے، اور اس ہاتھ کو جس ہاتھ نے چھوا اس کو ہم سعادت مند سمجھتے ہیں اور یہ کہ اس سے سعادت حاصل کرو، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

''صَافَحْتُ بِكَفِّيْ هٰذِهٖ كَفَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ'' میں نے اپنی اس ہتھیلی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ہتھیلی سے مصافحہ کیا ہے، اور میری ہتھیلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر رکھی گئی، تو آپ کے تابعی شاگرد کہتے ہیں کہ میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ دیجئے اور مجھ سے بھی مصافحہ کیجئے۔ اس کے بعد اس تابعی نے اپنے شاگرد کو حدیث سنائی تو اس نے کہا میں آپ کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھتا ہوں آپ اپنی ہتھیلی میری ہتھیلی پر رکھ دیجئے، اور آگے شاگردوں کا سلسلہ اسی طرح چل رہا ہے یہاں تک یہ حدیث مسلسل بالمصافحہ کے نام سے آج تک محدثینِ کرام میں چلی آ رہی ہے۔

سندِ عالی کی فضیلت و برکات...... حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ ہمارے اساتذہ اور اکابر میں سے ہیں، حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء میں سے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا فیض، ان کا علم بلکہ مدرسہ مظاہر العلوم (سہارن پور انڈیا) انہی کی برکات کا خزانہ ہے، اور خزانہ ماشاء اللہ چل رہا ہے، جب میں نے اپنے استاذ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری صاحبؒ سے حدیث پڑھ لی، تو اتفاق سے میرٹھ کا ایک سفر پیش آیا جس میں سہارن پور کے بزرگوں کو بھی اور دیوبند کے اکابر کو ایک تقریب میں مدعو کیا گیا تھا، تو سہارن پور سے ان بزرگوں کے ساتھ ہم دیوبند والے بھی اسی گاڑی میں سوار ہوئے، اس میں میں بھی ساتھ تھا، تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمہ اللہ علیہ سے مصافحہ ہوا۔

حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: آپ حدیث پڑھ چکے ہو، اس وقت پوری جماعت میں میری سند سب سے زیادہ عالی ہے، میری احادیث کم واسطوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی ہوئی ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے حدیث کی اجازت دوں، تاکہ تیری سند بھی عالی ہو جائے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کے لئے آپ کو سہارن پور آنا پڑے گا۔ میں نے کہا، حضرت میں اس کے لئے حاضر ہوں گا، انشاء اللہ دل میں تو یہ بات رہی مگر لڑکپن کا زمانہ تھا، بھول بھال گیا اور ایک برس گذر گیا اتفاق سے پھر حضرت سے سفر کا ساتھ ہوا، فرمایا: آپ حدیث کی اجازت لینے آئے نہیں؟ میں شرمندہ ہوا، میں نے عرض کیا حضرت میں حاضر ہوں گا۔ اس کے بعد پھر بھول بھال گیا، اور ایک برس پھر گذر گیا، اس کے بعد پھر ایک سفر میں ساتھ ہوا، تو پھر حضرت نے یاد دلایا کہ آپ اب تک نہیں آئے پھر یہ چیز نہیں ملے گی۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ حضرت سہارن پوری ہجرت کے ارادہ سے مدینہ منورہ جا رہے ہیں، اب مجھے فکر ہوئی، کہ اب اجازت حدیث لے لینی چاہئے، ورنہ اس سعادت سے محرومی ہو جائے گی تو میں پہلی گاڑی سے سہارن پور پہنچ گیا بہت خوش ہوئے ویسے بھی اپنے بزرگ تھے نیز عزیز داری اور رشتہ داری بھی تھی، رشتہ میں میرے تایا ہوتے تھے، بہرحال بڑی شفقت سے پیش آئے اور مولانا زکریا رحمہ اللہ صاحب شیخ الحدیث مدظلہٗ کو فرمایا کہ مظاہر العلوم کے کتب خانے میں حدیث کی جتنی کتابیں رکھی ہیں سب اٹھوا لو، چنانچہ ساری منگوائیں بعض کتابوں کی اول حدیث خود پڑھی اور بعض کی مجھ سے پڑھوائیں اور اس میں حدیث کی اجازت دی اور یہ فرمایا کہ: اس وقت عام طور سے حدیث کی جو سند ہے وہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچی ہے۔

یعنی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہ حضرت شاہ عبدالغنی کے شاگرد ہیں اور شاہ عبدالغنی مولانا اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، اس طرح ان بزرگوں اور شاہ اسحاق صاحبؒ کے درمیان ایک واسطہ ہے، اور میری حدیث کی سند یہ تھی کہ میں نے حضرت انور شاہ صاحبؒ سے حدیث حاصل کی، انہوں نے حضرت مولانا شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث حاصل کی، حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے حدیث پڑھی، حضرت مولانا قاسم صاحبؒ نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے پڑھی اور شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے شاہ اسحاق صاحب سے حدیث پڑھی تو شاہ اسحاق صاحب اور ہم تک بیچ میں چار واسطے ہیں، اور چار واسطوں سے گذر کر گویا ہم شاہ اسحاق صاحب تک پہنچتے ہیں، اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ انہوں نے حدیث کی اجازت مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، انہوں نے حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ سے حدیث حاصل کی، تو چونکہ ایک واسطہ بیچ میں رہ جاتا ہے، تو سند بہت زیادہ بلند ہو جاتی ہے، اس سند سے حضرت سہارن پوریؒ نے مجھے تمام احادیث کی اجازت دی۔ اس کے بعد مسلسلات کی کتاب منگوائی، یعنی وہ احادیث جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً مسلسل چلی آ رہی ہیں، اس میں دو حدیثوں کی عملاً اجازت دی، ایک حدیث مسلسل بالمصافحہ یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ اوپر سے ہر شاگرد مصافحہ کرتا ہوا چلا آ رہا ہے، تو حضرت سہارنپوریؒ نے حدیث سنا کر مجھ سے مصافحہ کیا کہ میں نے اس ہتھیلی سے مصافحہ کیا مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانویؒ سے اور انہوں نے اپنی ہتھیلی سے حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ سے مصافحہ کیا اور انہوں نے اپنی ہتھیلی سے مصافحہ کیا، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے مصافحہ کیا حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مصافحہ کیا شیخ ابو طاہر مدنی سے اور انہوں نے اپنے استاذ سے، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہنچ گئی تو صرف حدیث کی سند نہیں پہنچی بلکہ مصافحہ کی سند بھی پہنچی۔

حدیث مسلسل بالماء والتمر سے استدلال ...... اسی طرح سے حدیث مسلسل بالماء والتمر کی اجازت دی، وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی مہمان نوازی اور ضیافت کی، اس طرح سے کہ کھجور کھا کے بقیہ بچی ہوئی کھجور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کھلائی، اور پانی پی کر بچا ہوا پانی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پلایا، پھر فضیلت بیان کی کہ جو پانی اور کھجور کی دعوت کرے اس کے لئے یہ مراتب اور درجات ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی طرح اپنے شاگرد کو کھجور کھلا کر اور پانی پلا کر فضیلت بیان فرمائی، انہوں نے اپنے شاگرد کو اور آگے سلسلہ در سلسلہ یہاں تک کہ سند حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ تک پہنچ گئی، انہوں نے اسی طرح مجھے کھجور کھلا کر اور زمزم کا پانی منگوا کر پی کر پلایا اور فرمایا: میں تجھے اس حدیث کی بیان کرنے کی اجازت دیتا ہوں اور اس عمل کو مسلسل چلانے کی۔ تو یہ کیا چیز تھی؟ ایک بدن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک کو مس کیا تھا، یعنی حضرت انس رضی اللہ

عنہ کی ہتھیلی نے ،اور وہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھا تو فرمایا کہ: میں نے ریشم میں وہ ملایمت نہیں دیکھی اور کسی چیز میں نہیں دیکھی ، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی مبارک میں تھی ، ریشم سے بھی زیادہ صاف ملائم ستھری اور چکنی تھی ،اور اس کے بعد اپنے شاگرد سے مصافحہ کیا ،تو جو برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی کی حضرت انسؓ کی ہتھیلی میں آئی تھی ، وہ برکت ان کے شاگرد میں پہنچی ،ان کے شاگرد سے وہ برکت ان کے شاگرد میں پہنچی ،ان کے شاگرد سے ان کے شاگرد میں یہاں تک کہ وہ ہم تک پہنچ گئی ۔تو یہ آثار کو کیوں محفوظ رکھتے ہیں ، کہ جسم سے جسم مل جائے تو روحانیت کے آثار آتے ہیں ،تو بیت اللہ کے اندر جو تجلیات ربانی ہیں وہ پتھروں میں آئیں ۔اور پتھروں سے غلاف میں آئیں ،اور غلاف سے غلاف چھونے والوں میں آئیں ، یقیناً وہ متبرک ہیں اور وہ برکات ان میں آئی ہیں چاہے انہیں احساس ہو یا نہ ہو ،شعور ہو یا نہ ہو ،مگر وہ برکات میں متبرک ہو چکے ہیں ،وہ برکات یقیناً ان کے اندر راسخ ہو گئی ہیں ، جنہوں نے غلاف شریف کو عقیدت ومحبت سے چھوا ہے ، یقیناً وہ آثار سے متاثر ہیں اور وہ بلا شبہ اس قابل ہیں کہ اگر ان کا ہاتھ اس نیت سے چوما جائے تو بے شک برکت پیدا ہو گی ، الغرض اس طرح علماء اسلام نے برکات وآثار کی حفاظت کی ہے ۔بہر حال میں اس پر عرض کر رہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار خیر وبرکت وہ صحابہؓ میں آئے ،صحابہؓ سے تابعین میں آئے ،تابعین سے تبع تابعین میں آئے ،سلسلہ بسلسلہ ہوتے ہوئے وہ عالم میں اور اس عالم سے جو متعلق ہیں ،ان لوگوں میں پہنچے اس طرح سے پوری امت کے اندر آثار خیر وبرکت پھیلے ہوئے ہیں ۔

خُلق عظیم کے آثار......تو خلق عظیم کے معنی یہ نکلے کہ اعلیٰ ترین اخلاق کی حدود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائیں ،اور اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ ایثار سے بھی اونچا درجہ احسان کا ہے کہ جو شخص تمہارے ساتھ برائی کرے تم اس کے ساتھ بھلائی کرو ،کوئی ظالم ہے تو تم اس کو دعا دو ۔ظاہر بات ہے کہ اس خلق کے استعمال کے بعد لڑائی جھگڑا نہیں پیدا ہو سکتا ،کوئی بہت ہی نا ہنجار ہو گا اور بہت بد طینت ہو گا کہ اس کے بعد بھی لڑائی پر آمادہ ہو وہ گالیاں دے رہا ہے آپ بھائی صاحب کہہ رہے ہیں اگر وہ واقعی بھیڑیا نہیں ہے انسان ہے تو یقیناً اس کے قلب میں نرمی پیدا ہو گی کہ میں تو گالیاں دے رہا ہوں اور یہ مجھے بھائی صاحب کہہ رہے ہیں اور دعائیں دے رہے ہیں تو جھگڑے قطع ہو جائیں گے جھگڑا ہمیشہ اس سے ہوتا ہے کہ جب آدمی انتقامی جذبات سے دوسرے کے مدمقابل آئے وہ ایک گالی دے تو یہ دو گالیاں دے اور وہ دو دے تو یہ تین دے ،تو گالی مٹتی نہیں بلکہ ڈبل ہو جاتی ہے ،لیکن اگر گالی کا جواب گالی سے نہ دیا جائے بلکہ دعا سے دیا جائے تو اس کی گالی مٹ گئی ،اور دعاء کی برکت سے تم بھی صحیح ہو گئے ،وہ بھی صحیح ہو گئے ۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا خلق عظیم پر عمل اور اس کے آثار......امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے واقعات میں ہے کہ کسی نے برسرِ بازار ان کو برا بھلا کہا ،اور ایسی تہمتیں ان کی طرف منسوب کیں جو ان کے اندر نہیں تھیں ، ہر زمانے میں

ایسے نانجار پیدا ہوئے ہیں جو اہل اللہ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، نہ ان کے علم وفضل کی قدر کرتے ہیں بلکہ بد زبانی بدکلامی اور بدگمانی کرتے ہیں، ہر دور میں ایسے کچھ لوگ رہتے ہیں، تو امام صاحبؒ کے زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے، غرض اس شخص نے برسر بازار امام صاحب کو بہت برا بھلا کہا، گالیاں دیں، جھوٹی تہمتیں آپ پر تھوپ دیں جو حضرت امامؒ میں نہ تھیں۔ اب امام صاحبؒ کو حق تھا کہ وہ بھی ایک آدھ گالی دے دیتے لیکن امام صاحبؒ کی ایمانی کیفیت، ایسے حضرات تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہوتے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خلقِ عظیم دیا گیا، وہ خلق عظیم سے کیسے ہٹ سکتے تھے، تو امام صاحبؒ کو جب معلوم ہوا کہ مجھے برا کہا، جب یہ سنا کہ فلاں شخص نے مجھے گالیاں دیں تو ایک جگہ ریشم کے بہت سارے قیمتی تھان رکھے تھے تھانوں کی ڈھیریاں لگائیں، دراہم ودنانیر کی بھری ڈھیریاں لگائیں کچھ کوزے کی مسری اسی طرح اس زمانے کے جو تحائف تھے وہ بھی جمع کئے، ان تمام چیزوں کو اپنے کندھے پر ڈال کر اس شخص کے گھر پہنچ گئے، یہ اس کو گالیوں کا بدلہ دینے تشریف لے گئے، اس کے گھر پہنچ کر آواز دی، وہ باہر آیا دیکھا کہ امام ابو حنیفہؒ اور سر پر خوان، وہ شخص گھبرا گیا کہ حضرت! آپ اور میرے گھر پر؟ فرمایا: میں نے سنا کہ آپ نے میرے اوپر کچھ احسانات کئے ہیں؟ اس نے کہا حضرت! احسانات میں نے تو گالیاں دی تھیں اور تہمتیں آپ کی طرف منسوب کی تھیں جو جھوٹی بھی تھیں۔ فرمایا: یہی تو احسانات تھے، اس واسطے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب کوئی شخص کسی پر جھوٹی تہمت دھرتا ہے کہ وہ عیب اس کے اندر نہیں مگر برائی اس پر تھوپ دی تو قیامت کے دن اس تہمتیں لگانے والے کی جتنی نیکیاں ہیں وہ اسے دیدی جائیں گے جس پر تہمتیں لگائیں، جس پر تہمت لگی ہے اس کے جو واقعی عیب تھے وہ اس تہمت لگانے والے پر لا دیئے جائیں گے، وہ تو جنت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے گا اور یہ جہنم میں پہنچ جائے گا، تو فرمایا: اس سے بڑا احسان کیا ہوگا کہ مجھے جنت دینے کے لئے آپ نے جہنم مول لے لی، اپنی عاقبت خراب کر لی اس سے بڑا ایثار کیا ہوگا کہ محض میری بھلائی کے لئے اپنی عاقبت اور آخرت بگاڑ لی کہ مجھے جنت مل جائے، اس احسان کا میں کوئی بدلہ نہیں دے سکتا، یہ چند ہزار روپے کے کوئی معمولی تھان ہیں اور کچھ درہم اور دینار ہیں آپ کے احسان کا یہ حقیر سا بدلہ لے کر آیا ہوں،، اس کی حالت یہ تھی کہ جیسے اس کو الٹی چھری سے ذبح کر دیا گیا ہو، کبھی نیچے دیکھتا ہے کبھی قدم پکڑتا ہے اور کہتا ہے کہ: حضرت! آپ نے تو مجھے بغیر چھری کے ذبح کر دیا۔ فرمایا: اس کی ضرورت نہیں بس یہ ہدیہ قبول کر لو، یہی سب سے بڑا احسان ہوگا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے توبہ کی ہمیشہ کے لئے تائب ہو گیا کہ آج سے میں کسی کو بھی گالی نہیں دوں گا، تو امام صاحبؒ کے خلق نے اس شخص کو بدی کو نہیں مٹایا بلکہ دنیا سے ایک بہت بڑی بدی کا خاتمہ کر دیا کہ کم از کم اس کی نسل تو اس بدی پر نہیں چلے گی جس کے اوپر اس کے اثرات ہیں وہ تو کبھی گالم گلوچ نہیں کرے گا۔ گالی مٹانے کی صورت یہ نہیں ہے کہ ایک گالی کے بدلے میں دو گالیاں دے، یہ تو تین گالیاں جمع ہو گئیں گالی مٹی کہاں؟ گالی کے بدلے میں جب دعا دیں گے اور احسان کریں گے تو گالی بھی مٹ گئی اور احسان غالب آ گیا اس واسطے فرمایا: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ

﴿فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾ ① دوسروں کی برائیوں کو اپنی بھلائیوں سے دفع کرو، عداوت بھی ہوگی وہ دوستی میں تبدیل ہو جائے گی، عداوت ختم ہو جائے گی محبت پیدا ہو جائے گی مگر آگے یہ فرمایا: ﴿وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا﴾ ② یہ وہی کر سکتا ہے جس میں صبر وضبط کا مادہ ہو، اور اگر کسی کے اندر صبر نہ ہو، کسی نے ایک گالی دی اور وہ باہر نکل کر دس گالیاں دے، وہ یہ کام نہیں کر سکتا، یہ بڑے صابر اور ضابط انسان کا کام ہے کہ بیس گالیاں بھی دی جائیں تو وہ پی جائے ۔ اور یہ پینا لوجہ اللہ ہو کہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ میں اس کی اصلاح کروں اور اپنی بھی اصلاح کروں، تو یقیناً وہ گالی اور برائی مٹ جائے گی، غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خلق دیا گیا تھا۔

علمی و عملی قرآن کریم...... بعض لوگوں نے صدیقہ عائشہؓ سے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کیا تھا؟ فرمایا: ''کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ'' ③ آپ کے اخلاق یہ قرآن کریم ہے، قرآن کریم اوّل سے لے کر آخیر تک پڑھ لو، جس چیز کو قرآن نے اچھا کہا وہ تمام اچھائیاں آپ کے اندر ہیں جن چیزوں کو بُرا کہا آپ کی ذات بابرکات اس سے بری الذمہ ہے، تو پورا قرآن کریم آپ کے خلق کا نمونہ ہے، قرآن جو کہتا ہے وہی آپ کر کے دکھلاتے ہیں، جو آپ کر کے دکھلاتے ہیں، قرآن کریم اس کی تائید کرتا ہے، تو قرآن اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں مطابق ہیں اللہ کا ایک قرآن علمی ہے جو کاغذوں میں ہے اور ایک قرآن عملی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے جو چیزیں قرآن کریم میں قال کی صورت میں ہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں حال کی صورت میں ہیں۔

وہاں کلام کی صورت میں ہیں یہاں اعمال کی صورت میں ہیں، یہ دونوں قرآن ایک دوسرے کے اوپر منطبق ہیں، ایک اللہ کا کلام ہے اور ایک اللہ کا کام ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس کے مورد بنے ہوئے ہیں وہ گویا اخلاقِ خداوندی کا نمونہ ہے حق تعالیٰ کے بھی تو یہی اخلاق ہیں کتنے لوگ ہیں جو اللہ کو برا کہتے ہیں کتنے ہیں جو گالیاں دیتے ہیں، کتنے ہیں جو حق تعالیٰ کے صریح مدمقابل آئے ہوئے ہیں حتیٰ کہ یہی بدکردار انسان ڈھٹائی کے ساتھ ''اینٹی خدا اور اینٹی رسول'' انجمنیں قائم کرتا ہے، یعنی خدا اور رسول کے مقابلے کے لئے انجمنیں قائم کرتے ہیں، مالک الملک کی شان میں اتنی گستاخیاں مگر اس کے باوجود حلم کا یہ حال ہے کہ نہ بارشیں بند ہوتی ہیں نہ آفتاب کا طلوع وغروب ہونا بند ہوتا ہے، نہ موسم آنے بند ہوتے ہیں، نہ موسموں کے غلے پھل بند ہوتے ہیں دوست بھی کھا رہے دشمن بھی کھا رہے ہیں، گالیاں بھی دے رہے ہیں اور مالک کا دیا ہوا کھا بھی رہے ہیں ایسے ناہنجار ہیں کہ محسن کا احسان تو کیا مانتے، الٹا برا بھلا کہہ رہے ہیں، فائدہ اسی کی نعمتوں سے اٹھا رہے ہیں یہ حق تعالیٰ کا حلم ہے جس کو عارف رومی نے کہا: شو مغرور بر حلم خدا...... یہ جو تم گالیاں بک رہے ہو، یہ جو برا بھلا کہہ رہے ہو، اور عذاب نہیں آتا، تو اللہ کے حلم پر مت مغرور ہو، معلوم نہیں اخیر میں کیا نتیجہ نکلے گا؟ کیا بدلہ دیا جائے گا؟ یہ تو حلم خداوندی

① سورة فصلت: ۳۴. ② سورة فصلت: ۳۵.
③ مسند احمد، حديث السيدة عائشه رضى الله عنها ج: ۵۰ ص: ۱۱۲ رقم: ۲۳۴۶۰.

ہے کہ صبر کیا جارہا ہے، لیکن جہاں وہ صابر ہیں اور صبور ان کا نام ہے غفور ان کا نام ہے وہیں جبار اور قہار بھی ان کا نام ہے، ان کا قہر جب آتا ہے تو پھر کوئی چیز اس کو روکنے والی نہیں ہوتی، تو: ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ الْحَلِیْمِ'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں حلیم کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں، وہ حلم کرتا ہے مگر جب غضب ناک ہوتا ہے تو پھر غضب کی کوئی حد نہیں رہتی، بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہی تھی کہ حق تعالیٰ شانہ کے اخلاق کا نمونہ تھے، جیسے دشمنوں کی دشمنی دیکھ کر پھر بھی اپنا رزق بند نہیں کرتے، وہی شان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ دشمن گالیاں بھی دے رہے ہیں، برا بھلا کہہ رہے ہیں، قتل وغارت بھی کررہے ہیں، پتھر بھی ماررہے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں دے رہے ہیں، تو صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق دیکھنے ہیں تو اول سے لے کر اخیر تک قرآن کریم پڑھ لو جتنی چیزیں اس میں بھلائیوں کی بیان کی ہیں، وہ سب ایک ایک کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں موجود ہیں، اور جن جن برائیوں سے روکا ہے، حضور علیہ السلام ان برائیوں سے پاک ہیں غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کا نمونہ ہیں۔

تمسخر پر اہلِ حق کی خاموشی کا نتیجہ......اور بعض صحابہؓ نے کہا اگر آپ کے اخلاقِ عظیمہ دیکھنے ہیں تو اس آیت کو پڑھ لیں۔ ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ﴾ ① اے پیغمبر! معافی کی خو اختیار کرو، اور امر بالمعروف کرتے رہو، لوگوں کو نیکیوں کی طرف بلاتے رہو، ان کی نا ہنجاریوں پر مت جاؤ، اگر یہ جاہلانہ حرکت بھی کریں تو درگذر کیجئے بالکل خیال ہی نہ لائیے، ان کی جاہلانہ حرکات خود بخود بند ہو جائیں گی۔ جیسا کہ متقی حضرات کی شان قرآن کریم میں بیان فرمائی گئی: ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ ② ایک صالح، نیک بندہ عارف باللہ گزر رہا ہے، اور مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگ تمسخر کر رہے ہیں نام لے کر پھبتیاں کس رہے ہیں، لیکن اولیاء کرام کی شان کیا ہے؟ ایسی لغو مجلسوں سے نظر نیچی کر کے گذر جاتے ہیں، دھیان بھی نہیں لاتے کہ یہ کیا بک رہے ہیں، یہ نہیں کہ متاثر ہوں اور خم ٹھونک کے کھڑے ہو جائیں کہ تم نے مجھے برا بھلا کیوں کہا؟ صبر وضبط اور درگزر کو اختیار کرتے ہیں اور آنکھ نیچی کر کے گزر جاتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بدکردار کے مقابلہ میں حق تعالیٰ آجاتے ہیں، آپ کو مقابلہ پر آنے کی ضرورت نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے کہ: ''مَنْ اٰذٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ'' ③ جس نے میرے ولی اور دوست کو ستایا میں اس کو الٹی میٹم دیتا ہوں وہ مجھ سے نمٹے، میں اس سے مقابلہ کروں گا، اس ولی کی طرف نہ جائے، تو اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو چھوڑ دیتے ہیں کہ تم اپنے کام میں لگے رہو ہم تمہارے دشمنوں سے ہم خود ہی نمٹیں گے۔ پھر اس جنگ کا نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے اوپر اس کی آل اولاد اور مال پر آفت پڑتی ہے۔

---

① پارہ: ۹، سورة: الاعراف، الآية: ۱۹۹. ② پارہ: ۱۹، سورة: الفرقان، الآية: ۷۲.

③ الصحيح للبخاري، كتاب الرقاق، باب التواضع ج: ۲۰ ص: ۱۵۸ رقم: ۶۰۲۱.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا . صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا أَمَّا بَعْدُ!

نفی جنون کے دوطریقے...... بزرگانِ محترم حق تعالیٰ شانہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنون کی تہمت اٹھاتے ہوئے اوراس کی نفی کرتے ہوئے دوطریقے اختیار فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کمالات حق تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں ان کمالات کا ذکر فرمایا اور نعمت کے لفظ سے ان کی طرف اشارہ فرمایا بتلانا یہ تھا کہ جس ذاتِ بابرکات میں یہ کمالات موجود ہوں اس کو مجنون کہنا بہت زیادہ نادانی اور حماقت کی بات ہے اس طرح جنون کی نفی ہوگئی، اور کفار کی تہمت سے بریت ثابت ہوگئی۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ جنون کی تہمت رکھنے والے کے آثار بیان کئے کہ ان کے احوال پر ذرا غور کیا جائے پیغمبر کو مجنون کہنے والے کون ہیں؟ اس واسطے کہ تہمت لگانے والی شخصیت اگر باوقعت ہو اور بڑے درجہ کا آدمی ہو تو وہ تہمت تقابل التفات بھی ہے اگر چہ تہمت بڑا لگائے چھوٹا لگائے حماقت ہے، لیکن بہرحال اگر کوئی سنجیدہ اور متین شخص اور مخلوق میں مقبول ہو تو یہ کہا جائے گا کہ اس پر غور کرلیا جائے کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے، لیکن اگر کہنے والا ایسا ہے کہ انسانیت کی جتنی برائیاں ہوسکتی ہیں وہ ساری اس کے اندر موجود ہوں تو اس کی تہمت بہت ہی بے وقعت ہے، جو قابلِ توجہ بھی نہیں ہے تو جن پر تہمت لگائی گئی ان کے آثار کمال دیکھو اور ایک طرف تہمت لگانے والے کی برائیوں پر نظر ڈالو، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تہمت محض عناد اور دشمنی سے ہے، اس کی کوئی وقعت نہیں ہے، تو یہ تہمت سب سے پہلے جس نے لگائی اور اسے لے کر کھڑا ہوا، وہ ولید بن مغیرہ ہے، یہ سردارانِ قریش میں سے ایک سردار ہے اس نے اپنی دشمنی اور عناد میں آکر کہا کہ:

محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجنون ہیں، معاذ اللہ ان کی بات کا تو کوئی اعتبار نہیں، سوال یہ ہے کہ اس تہمت لگانے والے کے کیا اوصاف ہیں۔

تہمت جنون لگانے والے کی عرفی حیثیت......تو حق تعالیٰ نے دس اوصاف اس کے بیان کئے کہ یہ دس برائیاں اس کے اندر ہیں جو ایک انسان کے ذلیل وخوار ہونے کے لئے کافی ہیں مزید کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، تو اس نے صرف ایک برائی بلکہ تہمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی تھی، کہ معاذ اللہ آپ مجنون ہیں، تو حق تعالیٰ نے دس برائیاں ثابت کیں اور فرمایا: جس کے اندر یہ حرکتیں موجود ہیں، اس کی بات بھی کوئی قابلِ اعتبار ہوسکتی ہے؟ اور یہ عجیب نہیں کہ اس بناء پر ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مداح اور ستائش کرنے والے آپ پر جو درود شریف بھیجتے ہیں تو درود بھیجنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو اس درجہ محبت کے مقام پر مانتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں، چنانچہ فرمایا گیا: ''مَنْ صَلّٰی عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاحِدَۃً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ عَشْرًا'' ① جو شخص ایک دفعہ ہمارے نبی پر درود بھیجے گا تو اللہ اس پر دس دفعہ رحمت بھیجے گا، تو اس کا مطلب یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رحمت کی دعا کرنے والا دس مرتبہ اللہ کی رحمت کا مستحق بنے گا، تو اللہ جس بندے کو دس خوبیاں اور نیکیاں دے ظاہر بات ہے کہ اس سے بڑھ کرامت میں اور کون ہوگا جس کو حق تعالیٰ سراہیں اور اس پر رحمت نازل فرمائیں ٹھیک اس کے بالمقابل جو ایک دفعہ برائی کرے گا حق تعالیٰ اس کی دس دفعہ برائی بیان کریں گے وہ ایک تہمت عائد کرے گا تو حق تعالیٰ نے اس کی تہمتیں اس پر عائد کیں اس نے ایک جھوٹی تہمت لگائی تھی حق تعالیٰ نے اس کی سچی دس تہمتیں بیان فرمادیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو ایسا ہو تو کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کی بات سنی جائے؟

دشمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس بری خصلتیں......فرمایا: ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ﴾ پہلی بات یہ ہے کہ وہ حلّاف ہے، یعنی کثرت سے قسمیں کھانے والا ہے اور تجربہ یہ ہے کہ جو زیادہ قسمیں کھاتا ہے بار بار قسمیں کھاتا ہے وہ جھوٹا ہوتا ہے اس کی علامت یہ ہے کہ اُسے خود بھی اپنی بات پر اعتماد نہیں ہے، اس لئے قسمیں کھا کھا کر زبردستی اپنی بات کو مخلوق کے دل میں ٹھونسنا چاہتا ہے، بات میری قابل اعتبار تو نہیں ہے، قسمیں کھانے سے ممکن ہے کوئی اعتبار کرے تو اس کو حلاف کہا گیا ہے تو یہ خود ایک برائی ہے کہ آدمی بات بات پر قسم اٹھائے شریعت نے اس کو مکروہ سمجھا ہے قسم کسی ضرورت کے لئے ہوتی ہے، کوئی دعویٰ ثابت کرنا ہو یا کوئی معاملہ ہو اور معاملہ پکا نہیں ہو رہا ہے تو اس کے لئے آدمی قسم کھائے لیکن جس شخص کا قسم تکیہ کلام بن جائے، بات بات پر حلف اٹھائے تو یہ اس کے جھوٹے ہونے کی علامت ہوتی ہے، اس لئے مسئلہ شرعی یہ ہے کہ: ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ﴾ ② اللہ کے نام کو کھلونا مت بناؤ، تھوڑی تھوڑی بات کے لئے اللہ کو بیچ میں لائے، کوئی بڑا اہم معاملہ ہو تو اللہ کو بیچ میں لائے، کوئی وقف کا معاملہ ہو کوئی اور کارِ خیر سرانجام دے رہا ہو اس کا حلف اٹھائے، اللہ کو بیچ میں لائے چھوٹی چھوٹی

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد التشہد ج: ۲ ص: ۳۷۶ رقم: ۶۱۶۔ ② پارہ: ۲، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۲۲۴۔

اور خسیس خسیس باتیں اور بار بار اللہ کے نام کو بیچ میں لا رہا ہے تو یہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کے نام کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی ہے اس واسطے شریعت نے روکا ہے کہ بار بار قسم مت کھاؤ، کوئی بڑا معاملہ آجائے، عدالت میں کوئی معاملہ آجائے یا لاکھوں روپوں کا معاملہ ہو، یا کوئی دین کا معاملہ ہو تو آدمی کہے کہ میں حلف کرتا ہوں، میں نے آج کھانا کھایا تھا، مجھے خدا کی قسم ہے قسم ہے اللہ کی میں نے کپڑے پہنے تھے، یہ کوئی قسم کھانے کی بات ہے، بھائی تو نہ پہنتا تو کیا تھا اور پہن لئے تو کیا ہو گیا، غرض اللہ کے نام کو کھلونا نہ بنائے شریعت نے اس کی ممانعت کی ہے، تو وہ (ولید) بار بار قسم کھاتا ہے، تو اسے اپنی بات پر بھی اعتماد نہیں ہے تو جو شخص خود بھی اپنے کو جھوٹا سمجھتا ہو اس کی بات کیا قابل اعتبار ہے؟ اور اس ذات اقدس پر تہمت لگائے جو پورے عالم سے بڑھ کر مقدس ہے۔

تو خود جھوٹا، قسم کھانا اس کی علامت ہے اور اس عظیم شخصیت کے اوپر تہمت لگائے تو دو وجہوں سے یہ بات اس قابل نہیں رہی کہ اس کے اوپر اعتماد کیا جا سکے، غرض پہلی بات حلاف سے بیان کی۔ دوسری بات، مھین ...... یہ بے وقعت آدمی ہے، یعنی ملک میں بھی اس کی کوئی وقعت نہیں، بار بار قسمیں اٹھانے سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ جھوٹا اور معاند ہے اور اپنی بات پورا کرنے کے لئے قسمیں کھاتا ہے تو...... حلاف، مھین...... یعنی ذلیل اور بے وقعت ہے لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت وعظمت نہیں ہے، پھر ساتھ میں ھمّاز بھی ہے، یعنی عیب چینی اس کی عادت ہے، عرب والے اس سے تنگ ہیں، یعنی واقعی ناواقعی کسی میں کوئی برائی ہو اس کی زبان پر آجاتی ہے کہ فلاں میں یہ عیب ہے تو ساتھ میں ھماز بھی ہے۔ پھر فرمایا: ﴿مَشَّآءٍ بِنَمِيمٍ﴾ چغلخور بھی ہے، اس کی بات اس کو لگادی اس کی بات اس کو لگادی، اور دونوں میں لڑائی کرادی، تفریق ڈلوادی، یہ گویا اس کا بڑا کمال ہے۔

مدعی جنون کے اوصاف اہل جہنم جیسے ہیں ...... انسانوں میں کمال یہ سمجھا گیا ہے کہ دو لڑتے ہوؤں کو آپس میں جوڑ دے عناد کرنے والوں میں محبت پیدا کر دے یہ کوئی کمال ہے کہ دو محبت کرنے والوں کو توڑ دے یہ شیطانی وصف ہے، شیطان دنیا میں اسی لئے آیا ہے کہ جڑے ہوئے دلوں کو توڑ دے، محبت والوں میں تفریق پیدا کر دے، جبکہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں مقصد یہ ہے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیں، بچھڑے ہوئے دلوں کو ملائیں۔

تو برائے وصل کردن آمدی ‏ ‏ ‏ نے برائے فصل کردن آمدی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں وصل کرنے کے لئے آئے ہیں، جو بندے آپس میں ٹوٹ گئے ہیں، انہیں آپس میں ملائیں، جو بندے خدا سے ٹوٹ گئے ہیں، انہیں خدا سے جوڑ دیں، جن خاوند بیویوں میں جھگڑا ہے ان کو آپس میں جوڑ دیں جن کے کنبوں میں تفریق ہے ان کو ملا دیں اگر قوم میں لڑائی ہے تو اس میں اتحاد پیدا کر دیں۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کا دعویٰ فرماتے ہی پہلا کام یہ کیا ہے کہ عربوں میں جو صدیوں سے لڑائی چلی آرہی تھی اور باہم رقیب تھے اور ایک ایک لڑائی پر سو سو برس گذر چکے تھے، ان کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا جس کو

قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ ① اے عربو! تم لڑلڑ کر جہنم کے کنارے پر پہنچ چکے تھے، ذلیل ورسوا بن گئے تھے، دنیا کی قوموں میں تمہارا کوئی وقار باقی نہیں تھا، کوئی عربوں کو اونٹوں کے چرانے والے کہتا تھا کوئی مینگنیوں میں کھیلنے والے کہتا تھا، کوئی ذلیل لوگ کہتا تھا، غرض دنیا کی قوموں اور حکومتوں میں عربوں کی بے وقعتی تھی ذرا ذرا سی بات پر جنگیں ہوتی تھیں، پانی پینے پلانے پر جھگڑا تھا، فلاں نے کنویں میں پہلے کیوں ڈول ڈال دیا، میرا ڈول پہلے کیوں نہ گرا، لڑائی شروع ہوئی اور تلواریں کھنچ گئیں۔

حدیث میں ایک واقعہ میں فرمایا گیا کہ ایک شخص کے کھیت میں کسی کی اونٹنی جا گھسی اس نے تیر مارا تو اونٹنی کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور وہ کھیت کی رکھوالی کرنیوالی عورت تھی، اونٹنی والے کو غصہ آیا، اس نے آکر عورت کا پستان کاٹ دیا، بس یہاں سے جنگ شروع ہوئی اور سو برس تک جنگ جاری رہی، مرنے والے وصیت کر کے جاتے تھے کہ صلح مت کرنا، ورنہ خاندان کی ناک کٹ جائے گی، ہزاروں آدمی قتل ہوگئے محض اس لئے کہ اونٹنی کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اور اس میں ایک صدی گذر گئی حربِ فجار و حربِ بسوس وغیرہ پچاس برس تک چلتی رہی، اسی طرح کوئی دس برس چلتی رہی۔

اہل جنت اور اہل جہنم کے اخلاق...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر سب کو ایسا شیر و شکر کر دیا کہ حقیقی بھائیوں میں وہ محبت نہ ہوگی جو صحابہؓ کے اندر محبت پیدا ہوئی ان کی شان یہ بیان کی گئی: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ ② وہ کفار پر شدید تھے اور آپس میں رحیم تھے۔ ایک دوسرے کے سامنے پانی پانی تھے: ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ ③ باہم محبتیں اللہ کے لئے کرتے تھے غرض کی محبت نہ تھی، اغراض کی خاطر نہ تھیں اللہ کے لئے تھیں۔ تو وہ کفار کے اوپر عزیز اور غالب تھے لیکن باہم پست اور چھوٹے بن جاتے تھے، ایمان والوں میں سے جسے دیکھو تواضع کر رہے تھے، یہ کیفیت ہے جیسے شاگرد استاذ کے سامنے ہوتا ہے، یا مرید اپنے پیر کے سامنے، گویا سب خادم تھے جو کمال تواضع کی دلیل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، اور جلیل القدر صحابی ہیں، یہ حضرت زید بن ثابتؓ کے شاگرد ہیں علمِ فرائض اور دوسرے علوم حضرت ابن عباسؓ نے انہی سے حاصل کئے ہیں، زید بن ثابتؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبِ وحی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خصوصی وصف ارشاد فرمایا کہ: ''اَفْرَضُهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ'' ④ یعنی فرائض کے سب سے زیادہ عالم حضرت زید بن ثابتؓ ہیں، تو ابن عباسؓ حضرت زید بن ثابتؓ سے فتاویٰ اور مسائل پوچھتے تھے، ایک دن حضرت زید بن ثابتؓ نکلے، گھوڑا تیار تھا اس پر سوار ہوئے تو ابن عباسؓ نے رکاب تھام لی، انہوں

---

① پارہ: ۴، سورة: آل عمران، الآية: ۱۰۳. ② پارہ: ۲۶، سورة: الفتح، الآية: ۲۹. ③ پارہ: ۶، سورة: المائدة، الآية: ۵۴. ④ السنن للترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب مناقب معاذ بن جبل وزيد بن ثابت رضي الله عنهما ج: ۱۲ ص: ۲۶۲.

نے کہا: اے ابن عم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کیا غلط کام کر رہے ہو، میری رکاب کیوں تھام رہے ہو؟ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی ہو، تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت حاصل ہے تم واجب التعظیم ہو، ایسا کیوں کرتے ہوں؟ انہوں نے کہا: ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اپنے استاذوں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا جائے جو میں کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ابن عباسؓ کسی گھوڑے پر سوار ہونے لگے تو حضرت زید ابن ثابتؓ نے جا کر ان کے پاؤں پکڑ لئے اور رکاب پر ہاتھ رکھ دیا، وہ گھبرائے اور عرض کیا: اے زید! یہ آپ کیا کر رہے ہو؟ فرمایا: ہمیں ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم ہے کہ اہل بیت رسول اللہ کے ساتھ یہی ادب کا معاملہ کریں، اہل بیت رسول اس قابل ہیں کہ ان سے محبت کی جائے ان کی عظمت کی جائے، اور ان کی محبت کو جزو ایمان سمجھا جائے۔

تو زید ابن ثابتؓ استاذ ہیں مگر ابن عباسؓ کے پاؤں تھام رہے ہیں اور ابن عباسؓ اہل بیت میں سے ہیں مگر زید ابن ثابتؓ کے پیر تھام رہے ہیں غرض اسلام نے اس درجہ محبت پیدا کر دی تھی کہ بڑے چھوٹے کا امتیاز معاملات کے اندر نہیں رہا تھا، ہر ایک یوں سمجھتا تھا کہ یہی سب سے زیادہ بڑے ہیں اور دوسرا یوں سمجھتا تھا کہ زیادہ بڑے یہ ہیں، تو یہ کمالِ تواضع محبت باہمی کا منشاء بنا، غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اس لئے تشریف لائے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیں، بچھڑے ہوئے کو ملا دیں، تفریق شدہ لوگوں کو باہم میل ملاپ کرا دیں، اس لئے نہیں آئے تھے کہ آپ دلوں کو توڑیں، باہم تفریق پیدا کریں اور گروہ بندی پیدا کر دیں، گروہوں کو مٹانے کے لئے آپ تشریف لائے تھے، اور جو تہمت لگانے والا ہے وہ چغل خور ہے کہ رات دن اس کا کام باہم تفریق ہے یہ تفریق کرانا حقیقت میں اہل جہنم کے اخلاق میں سے ہے، ملانا اور قلب میں یکسانی پیدا کرنا یہ اہل جنت کے اخلاق میں سے ہے۔

اسی واسطے قرآن کریم میں جہاں اہل جہنم کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہاں فرمایا گیا: ﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا﴾ ① جب کوئی پارٹی جہنم میں داخل ہوگی تو جو پہلے سے وہاں موجود ہوگی وہ کہے گی تم پر لعنت ہو تمہاری وجہ سے ہم یہاں آئے وہ کہیں گے تمہارے اوپر لعنت ہو تمہاری وجہ سے ہم یہاں آئے، تو لعن طعن کا شور ہوگا کہ جہنم کا عذاب تو ایک طرف یہ مستقل ایک عذاب ہوگا کہ وہ اسے گالی دے رہا ہے وہ اسے گالی دے رہا ہے، وہ اس پر لعنت بھیج رہا ہے وہ اس پر لعنت بھیج رہا ہے، تو لعنتیں درحقیقت اہل جہنم کے اوصاف میں سے ہیں۔ اور اہل جنت کے اوصاف میں فرمایا گیا: ﴿إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ﴾ ② بڑی بڑی مسندوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں گے اور دل ایسے ہوں گے جیسے حقیقی بھائیوں کے، ایک کی محبت دوسرے کے اندر جاگزیں ہوگی، تو بڑے بڑے شاہانہ تخت پر بیٹھے ہوں گے۔ اس جگہ پر قید لگائی ﴿مُتَقَابِلِينَ﴾ یعنی بڑے سے بڑا بھی مجمع ہوگا تو ایک دوسرے کو پشت نہیں دے گا، بالکل آمنے سامنے ہوں گے۔ اس لئے کہ جنت میں جگہ کی تو

① پارہ: ۸، سورة: الاعراف، الآية: ۳۸. ② پارہ: ۱۴، سورة: الحجر، الآية: ۴۷.

کوئی کمی نہیں، یہ جو ہم ایک دوسرے کو پشت دیتے ہیں یہ جگہ کی کمی ہے، اگر ایک دائرہ بنا کے بیٹھیں اور آمنے سامنے ہوں اور فرض کیجئے ایک ہزار یا دس ہزار آدمی ہوں تو گھر کے لئے اتنا بڑا میدان کہاں سے لائیں کہ دس ہزار آدمی ہوں اور کسی کی کسی کو پشت نہ ہو، پھر یہ کہ آواز نہیں پہنچ سکتی بات نہیں ہو سکتی اگر چار پانچ میل کا ایک دائرہ بن گیا تو آواز تو بجائے خود ہے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکیں گے، لیکن جنت میں یہ چیزیں نہیں ہیں، آواز پچاس ہزار میں سنو تو ایسی ہوگی جیسے پاس بیٹھے ہوں اور وہاں آمنے سامنے چہروں کی روشنی ایسی مصفّٰی ہوگی کہ پچاس ہزار میل کا فاصلہ ہو تب بھی ایسا ہی نظر آئے گا جیسے آدمی پاس بیٹھا ہو۔

احادیث میں فرمایا گیا ہے کہ سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمین سے بڑی ہے، اوپر کی جنت والے نیچے والوں کو ایسے نظر آئیں گے جیسے ستارے چمک رہے ہیں، نگاہیں اتنی تیز کر دی جائیں گی کہ زمین وآسمان جسے بھی زیادہ فاصلہ ہوگا اور وہاں کی چیزیں ایسے نظر آئیں گی جیسے پاس پڑی ہوئی ہیں تو جنت کے اندر جگہ کی بھی کمی نہیں اور یہ جو مسافتوں کی وجہ سے دیکھنے یا آواز کے سننے میں دشواری ہوتی ہے یہ بھی نہیں ہوگی اس واسطے فرمایا گیا ﴿اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ﴾ ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے، پشت کا وہاں سوال نہیں ہوگا کہ کسی کو پیٹھ دے کر بیٹھے، نہ دیکھنے میں کوئی چیز حارج ہوگی نہ بات کرنے میں اور نہ سنانے میں حارج ہوگی، تو تعظیم یہ بتلائی گئی کہ دلوں میں محبت جاگزیں ہوگی اور بیٹھنے میں ایک دوسرے کے پشت نہیں دیں گے تو تواضع بھی ہوگی، محبت بھی ہوگی ایک دوسرے کی توقیر اور تعظیم بھی ہوگی، یہ اہل جنت کے اوصاف ہیں۔

اور اہل جہنم کے بارے میں فرمایا گیا جو جماعت جائے گی وہ ان پر لعنت کرے گی اور پہلے والے ان پر لعنت بھیجیں گے، تو لعن طعن کا بازار گویا گرم ہوگا، تو فرمایا گیا کہ رسول کی شان تو یہ ہے کہ اس نے گویا بچھڑے ہوئے کو ملا دیا اور اس کی شان جو جنون کی تہمت لگا رہا ہے یہ ھمّاز بھی اور مشاءٍ بنمیم بھی ہے، یعنی عیب چین بھی ہے اور ساتھ میں چغل خور بھی ہے اس کی اس سے اور اس کی اس سے لگا دی باہم ٹوٹ اور تفریق پیدا کر دی، اور ساتھ میں ﴿مناع للخیر﴾ بھی ہے خیر کے ہر کام میں روڑے اٹکانے والا بھی ہے، کوئی اچھی سے اچھی چیز لے کے کھڑے ہوں، اس پر اعتراض کرنا اس کو چلنے نہ دینا اس کو روک دینا یہ اس ولید بن مغیرہ کی شان تھی۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مومن کی شان کیا ہونی چاہئے؟ ''مِفْتَاحًا لِّلْخَیْرِ وَمِغْلَاقًا لِّلشَّرِّ'' ① ہر خیر کی کنجی ہے، جیسے کنجی سے تالا کھل کر اندر رکھی ساری چیزیں نمایاں ہو جاتی ہیں، گویا خیر کو ایک محل فرض کیا گیا اس پہ تالا پڑا ہوا ہے مومن اس کی چابی ہے، تالا کو کھول دیا تو ہر خیر نمایاں ہوگئی اور ہر بھلائی سامنے آگئی اور جہاں شر نکلتی ہو اس کا تالا بند کر دے وہاں تالا ڈال دے کہ یہ شر نہ مجھے لگے نہ دوسرے کو لگے، تو مومن کی شان یہ ہے اور یہ ﴿مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ﴾ ہو کہ نبی کے اوپر تہمت دھرتے ہیں، جن کی ذات ایسی بدنما ہو تو کیا ان کی بات قابل اعتبار ہوگی۔؟ پھر یہ کہ ساتھ میں ﴿مُعْتَدٍ﴾ بھی ہے یعنی حدود سے تجاوز

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب من كان مفتاحا للخير ج: ۱ ص: ۲۷۵ رقم: ۲۳۴.

کرنے والا بھی ہے، کسی حد پر قائم نہیں ہے کوئی اچھی حد قائم کردو، اس سے آگے گذر جائے گا نیکی کی ایک حد قائم کی، اس سے گذر کر آگے پہنچے گا حتی کہ شر کے اندر پہنچ جائے گا، خیر کی کسی چیز کی حد باقی نہیں رکھتا، ہر چیز کی حدود سے تجاوز کرتا ہے، ظلم وتعدی اور زیادتی میں گزر جانے والا ہے، اور اوپر سے گناہ گار۔ ﴿اَثِیۡمٍ﴾ رات دن فسق وفجور میں مبتلا چنانچہ ولید ابن مغیرہ کی شان بتلائی گئی کہ زنا کار یہ تھا، بدکار یہ تھا، مَنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ یہ تھا مُعۡتَدٍ اور اَثِیۡمٍ یہ تھا، اور پھر عُتُلٍّ اُجڈ بھی تھا یعنی کسی سے ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا، بات کی گویا لاٹھی ماری، یعنی کسی سے بھی ڈھنگ سے بات نہیں کرتا تھا، کوئی اچھی بات بھی کہے گا تو لاٹھی ماری بات کہے گا کہ خواہ مخواہ اس سے دل ٹوٹ جائیں گے، تو بالکل اُجڈ گنوار جنگلی قسم کا آدمی ہے کہ بات کرنے کی بھی تمیز نہیں، کوئی سلیقہ نہیں اعلیٰ درجہ کا بدتہذیب ہے، پھر فرمایا ﴿بَعۡدَ ذٰلِکَ زَنِیۡمٍ﴾ پھر یہ کہ ولد الزنا بھی ہے، یعنی حلال کا نطفہ نہیں ہے، تیس چالیس برس تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس کا باپ کون ہے، تیس برس گذرنے کے بعد مغیرہ نے کہا کہ میں نے اس کی ماں کے ساتھ بدکاری کی تھی اس سے یہ پیدا ہوا، اس وقت کھلا کہ مغیرہ اس کا باپ ہے، تو ان تمام عیبوں کے ساتھ اوپر سے والد الزنا بھی ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جس کا خون ہی ناپاک ہو، جس کی ابتداء ہی ناپاک ہو اس میں اچھے اخلاق کہاں سے پیدا ہوں گے؟ اس میں بھلائی کہاں سے پیدا ہو جائے گی؟ اس کی تو بنیاد ہی خراب ہے۔

بعض اوقات بدکردار لوگوں کو اولاد واموال کی کثرت دی جاتی ہے...... اِن تمام خرابیوں کے ساتھ یہ ہوا کہ ﴿اَنۡ کَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِیۡنَ﴾ اوپر سے کچھ اولاد اللہ نے زیادہ دے دی اور دولت بھی زیادہ دے دی تو کریلا اور نیم چڑھا بن گیا، تو یہ ساری بدعملیاں اور بداخلاقیاں تھیں، دولت کی وجہ سے لوگ اس سے دبتے تھے، اور وہ لوگوں کے سر پر سوار ہوتا تھا کہ کسی میں لڑائی کرادی کسی کو گالی دیدی، کسی کو برا کہہ دیا، تو چوبیس گھنٹے اس شخص کا مشغلہ ہی یہ ہے کوئی خیر کی بات کہتا ہے نہ کرتا ہے۔ اور ایسوں کو اللہ میاں ڈھیل دینے کے لئے زیادہ دے بھی دیتے ہیں، تا کہ اچھی طرح حجت قائم ہو جائے۔

قرآن کریم میں جب یہ آیت اُتری: ﴿عَلَیۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ﴾ ① کہ جہنم میں انیس داروغہ ہیں، اور وہ اتنے سخت ہیں کہ ان کے دل میں رحم نہیں ڈالا گیا، وہ جہنمیوں پر ہر وقت عذاب ہی دینے کے لئے تیار رہیں گے، تو یہ آیا اور کہنے لگا کوئی پرواہ کی بات نہیں، میرے انیس بیٹے ہیں ہر داروغہ کے مقابلہ میں ایک کو پیش کردوں گا، یہ جہالت کی حالت ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں اللہ سے لڑنے کو تیار ہے، اور اللہ کے بنائے ہوئے داروغہ ملائکہ کے مقابلہ میں اپنے بیٹوں کو لا رہا ہے کہ جو ملائکہ اس کے بیٹوں کی آکر روح قبض کریں گے ان کے مقابلہ کے لئے پیش کررہا ہے، تو جہالت کی بھی انتہا ہے اور گنوارپن کی بھی انتہا ہے، غرض یہ دس چیزیں بیان فرمائیں، ان دس بدعملیوں اور بداخلاقیوں کے بعد اس کی حالت بیان فرمائی کہ: ﴿اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیۡرُ

① پارہ: ۲۹، سورۃ: المدثر، الآیۃ: ۳۰۔

﴿الْاَوَّلِیْنَ﴾ جب اس کے سامنے کوئی اللہ کی آیت پڑھو تو کہتا ہے کہ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں پچھلی باتیں ہیں، وہ پچھلے کہتے چلے گئے انہوں نے بھی نقل کردیں، تو کسی خیر کی توقع نہیں، اور کوئی شر نہیں جسے اس نے چھوڑ دیا ہو، تو خیر کے پیچھے تو لاٹھی لئے پھرتا ہے اور شر جہاں ملتی ہے اسے سینے سے لگاتا ہے، یہ ہیں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اوپر تہمت لگانے والے کہ نہ ان کی اپنی قوم میں وقعت نہ ذاتی اوصاف اچھے، مگر چونکہ یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں مشترک تھے، اس واسطے جو یہ کہتا تھا اسے لوگ لے اڑتے تھے اور گھر میں بیٹھ کر کہتے تھے کہ جھوٹا مکار ہے، بدی کررہا ہے اور بے ہودگی کررہا ہے، مگر آواز میں آواز ملا دیتے تھے کیونکہ ان سب کی غرض اس طرف ہوگئی تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کی جائے تو جو اس کے ساتھی تھے، وہ بھی اس کی وقعت نہیں کرتے تھے، یہ لوگ گویا کفار بھی تھے اور منافق بھی تھے۔

ابوجہل نے چندروزہ دنیا کی خاطر آخرت برباد کرلی...... ابوجہل جو ان کا ساتھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا تھا، سب وشتم کرتا تھا اور برا بھلا کہتا تھا، ایک دفعہ اس ولید نے تنہائی میں ابوجہل سے پوچھا کہ: کیا واقعی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا ہی جانتا ہے، جیسا ظاہر میں کہتا ہے، اس نے کہا واللہ واللہ! میں جانتا ہوں دنیا میں سب سے زیادہ سچے یہی ہیں۔ اس نے کہا کم بخت علی الاعلان کیوں برائی کرتا ہے، بات مانتا کیوں نہیں؟ اس نے کہا سرداری جاتی رہے گی، قوم مخالف ہوجائے گی، جائیداد چھن جائے گی گھربار چھن جائے گا، اسلئے میں برائی کرنے پر مجبور ہوں، ورنہ میں دل سے جانتا ہوں کہ دنیا میں ان سے زیادہ سچا کوئی نہیں، یہ کیفیت تھی تو جاہ ومال اور سرداری کے لئے اور چندروزہ زندگی کے لئے ایمان دین دیانت سب چھوڑنے کو گوارہ۔ تو فرمایا گیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تو یہ شان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی کمالات دیئے، اخلاقی کمالات دیئے، اصلاحِ عالم کے کمالات دیئے، تربیتِ عالم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرمائی، حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا سردار بنایا، اور ان کو مجنون کہنے والا کون؟ ھماز، حلاف، مشآء بنمیم، زنیم وغیرہ ذالک دو ہی طریق سے ایک بات کو رد کیا جاتا ہے، جب کسی عظیم شخص کی برائی بیان کی جائے تو اس کے فضائل بیان کردیئے جائیں، دفعیہ ہوجاتا ہے کہ وہ تہمت ان پر ثابت نہیں، یا یہ ہے کہ تہمت رکھنے والے کی حقیقت کھول دی جائے، حق تعالیٰ شانہ نے دونوں راستے اختیار فرمائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ومناقب جامع بیان فرمائے اور تہمت لگانیوالوں کی حقیقت کھول دی۔

سردارانِ قریش کا مشورہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب...... ﴿وَدُّوْا لَوْتُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ﴾ اس آیت کا شانِ نزول اور اس کے نازل ہونے کا سبب یہ پیش آیا کہ سردارانِ قریش میں سے چار بڑے بڑے سردار ایک ولید ابنِ مغیرہ ایک ابوجہل ابن ہشام، ایک اخنس بن شریق ایک اسود ابن عبد یغوث یہ بڑے سردار تھے اور دولت مند بھی تھے، اور ان کی بات بھی مانی جاتی تھی، جب یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے دیتے تھک گئے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مشن برابر چل رہا ہے، لوگ اسلام میں داخل ہورہے ہیں آپ صلی

اللہ علیہ وسلم کی عظمت دنیا میں پھیلتی جارہی ہے جب کوئی صورت نہ دیکھی تو اب یہ ایک تجویز اختیار کی کہ چاروں مل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے پیار اور محبت سے کہا: ''اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ جو یہ باتیں کررہے ہو، اگر معاذ اللہ تمہارے دماغ میں واقعی کوئی خلل ہے کوئی بیماری ہے تو بہرحال ہم تمہارے عزیز قریب ہیں رشتہ دار ہیں علاج کرائیں گے، چاہے لاکھوں روپیہ خرچ ہوجائے، مگر تمہارا علاج کرائیں گے، اور اگر آپ کو عورت مقصود ہے اور تعیُّش مقصود ہے، تو عرب کی بہتر سے بہتر لڑکیاں لاکر ہم تمہارے سامنے پیش کردیں گے، اور اگر تمہیں دولت مقصود ہے تو ہم سب خزانوں کے منہ کھول دیں گے جتنی ہماری دولت ہے سب آپ قبضہ کرلو، اور اگر سرداری مقصود ہے تو آج سے ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں، آپ حسب ونسب میں یقیناً ہم سب سے بڑھے ہوئے ہو، اس کے ساتھ حسن وجمال اور سیرۃ وکمال میں یقیناً اعلیٰ ہو، ہم بادشاہ ماننے کو تیار ہیں ہمیں کوئی عار نہیں کہ ہم آپ کو بادشاہ تسلیم کرلیں، مگر اتنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ان بتوں کو برا مت کہو اور جو ہم ان کی عبادت کرتے ہیں اس میں طعنہ مت دو، اب زیادہ سے زیادہ آپ اپنے معبود کی عبادت کرو گے، ہم وعدہ کرتے ہیں ہم بھی آپ کے معبود کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کریں گے، نہ تمہاری عبادت پر کوئی طعن کریں گے تم اپنا کام کئے جاؤ ہم اپنا کام کئے جاتے ہیں، آپ ہمارے بادشاہ دولت بھی تمہارے لئے حسن وجمال بھی تمہارے لئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ان میں سے کوئی چیز درکار نہیں، نہ مجھے حسن وجمال چاہئے نہ دولت چاہئے نہ عورت چاہئے نہ مجھے بادشاہت چاہئے، میں تو اللہ کی بندگی کو دنیا میں پھیلانے کے لئے آیا ہوں، کہ سب کو اللہ کا بندہ بنادوں۔'' اس پر انہوں نے کہا، بہت اچھا ہم اسے بھی مانتے ہیں آپ یہ جاری رکھیئے بس اتنا کیجئے کہ ہم جن بتوں کی پرستش کرتے ہیں آپ ان کو برا نہ کہئے، ان کی تکذیب نہ کریں۔

ردِّ شرک کے بغیر توحید نامکمل ہے...... مگر انبیاء علیہم السلام شرک کی برائی نہ بیان کریں تو لوگ توحید کی طرف کیسے آئیں گے؟ اگر اللہ کے ساتھ دشمنی کرنے کی برائی بیان نہ کریں، تو اللہ کی دوستی لوگ کیسے پیدا کریں گے۔ اس لئے دو چیزیں ہیں، ایک مثبت اور ایک منفی، ایک لا الہ ہے کہ کوئی معبود نہیں، ایک الا اللہ ہے کہ اللہ ایک ہے، تو اللہ کی وحدانیت ثابت نہیں ہوسکتی جب تک لا الہ سامنے نہ ہو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں کسی کو بھی معبود بنائیں اس میں صلاحیت نہیں ہے کہ اس کی پوجا کی جائے، اس کی عبادت کی جائے تو سب کی معبودیت کی نفی کردیں تو اللہ تعالیٰ کی معبودیت کا اثبات ہوگا تو کلمۂ طیبہ جس پر دین کا مدار ہے اس میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں ایک نفی اور ایک اثبات ہر غیرِ حق اور فرضی معبود کی نفی اور جو واقعی معبودِ واحد اور حقیقی معبود ہے اس کا اثبات غرض جب تک ردِ شرک نہ کیا جائے توحید مکمل نہیں ہوتی، اگر ردِّ شرک نہیں ہوگا اور توحید مان لی تو توحید میں سو قسم کے شرک ملادیں گے، اور دعویٰ کریں گے کہ یہ بھی توحید ہے تو وہ توحید ہمرنگِ شرک بن جائے گی، اس لئے شرک کی نفی کی جائے۔

تمام درجاتِ شرک کی نفی...... اور شرک کی نفی ایسی کہ شرکِ جلی، شرکِ خفی شرکِ وہمی اور شریک ابہامی سب کی

نفی کی جائے ،تب جا کر توحید کا کمال ثابت ہوگا،شرک جلی تو یہ ہے کہ کوئی دو معبود مان لے اس کی نفی کرنی پڑے گی کہ معبود دو نہیں، معبود ایک ہی ہوتا ہے،ایک معبود مان کر صفات میں شریک کرے کہ عبادت کے لائق تو ایک ہی ہے،مگر ہوسکتا ہے کہ نیچے اس کے بہت سے معبود ہوں کوئی بیٹا دینے والا کوئی رزق دینے والا کوئی صحت دینے والا،کوئی نعمت کا اوتار کوئی مصیبت کا اوتار اس طرح سے مختلف اوتار ہوں جن میں اللہ حلول کئے ہوئے ہوں،اوراس نے اپنے اوتاراور پیکر بنادیئے ہوں،تو ذاتِ بابرکات ایک ہی ہے مگراس کے جومختلف کمالات ہیں ان کے جلوں نے دوسروں کومعبود بنادیا،یہ شرک جلی نہیں بلکہ شرک خفی ہوگا۔اورایک یہ ہے کہ ذات میں بھی آدمی شرک نہ کرے،صفات میں بھی شرک نہ کرے،عبادت میں شرک کردے،اگر چہ یوں کہے کہ اللہ ایک اور یکتا ہے،مگر جب عبادت کرنے بیٹھے تو کسی بت کوسامنے رکھ لے کہ یہ ہمیں اللہ تک پہنچانے والی چیز ہے،کسی تصویر کو سامنے رکھ لے کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کرنے والی ہے تو یہاں ذات وصفات میں شریک نہیں کیا مگر عبادت میں شریک کردیا،اس کا بھی رد کیا جائے گا یہ شرک خفی ہے۔اورایک شرکِ صوری ہے کہ حقیقۃً شرک نہیں مگر صورۃً شرک ہے اس سے بھی بچنا پڑے گا،جیسے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہ کسی میدان میں نماز پڑھتے تھے،چونکہ مسئلہ ہے کہ سترہ رکھ لیا جائے تا کہ لوگ اس سے باہر کو گزریں اندر سے نہ گزریں تو وہ ایک پتھ رکھ لیتے تھے،مگر پتھر کو ناک کی سیدھ پر نہیں رکھتے تھے کبھی دائیں مونڈھے کے مقابلے میں کبھی بائیں مونڈھے کے بالمقابل رکھتے تھے،لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے بیچوں بیچ کیوں نہیں پتھر رکھ لیا،فرمایا ناک کے مقابل رکھوں گا تو صورت ایسی بن جائے گی،جیسے میں اس پتھر کی پوجا کررہا ہوں میں صورت شرکِ سے بھی بچتا ہوں،اگر چہ میرا قلب شرک سے پاک ہے مگر میں صورت بھی ایسی نہیں بنانی چاہتا کہ شرک پیدا ہو تو یہ شرک صوری ہے شریعت نے اس کو بھی دفع کیا ہے،اورایک شرک ابہامی ہے کہ وہموں میں گزرجائے کہ فلاں آدمی شرک کررہا ہے اس سے بھی روکا گیا ہے،اوروہ یہ ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے،اورنیت یہ ہے کہ میں مخلوق کو دکھلاؤں کہ میں بہت بڑا نمازی ہوں اورعبادت گذار ہوں یہ بھی فی الحقیقت شرک ہے کہ یہ اللہ کی عبادت نہیں ہے بندوں کی عبادت ہے،حالانکہ ظاہر میں کوئی شرک نہیں ہے اس کے دل میں ہے،شریعت نے اس کو بھی رد کیا ہے کہ توحید میں اس سے بھی خلل پڑے گا۔

اورایک اس سے بھی زیادہ دقیق شرک ہے وہ یہ کہ نہ ذات میں شرک مانتا ہے نہ صفات میں مانتا ہے نہ عبادت میں مانتا ہے نہ شرک کی صورت پیدا کرتا ہے نہ دل کے اندر وہم ہے کہ دوسروں کو دکھلانے کیلئے عبادت کرے مگر پھر بھی شرک کا اندیشہ ہے،اوروہ یہ کہ آدمی نماز پڑھ رہا ہے کوئی آدمی سامنے نہیں کہ یوں کہا جائے کہ دکھلانے کے لئے پڑھ رہا ہے،لیکن دل میں یہ خیال ہے کہ ایسی نماز پڑھ رہا ہوں کہ شاید ہی کسی نے پڑھی ہو مجھ سے بڑا کون عبادت گذار ہے،یہ عجیب ہے،یعنی اپنے نفس کو دکھلاتا ہے کہ میں بڑا عابد ہوں زاہد ہوں فرمایا: یہ بھی شرک میں داخل ہے،عبادت کرتے وقت یہ وہم نہ آنا چاہئے،کہ میں کوئی بڑی عبادت کررہا ہوں،تو ناز تفاخر

اور اتراہٹ اس کے اوپر نہ ہو، اگر اتراہٹ پیدا ہوئی اور آدمی یہ سمجھا کہ میری عبادت بڑی ہے اور دوسرے کی حقیر ہے تو یہ کبر پیدا ہو گیا اور توحید کے ساتھ کبر جمع نہیں ہوتا، توحید کے معنی یہ ہیں کہ کبریائی اور عظمت صرف ایک ذات کے لئے مان رہا ہے، اپنے اندر کوئی کبر اور خودی نہیں ہے، غرض توحید کا کمال حاصل نہیں ہو سکتا جب تک شرک کی تمام اقسام نہ رد کر دی جائیں، تو حق تعالیٰ نے روکا کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے بتوں کو کچھ نہ کہو، اپنے رب کی عبادت کئے جاؤ، تو انبیاء علیہم السلام جیسے اپنے رب کی عبادت کے لئے آتے ہیں، ویسے غیر اللہ کی عبادت کو روکنے کے لئے بھی تو آتے ہیں، اگر وہ نہیں روکیں گے تو تبلیغ آدھی رہ جائے گی، تو ممکن تھا کہ آپ کے دل میں یہ خیال گذر جائے کہ بس اتنی سی تو بات ہے میں ان کے بتوں سے کوئی تعرض نہیں کرتا، میں اپنے معبود کی تبلیغ کئے جاؤں گا، چلو فتنہ ختم ہو جائے گا، حق تعالیٰ شانہ نے روکا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اثبات وحدانیت کے ساتھ ساتھ نفی شرک کے لئے بھی آئے ہیں، یہ تو کرنا پڑے گا، اور آپ ان سے ذرا بھی نہ دبیں، یہ اگر نہیں مانتے تو نہ مانیں ماننے والے مانیں گے اگر یہ دس نہیں مانتے تو ہزار پیدا ہوں گے جو آپ کی بات کو مانیں گے، آپ گویا یہ سمجھتے ہیں اگر انہوں نے مان لیا تو گویا مشن کامیاب ہو گیا اور اگر انہوں نے میری بات کو نہ مانا تو گویا ناکامی ہوئی، آپ کسی حالت میں ناکام نہیں ہیں، اگر یہ چند ناہنجار نہیں مانتے تو ان کی نسلوں میں ایسے لوگ آئیں گے جو آپ کے کلمہ کو مانیں گے، آپ اسی قوت سے شرک کا رد بھی کریں اور توحید کا اثبات بھی کریں اور فرمایا: ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ آپ اس بارے میں ان کی قطعاً اطاعت نہ کریں کہ آپ ذرا دھیمے ہو کر چلیں، آپ اسی طرح قوت سے رد شرک کریں جس قوت سے آپ اثباتِ وحدانیت کرتے ہیں، تو آپ ہرگز ان تکذیب کرنے والوں اور جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کریں، یہ ان کی ایک چال ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ کو تھوڑی دیر کے لئے ردِ شرک سے روک دیں اور جب رک گئے تو ان کا مقصد پورا ہو گیا، اور یہ کہ آپ کو مان لیں یہ کبھی نہیں ہو گا، تو آپ اپنے مشن میں ناکام رہ جائیں گے، یہ کامیاب ہو جائیں گے ان کو کامیاب نہ ہونے دیں آپ اپنے مشن کو کامیاب بنائیں اور قطعاً اس کی پرواہ نہ کریں کہ یہ مانتے ہیں یا نہیں۔

اندازِ تفہیم......مگر ہاں جو کچھ بھی آپ فرمائیں وہ رحمۃ للعالمین کی شان سے فرمائیں یعنی کوئی سخت کلامی درشت کلامی نہ ہو، پیار اور محبت سے برائی کو برائی اور بھلائی کو بھلائی واضح کر دیں اور شفقت کے ساتھ انہیں سمجھائیں، مگر شفقت کے ساتھ سمجھانے میں دونوں چیزیں آنی چاہئیں، جن خرافات میں یہ پڑے ہوئے ان کی برائی بھی آپ سمجھا دیں اور جس نیکی کی طرف یہ نہیں آرہے اس کی بھلائی بھی آپ سمجھا دیں، جب دونوں چیزیں سمجھائیں تب یہ آئیں گے اور اگر آج یہ نہیں آتے تو کل کو آئیں گے کل کو نہیں آئیں گے تو پرسوں کو آئیں گے نہیں آئیں گے تو ان کی نسلیں آئیں گی، آپ ہر صورت میں کامیاب ہیں اس لئے آپ اپنے مقصد کو مضبوطی کے ساتھ آگے چلائیں، قطعاً ان کی اطاعت نہ کریں، یہ تو ایک چال سے آپ کو اپنے مقصد سے ہٹانا چاہتے ہیں اور ڈھیلا بنانا

چاہتے ہیں تا کہ اپنے لئے نہ ہولیکن ایک آڑل جائے گی کسی کی پرواہ نہ کریں۔ ﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ﴾ یہ تو یوں چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے پڑ جائیں تو یہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں اور وہ ظاہری رواداری کر رہے کہ میل ملاپ قائم رکھو، حق و باطل کے امتیاز کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تو انبیاء علیہم السلام اس لئے نہیں آتے کہ ظاہر داری کا میل میلاپ کرلیں وہ تو حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھانے کے لئے آتے ہیں۔ اس کے بعد خصوصیت سے فرمایا کہ کسی حلاّف کی ہرگز اطاعت نہ کریں، جو غلط قسمیں کھا کھا کر اپنے دعوے کو ثابت کرے، اور مہین و بے وقعت ہو، خود قوم کے اندر بھی اس کی کوئی حیثیت نہ ہو، ہماز عیب چین ہو اور نکتہ چین ہو، چغل خور ہو ہر خیر کا دروازہ بند کرنے والا بھی ہو، بہت اُجڈ اور گنوار بھی ہو اور زنیم بھی ہو اور اوپر سے اولاد اور دولت کی کثرت سے اس کے اندر کبر و رعونت بھی آچکا ہو، اس کی تو آپ بالکل اطاعت نہ کریں، وہ تو محض ظاہر داری کے لئے اور آپ کو آپ کے راستے سے ہٹانے کے لئے ایک چال چل رہا ہے تو آپ کو کسی چال میں آنے کی ضرورت نہیں، آپ تو اللہ کے صریح حکم کو پہنچاتے رہیں۔

رسول خدا کو مجنوں کہنے والے کی جنگ بدر میں حذیفہؓ کی تلوار سے ناک کٹ گئی...... اور یہ اس کی حالت ہے کہ: ﴿اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ جب اللہ کی کوئی آیت پڑھی جاتی ہے تو کہتا ہے کہ یہ تو وہی لکیر کے فقیر ہیں، جو پچھلی غلط باتیں آگئی ہیں جو سارے نبی کہتے چلے گئے ہیں یہ بھی وہی کہنے والے ہیں نہ انہیں عقل سے کوئی سروکار ہے نہ دنیا کی ترقی کو دیکھتے ہیں، نہ تمدن کو دیکھتے ہیں، بس انہیں تو ایک رٹ لگی ہوئی ہے کہ ایک اللہ کو ایک مانو اور اللہ کی ہی عبادت کرو، نہ تمدن کا خیال ہے نہ دنیا کی ترقیات کا خیال ہے یہ تو باتیں کیا کرتے ہیں، پہلے بھی کرتے آرہے ہیں، یہ بھی کر رہے ہیں، یہ سب عیاذاً باللہ بھولی بھولی سی باتیں ہیں۔ اخیر میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ﴾ خرطوم سُونڈھ کو کہتے ہیں، ہاتھی اور خنزیر کی ناک کو خرطوم کہتے ہیں ہر جانور کی ناک کچھ نہ کچھ اوپر کو اٹھی ہوئی ہوتی ہے، انسان کی ناک بھی نہایت خوشنمائی کے ساتھ اوپر کو اٹھی ہوئی ہے، لیکن ہاتھی کی ناک سب سے زیادہ نیچے کو لٹکی ہوئی ہوتی ہے، گویا بالکل زمین پر ہی ہوتی ہے، اور ایسے ہی خنزیر کی ناک بھی پچکی ہوئی ہوتی ہے، اُبھری ہوئی نہیں ہوتی ناک ہی عزت کی جگہ ہے، تو ہاتھی چونکہ متکبر ہوتا ہے تو اللہ نے اس کی ناک نیچی کردی، اور خنزیر چونکہ بد جانور ہے اس لئے اس کی ناک نیچی کردی، تو ناک نیچے ہونا ذلت کی طرف کنایہ ہوتا ہے، تو فرمایا اس کا جو خرطوم ہے، بڑی اونچی ناک لئے پھرتا ہے، اسی پر ہم ضرب لگائیں گے اور اس کی ہم نے ناک نیچی کرنی ہے۔

چنانچہ جنگِ بدر کے اندر حضرت حذیفہؓ کی تلوار اس ولید ابن مغیرہ کے ناک کے اوپر لگی اور اس کی ناک کٹ گئی، پھر اس نے سینکڑوں علاج کروائے کہ کسی طرح اچھی ہوجائے، مگر اس کے اندر کیڑے پڑے اور بدبو ہوگئی، اور اسی میں مرگیا، تو حق تعالیٰ نے فرمایا اس کی تو ناک پر ہم نے ضرب لگانی ہے اس واسطے کہ یہ ناک ہی

اسے لئے پھر رہی ہے، یہ ظاہری عزت کا دعویٰ یہی اسے بے چین کئے ہوئے ہے، تو اسی عزت کو پامال کرنا ہے اور وہ یہ کہ اس متکبر کی ناک نیچی کرنی ہے، چنانچہ ناک پر ہی بنی اور ناک ہی کے مرض سے دنیا سے گیا۔

انبیاء علیہم السلام کی اتباع میں دنیا و آخرت میں عزت اور نافرمانی میں ذلت...... اس سے گویا معلوم ہوگیا کہ متبعینِ انبیاء علیہم السلام کے درجات دنیا میں بھی بلند ہوتے ہیں، اور آخرت میں بھی اور مکذبین انبیاء علیہم السلام کے درجات دنیا میں بھی ختم کردیئے جاتے ہیں، اور آخرت میں بھی ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی، آج نہ ابوجہل کا نشان ہے نہ ولید ابن مغیرہ کا نشان ہے، نہ اخنس بن شریق کا نشان ہے نہ اسود بن یغوث کا نشان ہے، تو دنیا سے بے نشان ہوکر مٹ گئے، اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ پاک زبانوں پہ الگ، قلوب میں الگ، دماغوں میں الگ، اور عرش پہ الگ، فرش پہ الگ، تو انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے جیسے خلفاء اربعہ ہیں، حضرات صحابہ کرامؓ ہیں، آج ان کا نامِ نامی آجاتا ہے تو رضی اللہ عنہ کہتے کہتے زبانیں تھک جاتی ہیں، اور مکذبین انبیاء علیہم السلام کا نام آتا ہے تو لوگ ان پر لعنت بھیجتے ہیں، تو متبعین انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھی باعزت تھے اور آخرت میں بھی، اور مکذبین انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھی پامال اور آخرت میں بھی پامال، کسی جگہ بھی کوئی ان کی وقعت وعزت نہیں ہے۔ پھر میں کہتا ہوں کہ اگر مسلمان دنیا میں ابوجہل کی وقعت نہیں کرتے تو کیا کفار میں کوئی اس کی وقعت کرنے والا؟ کوئی ولید ابن مغیرہ کو سراہنے والا یہود ونصاریٰ میں کسی اور مذہب میں؟ کہیں موجود نہیں، جو بھی کہے گا یہی کہے گا انہوں نے بڑی غلط حرکت کی، مسلمان ان پر لعنت بھیج دیں گے، دوسرے کہیں گے بڑی غلط حرکت کی، غرض انبیاء علیہم السلام کی اطاعت میں عزت ہے اور ان کی تکذیب میں ذلت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود نے مقابلہ کیا تو مچھر سے ختم کرادیا گیا، آج اس کا نشان موجود نہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام امام للناس ہیں، ہر دل میں وقعت اور ہر دل میں عظمت ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ پر فرعون ہے، آج اس کا نشان موجود نہیں، اور اگر کہیں تذکرہ ہے تو لعنت سے یاد کیا جاتا ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نامِ پاک زبانوں پہ آتا ہے تو علیہ الصلوٰۃ والسلام پڑھا جاتا ہے، الغرض اوپر سے نیچے تک یہی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین صحابہ کرامؓ اس کے بعد تابعینِ کرام ہیں، اس کے بعد تبع تابعین کرام ہین اس کے بعد اہل اللہ، حضراتِ صوفیاء کرام، حضراتِ علماء کرام حضراتِ فقہاء کرام، حضراتِ مجتہدین عظام ایک ایک شخصیت کا نام آتا ہے تو رحمۃ اللہ علیہ کہتے کہتے زبانیں تھکتی ہیں، اور مکذبین میں سے کسی کا نام آتا ہے تو لعنۃ اللہ علیہ کہنے کے لئے زبانیں سوکھتی ہیں، تو یہ فرق ہے۔

عزت اور بڑائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے...... الغرض عزت اور بڑائی کا سرچشمہ اللہ کی ذات پاک ہے، اس کے بعد عزت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت میں حضرات انبیاء علیہم السلام کو بنایا ہے، اور اس کے بعد ایمان والوں کو سرچشمہ بنایا، جو تصدیق کرنے والے ہیں، جس کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ

وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ① ”عزت اللہ کی ہے اور اس کے رسول کی ہے اور ایمان والوں کی ہے اور منافقین اس عزت کو نہیں جانتے۔“ اور ایک جگہ انتہائی اصلیت کو بھی فرمایا کہ: ﴿فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ② ”عزت صرف ایک اللہ کی ہے“ جو اس سے وابستہ ہو گیا اسی میں عزت آ گئی سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام وابستہ ہیں تو سب سے زیادہ ان کی عزت کی ہے، ان کے بعد ان کے اصحاب وابستہ ہیں ان کی عزت ہے۔

اب صحابہ کرامؓ میں ایک ایک نام لیں، صدیقؓ کا نام لیں، فاروقِ اعظمؓ کا نام لیں، عثمانِ غنیؓ کا نام لیں، علی المرتضیٰؓ کا نام لیں، ایک ایک کا نام آنے پر دل عقیدت وعظمت سے جھک جائیں گے، جس کو نسبتِ نبوی علیہ السلام مل گئی، عقیدت وعظمت قائم ہو گئی، اہلِ بیت کرام ہیں انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہے اس کی وجہ سے ان کی محبت دل میں ایمان کا درجہ رکھتی ہے، آج اگر کوئی انہیں خدانخواستہ برا کہے تو یقیناً اس کے ایمان میں خلل ہے، اس شخص کو اپنے ایمان کی اصلاح کرنی چاہئے جو اپنے دل میں اہل بیت سے محبت نہیں رکھتا، یا عظمت نہیں رکھتا، تو یہ نسبت ہی تو ہے۔

جتنی نسبت قائم ہو گی اسی نسبت سے عظمت قائم ہو گی، نسبی نسبت قائم ہے وہ عظمت کا ذریعہ ہے، روحانی نسبت قائم ہے وہ عظمت کا ذریعہ ہے، بہر حال اس آیت نے بتلا دیا کہ مکذبین کی کوئی وقعت نہیں، نہ عند اللہ نہ عند الناس، اور مصدقین کی وقعت عند اللہ بھی ہے، اور عند الناس بھی ہے، اس واسطے ہر ایک اپنے دل کو ٹٹولے کہ میں اپنے دل میں اللہ ورسول کی عزت رکھتا ہوں یا نہیں اگر رکھتا ہے تو وہ خوش ہو، اگر نہیں رکھتا یا کمی ہے تو اس کمی کو دور کر دے، اپنے قلب کے اندر عزت عظمت بڑھائے، اور اپنے ایمان کو تازہ کرے تا کہ دنیا و آخرت میں اس کو درجات ملیں۔

① پارہ: ۲۸، سورۃ: المنافقون، الآیۃ: ۸. ② پارہ: ۵، سورۃ: النساء، الآیۃ: ۱۳۹.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ○ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ○ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ○فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ○ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ○ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ○ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ○ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ○ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ○بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ○ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ○قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ○قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ○ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ○ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ ①

بزرگانِ محترم! کفارِ مکہ کی سرکشیوں اور کا ذکر چل رہا ہے اور ادھر سے حضرتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر وتحمل کا ذکر ہے،تو ان مشرکین کو عبرت دلانے کے لئے پچھلی امتوں کا ایک واقعہ حق تعالیٰ شانہ نے بیان فرمایا، گویا اس واقعہ کو سامنے رکھ کر یہ عبرت پکڑیں، اور اس کا تجزیہ کریں اس کے اجزاء الگ الگ کر کے اپنے واقعات پر منطبق کریں، پھر اندازہ کریں کہ یہ اسی بُری راہ پر چل رہے ہیں جس بری راہ پر یہ لوگ چلے اور عذاب میں مبتلا ہوئے،تو تمہارے اوپر بھی عذاب آئے گا اور اسے پھر روکنے والا کون ہوگا؟

اس دنیوی عذاب سے قیاس کرو کہ آخرت کا عذاب کتنا شدید ہوگا اور اسے کون روکنے والا ہے تو اس کی ایک مثال وہ واقعہ سنا کر بیان فرمائی ہے۔اس لئے کہ قرآن کریم میں جو جو واقعات پچھلی امتوں کے بیان کئے گئے

① پارہ: ۲۹، سورۃ:قلم، ۱۷ تا ۳۳۔

ہیں وہ محض قصہ اور کہانی نہیں ہیں، یا محض تاریخ بیانی نہیں ہے، بلکہ وہ عبرت دلانے کے لئے بیان کئے جاتے ہیں، جیسا کہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَى﴾ ① یہ جو کچھ ہم واقعات بیان کرتے ہیں یہ عبرت کے لئے ہیں تا کہ اپنے کو ان پر قیاس کر کے وہی نتیجہ اپنے لئے نکالو جو ان کے حق میں نکل چکا ہے۔

فوائد تمثیل و واقعہ...... اور یہی انسان کی فطرت ہے کہ وہ اصول سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا واقعات سے متاثر ہوتا ہے، مثال سے آدمی کو جتنا جلد سمجھ میں آتا ہے، بہت سی معنوی اور باریک چیزیں جو دلائل سے سمجھنے میں نہیں آتیں، وہ مثال سے بہت جلد سمجھ میں آجاتی ہیں اور معنوی امور کو جب آدمی محسوس چیزوں پر قیاس کرتا ہے چونکہ محسوسات آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں تو معنویات کو بھی جلد سمجھ جاتا ہے۔

مجھے اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے ہاں تمثیل بہت زیادہ تھی، اور بڑے بڑے دقیق امور کو معمولی مثالوں سے ایک جاہل سے جاہل کے ذہن میں اتار دیتے تھے، تو حضرتؒ کی مجلس نشینوں میں ایک شخص اللہ دین تھا، قصائیوں میں سے تھا، مگر آدمی فہیم تھا اور اسے دین کی سمجھ تھی۔ ایک دن حضرتؒ کی مجلس تھی، گرمی کا زمانہ تھا ایک شخص پنکھا جھل رہا تھا اور یہ خود پنکھا جھلنے والوں میں ہے، اس نے سوال کیا۔ حضرت! یہ جو بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ میت کو اہل اللہ کے قریب دفن کرنا چاہئے اس سے کیا فائدہ؟ اس لئے کہ اگر اس دفن ہونے والے کے پاس نیکیاں ہیں چاہے میدان میں دفن کر دو وہاں بھی اس کی نیکیاں کام آئیں گی، اگر اس کے پلے عمل صالح نہیں ہے تو کہیں بھی دفن کر دیں اس کی بدعملی اس کے سامنے آئے گی، تو اس کا کیا فائدہ ہے کہ اہل اللہ کے پاس دفن کیا جائے؟ اس سے کوئی اعمال بدل جاتے ہیں؟

یہ اس نے ایک سوال کیا، اب سوال کرنے والا محض ایک جاہل اور عامی آدمی ہے، اور عالم برزخ کا سوال کر رہا ہے، اور عالم برزخ کے ایک بڑے دقیق مسئلہ کا اب اگر دلائل سے سمجھایا جاتا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا، حضرت نے خاموشی اختیار فرمائی، اور تھوڑی دیر کے بعد وہ پنکھا تو جھل ہی رہا تھا فرمایا: میاں اللہ دین! آپ پنکھا کسے جھل رہے ہو، اس نے کہا حضرت آپ کو، فرمایا ان مجلس والوں کو تو نہیں جھل رہے عرض کیا، نہیں صاحب! میں انہیں کیوں جھلتا نہ یہ میرے پیر نہ میرے استاذ؟ میں تو آپ کو جھل رہا ہوں ارشاد فرمایا انہیں بھی ہوا لگ رہی ہے یا نہیں؟ کہا جی ہاں ہوا تو لگ رہی ہے فرمایا: یہ تمہارے سوال کا جواب ہے اس لئے اہل اللہ کے پاس دفن کرتے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ہوائیں چلتی ہیں تو مقصود وہ ہوتے ہیں مگر آس پاس والوں کو بھی ہوا لگتی ہے تو رحمت کے نیچے سب آجاتے ہیں، برکات سے وہ بھی مستفیض ہوتے ہیں۔

تو مسئلہ بہت دقیق تھا مگر ایک معمولی مثال سے اس کے ذہن میں بات بیٹھ گئی، اور اگر دلائل سے سمجھاتے تو

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ: یوسف، الآیۃ: ۱۱۱.

اسے خاک سمجھ میں نہ آتی اس کا ذہن ہی اس قابل نہیں تھا، تو بعض دفعہ مثال کے ذریعہ سے مسئلہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے اور جب مثال اپنے معاملہ پر منطبق ہو جاتی ہے تو آدمی عبرت بھی پکڑتا ہے۔

اصحاب الجنۃ کا واقعہ...... اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے ایک مثال بیان فرمائی اور مثال بھی محض فرضی نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے، تو واقعہ پر جو ثمرہ مرتب ہوا چونکہ تمہارا واقعہ بھی ویسا ہی ہے تو وہی ثمرہ تمہارے اوپر بھی مرتب ہوگا اور وہ واقعہ اصحاب الجنۃ کا ہے، یعنی باغ والوں کا۔ یمن کے دارالسلطنت صنعاء سے تین میل کے فاصلہ پر یہ باغ تھا، یہ ایک شخص کا باغ تھا جو نیک اور صالح آدمی تھا، اور بہت ہی بہترین باغ تھا اس کا ''باغ ذروان'' نام تھا، قسم قسم کے پھل فروٹ اور جگہ جگہ انگوروں کی بیلیں پھیلی ہوئی، اور بڑے میدان میں وہ کھیتی بھی کرتا تھا، یوں غلہ بھی ہوتا تھا تو ہزار ہا روپے کا فائدہ تھا، اس باغ کی وجہ سے بہت مالدار آدمی تھا۔

اس کا طریقہ یہ تھا کہ جب پھل توڑتا تو دسواں حصہ اسی وقت غرباء پر تقسیم کر دیتا تھا، اس کے بعد جب کھیتی کا ٹتا تو کاٹنے میں جتنا غلہ وصول ہوتا ادھر ادھر کا بکھرا ہوا وہ سب غریبوں کا تھا وہ خود نہیں اٹھاتا تھا، کھلیان میں جتنا جمع ہو گیا وہ لے لیتا تھا، اور جو کھیتوں میں بکھر گیا اس کی غرباء کو عام اجازت تھی کہ وہ لے جائیں، چنانچہ وہ اٹھا کے لے جاتے تھے، پھر جب غلے کو گھر لاتا تھا تو پھر اس میں سے دسواں حصہ غرباء کے لئے نکالتا تھا، اس سے ہزاروں غریب پلتے تھے، پھر گھر میں جب کھانا پکتا تو جتنی روٹیاں پکتیں اس میں سے دسواں حصہ پھر غریبوں کو تقسیم کرتا ،غرض ہر جگہ اس نے عشر اپنے اوپر لازم کر رکھا تھا، میوے کو توڑتے وقت، کھلیان میں پہنچتے وقت، جمع کرتے وقت گھر لاتے وقت، اس کو پکاتے وقت، ہر ایک موقع پر وہ غریبوں کا دسواں حصہ نکالتا تھا، جس سے ہزاروں غریب پلتے تھے اس وجہ سے ہزاروں فقراء اس کے باغ کے اردگرد جمع رہتے تھے، اور جانتے تھے کہ بس یہ ہمارا مائی باپ ہے اور ہمیں اس کے ذریعہ سے ہزاروں روپے کا فائدہ ہے منوں غلہ اور منوں پھل کا فائدہ ہے، تو جو پھل وہ کبھی بھی خرید کر نہیں کھا سکتے تھے وہ ہر قسم کے پھل انہیں مفت میں مل جاتے تھے، بہر حال یہ اس شخص کا طریقہ تھا۔

غرباء کا حصہ نہ دینے کا فیصلہ اور منجھلے بھائی کا مشورہ...... اس شخص کا انتقال ہو گیا، اس کے پانچ بیٹے تھے، انہوں نے باہم یہ سوچا کہ بہت سا ہمارا مال یہ غریب کھا جاتے ہیں، اگر سارا مال گھر میں جمع رہے تو کتنا مال زیادہ ہوگا، لاکھوں روپے مسافر مسکین لے جاتے ہیں اسے کسی طرح سے بند کرنا چاہئے یہ مسکین گویا ہمارے گلے پڑ گئے تو بھائیوں میں باہم بات چیت ہوئی تو منجھلے بھائی نے کہا کہ بھائی! یہ مت کرو، خیرات سے نفع ہی نفع ہوتا ہے، اول تو یہ کہ غرباء کا مال میں حق بھی ہے، ایک تو حق واجب ہے جیسا آپ نے زکوٰۃ دی یا صدقہ واجبہ دیا یا صدقہ فطر دیا یا قربانی کی، یہ تو حق واجب ہے، لیکن حدیث میں فرمایا گیا: ''اِنَّ فِیْ مَالِ الْمَرْءِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ'' ① آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی غریبوں کے حقوق ہیں، حق تعالیٰ شانہ نے ایک مال کے اندر

① السنن للترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ ج:٣ ص:٦٧.

ہزاروں غرباء کو شریک کیا ہے یہ ان کا فضل ہے کہ اس آدمی کو غریبوں کو دینے کا ذریعہ بنادیا ہے، اگر ابتداً ہی حق تعالیٰ برابر تقسیم فرماتے اور کوئی امیر نہ ہوتا، تو حق تو سب کو پہنچ جاتا، مگر امراء کو جو اجر و ثواب کا فائدہ پہنچتا تھا اس سے وہ محروم ہو جاتے اس لئے ایک ایک امیر کو سینکڑوں غریبوں میں مال تقسیم کرنے کا ذریعہ بنادیا گیا، تاکہ حصہ بھی برابر ہو جائے اور ساتھ میں اجر و ثواب بھی مل جائے۔

اور اس کے ساتھ ایک شخص کو ہزاروں دعا گو بھی مہیا ہو جائیں گے اس لئے کہ جتنے غرباء کو فائدہ پہنچے گا وہ دعائیں مانگیں گے، ان کی دعاؤں سے اس کے مال میں اور برکت ہوگی، تو دنیا بھی اس کی بڑھے گی اور آخرت بھی بڑھے گی، تو غریب کے لئے امیر کو ذریعہ بنا کر امیر کے فائدے بہت کئے کہ بہت دعا گو مہیا کئے، دنیا میں اس کو رزق کی وسعت دی، آخرت میں اجر کا سامان کیا فرض کی ادائیگی کی توفیق دی تو اس ایک طریقہ سے سینکڑوں فرائض ادا ہوئے سینکڑوں برکات ہوئیں، اس واسطے حق تعالیٰ نے اوپر سے ہی برابر حصے نہیں بانٹ دیئے بلکہ امراء کو حکم دیا کہ تم برابری اور توازن کے ساتھ تقسیم کرو تاکہ تمہارے لئے اجر ہو، اور تمہارا فرض ادا ہو۔

تو ان بھائیوں نے ادھر خیال نہ کیا کہ اللہ نے ہمیں خیر کا ذریعہ بنایا ہے ہمیں مفتاح للخیر بنایا ہے، ہم خیر کی کنجی بنے ہوئے ہیں، ہم ذریعہ بنے ہوئے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ ہمارا واسطہ ڈالے بغیر دے دیتے، تو ان کو تو حق مل جاتا ہم محروم رہ جاتے۔ تو کہا کہ ایسی صورت کرو کہ غریبوں کا ایک جتھہ اور مجمع ہو جاتا ہے اور ہمارا بہت سا مال چلا جاتا ہے تو یہ نہیں ہونا چاہئے اس کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ جب پھل کاٹنے کا وقت آئے تو بالکل سویرے سویرے فقیروں کا مجمع ہونے سے پہلے پہلے جا کر پھل کاٹ کر گھر لے آؤ، اس لئے کہ اگر وہاں جمع ہو گئے تو پھر شرما شرمائی میں کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا، جب پچاسوں آدمی مانگیں گے تو آدمی شرمائے گا، تو وہی کی وہی بات پھر ہوگی، اس لئے سویرے جا کر پھل کاٹ لو اور وہ تمام پھل دانے وغیرہ لاد کر اپنے گھر لے آؤ، یہاں گھر میں رکھ لیں گے یہاں کوئی آئے گا نہیں۔

اور اگر کوئی آئے گا بھی تو دروازے پر کوئی آدمی بٹھلا دیں گے اسے کہہ دیں گے کہ اگر کوئی فقیر آئے تو اسے دھکے دے دو، اور کہہ دیں گے تمہارا حق اس میں کچھ نہیں ہے اس طرح سے ہمارا مال بچ جائے گا، تو منجھلے بھائی نے کہا یہ مناسب نہیں ہے تم اللہ کی تسبیح کرو، تسبیح کا مطلب یہ کہ اس کی پاکی ثابت کرو یعنی اس پر بے اعتمادی کا اظہار مت کرو اس لئے کہ اگر تم نے غریبوں کا حق مار دیا گویا اس کا منشا اللہ پر بے اعتمادی ہے کہ تمہارا لے لیا اور وہ تمہیں کچھ نہیں دے گا، یہ حق تعالیٰ پر بے اعتمادی کا اظہار ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ کوئی اس پر بے اعتمادی کا اظہار کرے، ہر صورت وہی اعتماد اور بھروسہ کے لائق ہے، اس واسطے یہ منصوبہ اس کی پاکیزگی کے خلاف ہے، تو تم تسبیح و تہلیل میں لگو اور اللہ پر بے اعتمادی نہ کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صدقہ دینے سے مال میں کمی نہ آنے کی قسم...... حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تین باتیں بیان فرمائیں اور حلف اٹھا کے بیان فرمائیں، اور قسم اس لئے کھائی کہ

ظاہری طور پر وہ چیز عقل میں نہیں آتی جو آپ نے بیان فرمائی اس لئے قسم کھا کے فرمایا کہ تمہاری عقل میں آئے نہ آئے مگر یہی ہوگا اس لئے اطمینان کرلیں قسم کھاتا ہوں ایک یہ کہ: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ ① صدقہ دینے سے مال میں کبھی نقصان نہیں ہوگا، مال میں کبھی کمی نہیں آئے گی، ظاہر میں تو اس کے خلاف ہے، اس لئے کہ جب آپ نکال دیں گے تو وہ کم تو ہوگیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ کمی نہیں آئے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ﴾ ② جس مال میں سے جتنا خرچ کروگے جگہ خالی ہوگی، اللہ اس کو بھریں گے، ضرور بھر کر رہے گی یہ نہیں ہوسکتا کہ بندہ محروم کردیا جائے، تو ظاہر میں تو مال کم ہورہا ہے، مگر حقیقت میں بڑھ رہا ہے، نہ صرف اسلئے بڑھ رہا ہے کہ اجر وثواب ملے گا وہ تو آخرت کا بڑھنا ہے، مگر دنیا میں بھی خالی شدہ جگہ پر مال آئے گا اور جگہ پُر ہوگی، یہ وعدہ خداوندی ہے کہ خرچ شدہ مال کا خلف آئے گا، ہمارے وعدے پر اطمینان رکھو اور یقین رکھو، غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف اٹھا کر بیان فرمایا۔

صدقہ دینے سے کمی بیشی کا مفہوم...... آدمی جب صدقہ نہیں دیتا یا خرچ نہیں کرتا تو ظاہر میں تو مال بڑھ رہا ہے کہ کسی کو نہیں دیا، گھر ہی میں آرہا ہے، لیکن وہ بڑھنا بالکل ایسا ہے جیسے آدمی کے بدن پر ورم چڑھ جائے، تو ظاہر میں تو وہ پہلوان بن رہا ہے، بہت جلد موٹا تازہ ہورہا ہے مگر حقیقت میں یہی موت کا پیغام ہے، چند دن کے بعد یہ ریت کی دیوار اس طرح بیٹھے گی کہ نہ وہ رہے گا بلکہ اس کی ہڈیاں تک ختم ہوجائیں گی، اس لئے کہ وہ جو موٹاپا ہے وہ ورم اور بیماری کا ہے، اصلی صحت کا موٹاپا نہیں ہے، تو صدقہ نہ دینے سے جو مال بڑھتا ہے، وہ ورم رسیدہ ہے، اس کو مت یہ سمجھو کہ یہ بڑھ رہا ہے وہ ایک دن اتنا گھٹے گا کہ راس المال کو بھی لے ڈوبے گا اور صدقہ دینے سے جو مال گھٹتا ہے، اس گھٹنے کی مثال ایسی ہے جیسے آدمی بیماری کے بعد مُسہل لے لے، تو مسہل لینے سے اندر کا تمام ملبہ اور فاسدہ چیزیں نکل جاتی ہیں اور آدمی ضعیف ہوجاتا ہے، مگر یہ ضعف صحت کا پیش خیمہ ہے، ساری اَلا بلا نکل گئی، بادی بلغم چھٹ گیا، تو ظاہر میں ضعیف ہوگیا مگر حقیقت میں وہ قوی ہے، چند دن کے بعد صحت ترقی کرے گی، تو اصل قوت بڑھے گی تو مال نکالنا صدقہ دینا ایسا ہے جیسے مُسہل دے دینا کہ ظاہر میں آدمی ضعیف ہوتا ہے حقیقت میں وہ قوت کا پیش خیمہ ہے اس میں سے نہ دینا حقوق نہ نکالنا گو مال بڑھتا ہے مگر وہ بڑھنا ایسا ہے جیسا ورم آگیا، تو ورم آنے سے بڑھتا نہیں ہے بلکہ اس سے اصل بھی گھٹ جاتا ہے۔

تواضع سے رفعت پر حلفِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم...... تو اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَا تَوَاضَعَ عَبْدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ'' ③ آدمی کسی کے سامنے اللہ کے لئے جھکتا ہے، تو اللہ اسے ضرور سربلند کرتا ہے، ظاہر میں تو یہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں ذلت اختیار کررہا ہوں، دوسرے کے آگے جھک رہا ہوں، اسکی

---

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع ج: ۱۲ ص: ۴۷۴ رقم: ۴۶۸۹.
② سورة السباء: ۳۹. ③ شعب الایمان للبیهقی، فصل فی ترک الغضب وفی کظم الغیض والعفو... ج: ۶ ص: ۳۱۹

توقیر کر رہا ہوں حالانکہ میرا رتبہ ایسا تھا اور ویسا تھا، اور میں جھک گیا تو ظاہر میں تو ذلت قبول کی اور حقیقت میں یہ عزت ہے جتنا لوجہ اللہ یہ جھکے گا اتنا ہی حق تعالیٰ اسے بلند فرمائیں گے، اور جو جتنا لوجہ النفس سر ابھارتا ہے اتنا ہی اس کو زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور اسے ذلیل کر دیتے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

اس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں ‌‌‌ پستی سے ہو سر بلند اور سرکشی سے پست

کوئی اکڑتا ہے تو اسے پست کر دیتے ہیں اور کوئی جھکتا ہے تو اسے اونچا کر دیتے ہیں، میں تو مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ پہاڑ پر کبھی چڑھے ہوں تو جب چڑھتے ہیں تو جھک کر چڑھتے ہیں، اکڑ کر چڑھے تو آدمی پیچھے کو جا پڑے گا اور جب اترتے ہیں تو اکڑ کر اترتے ہیں اس لئے کہ اگر جھک کر اترے گا، تو آدمی اوندھے منہ گرے گا۔

تو یہ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اونچائی پر چڑھنا چاہتے ہو تو جھک کر چلو، اونچا پہنچتے چلے جاؤ گے اور اگر اکڑ کر چلو گے تو نیچے کی طرف آتے چلے جاؤ گے تو پستی کی طرف جاؤ گے، تو آدمی اکڑتا ہے تو گرتا ہے اور اگر جھکتا ہے، تو اسے اونچا کر دیتے ہیں۔

بہر حال یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، ظاہر میں چونکہ سمجھ میں نہیں آتی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلف اٹھا کر بیان فرمایا کہ واللہ! یہ چیز ہونے والی ہے اس کا یقین کرو، غرض منجھلے بھائی نے اِدھر توجہ دلائی اور کہا کہ تم جو فقیروں کا حق مار رہے ہو تو یہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ پر یہ بے اعتمادی کا اظہار ہو، پھر اس کا ثمرہ تمہارے حق میں بُرا نکلے۔

فقراء سے مال بچانے کے لئے اندھیرے میں تیز رفتاری..... مگر بھائیوں نے ڈرا دھمکا کے اسے دبا دیا کہ اچھی بات ہے تو بھی فقراء کی ہاں میں ہاں ملانے لگا، غرض یہ بات پختہ ہوگئی کہ صبح کو سویرے سویرے چلیں گے اور جا کے ایک دم پھل وغیرہ کاٹ کر جمع کریں گے اور سارا کچھ لے کر ایک دم گھر میں لے آئیں گے، فقیروں کے لئے دروازوں پر آدمی بٹھا دیئے تاکہ کوئی آدمی نہ آنے پائے جب صبح ہوئی تو: ﴿ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴾ تو انہوں نے اس حالت میں صبح کی کہ اپنی ضد کے اوپر بالکل اڑے ہوئے تھے، اور یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم بالکل قادر ہیں جو چاہیں کر گذریں گے، باغ ہمارا اور ہماری ملک جو ہم کریں گے کوئی اس میں رکاوٹ ڈالنے والا نہیں ہے۔

چنانچہ صبح اٹھے تو ایک دوسرے کو جلدی اٹھایا کہ چلو جلدی چلو، کہیں چاندنا نہ ہو جائے اور فقیر مسکین جمع نہ ہو جائیں، جو کرنا ہے وہ جلدی کرو، چنانچہ سویرے سویرے چلے، اور کس چال سے چلے؟ کہ صبح صبح ایک دوسرے کو پکارتے تھے کہ جلدی چلو، ایسا نہ ہو دیر ہو جائے، اور سورج طلوع ہو جائے۔ ﴿ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ○ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴾ اگر تمہیں پھل کاٹنے ہیں تو سویرے سویرے پہنچ جاؤ، ورنہ پھر ہجوم ہو جائے گا اور شرما شرمائی میں کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا، دیر ہو جائے گی، اس لئے جلدی کرو۔

حق تعالیٰ شانہٗ پر بے اعتمادی کا نتیجہ..... ﴿ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ○ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴾ تو وہ چلے جارہے تھے اور آپس میں گھسر پھسر کرتے ہوئے کہ دیکھ بھائی جلدی چلو، اِدھر سے

فقیر آتے ہیں، یہاں سے جلدی نکل جاؤ، ادھر سے فقیر آتے ہیں، جلدی نکل جاؤ، تو آپس میں ایک دوسرے کو چپکے چپکے سمجھا بھی رہے تھے، تو ایک ضد اور ہٹ دھرمی تھی، گویا وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہماری تدبیر کامیاب ہے، اور ہم اس تدبیر پر قادر ہیں کوئی ہمیں روک ٹوک کرنے والا نہیں ہے، گویا حق تعالیٰ پر انتہائی بے اعتمادی ظاہر کی، ایک تو یہ کہ اتفاقاً کوئی بات ہو جائے کہ آدمی کسی مسکین سے بچنے کے لئے جلدی چھپ کر پہنچ جائے، کہ واجب تو ادا کرتا ہی ہوں کیا ضروری ہے کہ نفل بھی ادا کروں، اتفاقاً ہو جائے تو یہ بات کمزوری کی ہوتی ہے، یا تھوڑے بہت گناہ کی ہوتی ہے، لیکن عزم باندھ کر مشورے کر کے چلنا یہ گویا حق تعالیٰ شانہٗ کا معارضہ اور مقابلہ ہے، اپنی قدرت کی داد دینا ہے کہ ہم ہی ہر طرح سے قادر ہیں جو چاہیں کر گزریں گے، تو یہاں حق تعالیٰ سے مقابلہ کی صورت پیدا ہوگئی تھی، گویا طے یہ کیا تھا کہ اللہ کی نہ چلنے دو جس طرح سے ہو اپنی چلاؤ۔ ﴿ وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ ﴾ پھل کاٹ کر لائیں گے اور ساتھ میں انشاء اللہ بھی نہ کہا، گویا اپنی تدبیر پر اتنا یقین تھا کہ یہ تک نہ کہا کہ اگر اللہ چاہے گا تو ہم کر لیں گے، تو سمجھتے تھے کہ انشاء اللہ کی بھی ضرورت نہ تھی، ہمیں پوری قدرت حاصل ہے، گویا اس میں پورا حق تعالیٰ کا مقابلہ تھا، فقط ایک گناہ ہی نہیں کر رہے تھے، گناہ کا ملزم اور اس میں حق تعالیٰ کو مانع بھی سمجھ رہے تھے، اس لئے انشاء اللہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔

جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ نہ باغ ہے نہ کچھ ہے، جلی ہوئی چیز کا ڈھیر لگا ہوا ہے، تو سمجھے کہ شاید ہم راستہ بھول گئے، یہ ہمارے باغ کا راستہ نہیں یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ ایک ہرا بھرا باغ اور پھلا پھولا باغ اور وہ بالکل مٹ جائے، تو وہاں جا کے دیکھا تو سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ ﴿ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴾ جب باغ کو دیکھا تو وہاں نہ باغ نہ درخت نہ پھل، بلکہ تمام کھیتی کچومر بنی ہوئی پڑی ہے، جیسے کھلیان میں بیلوں سے روند کر چکنا چور کر دیا جاتا ہے، تو سمجھ مین نہ آیا کہ یہ ہمارا باغ ہے، تو یہ سمجھے کہ ہم راستہ بھول گئے، لیکن جب آگے چلے تو کہا: ﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ﴾ باغ تو یہ ہمارا ہی ہے، اس کا تو وجود ہی نہیں رہا، اس کا تو نشان ہی باقی نہیں رہا، یہ کیا قصہ ہوا؟ ﴿ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴾ اب بات سمجھ میں آئی، اُسی مجھلے بھائی نے کہا میں نے کہا نہیں تھا کہ تم اللہ کی پاکی کے خلاف کر رہے ہو، تم نے بے اعتمادی کا اظہار کیا، کہ فقیر کو دے کر اللہ تعالیٰ تمہارا مال گھٹا دیں گے، حالانکہ فقیر کو دینے سے مال گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے، تو میں نے تمہیں سمجھایا تھا اور تم نے نہیں مانا، میں نے کہا تھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ پر بے اعتمادی کا اظہار یہ اس کی پاکیزگی کے خلاف ہے۔ ﴿قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِیْنَ﴾ اب سمجھ میں آیا کہ حقیقۃً ہم نے بہت بڑا جرم کیا، اور حقیقۃً ہم نے غلطی کی کہ اپنی جڑ بنیاد اکھاڑ کر پھینک دی، ذرا سی بے اعتمادی کی اور حق تعالیٰ کا مقابلہ کیا تو یہ نتیجہ سامنے آیا کہ چھوٹا موٹا نقصان نہیں بلکہ باغ کا باغ ہی اجڑ گیا، رات کو بجلی گری یا آگ برسی کہ تمام باغ چکنا چور ہو گیا، نہ درخت رہے نہ کھیتی رہی نہ دانہ رہا، کچھ بھی باقی نہیں رہا، تو ابتدا ابتدا میں تو چونکے جب مجھلے نے کہا کہ اسی دن کے لئے میں

نے تمہیں کہا تھا مگر تم نے مجھے ورغلا دیا، اور مجھے تمہاری تائید کرنی پڑی، مگر بات وہی تھی جو میں کہہ رہا تھا۔

باغ کے اجڑنے کے بعد ایک دوسرے کو ملامت...... ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ﴾
اب ایک دوسرے کو ملامت کرنی شروع کی کہ ہم نے کہا نہیں تھا؟ ایک نے کہا میں نے یہ نہیں کہا تھا، غرض اب سب ایک دوسرے پر ملامت کرنے لگے اور ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اس لئے کہ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جرائم پیشہ لوگ جب مل کر جرم کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بد سامنے آتا ہے پھر ایک دوسرے کو ملامت کرتا ہے کہ پہلا مشورہ اس کم بخت نے دیا تھا، دوسرے نے کہا میں نے دیا تھا تم نے مانا کیوں تھا؟ تیسرے نے کہا میں تو نہیں مانتا تھا مگر اس نے یہ کہا غرض ایک دوسرے پر وہ اس طرح ڈال رہے تھے مگر آخر میں سمجھ میں آیا کہ حقیقت میں ہم نے گناہ کیا ہے اور برا کیا ہے، تو اقرار کیا: ﴿قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ﴾ کہنے لگے بے شک سرکشی اور غلطی ہم سے ہی ہوئی، ہم نے ہی اللہ پر بے اعتمادی کا اظہار کیا، اسکا نتیجہ آنا ہی تھا، اب متنبہ ہوئے، ندامت ہوئی اور کہا: ﴿عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ اب ہم نادم ہیں قصور کا اعتراف کرتے ہیں اے اللہ! ہم سے غلطی ہوئی آپ معاف فرما دیں، اور جب آپ معاف فرما دیں گے تو ہمیں توقع ہے کہ ہمیں اس سے بھی اچھا باغ عطا ہوگا، اور اس سے بڑھ کر ہمارے لئے خیر ہوگی۔

ندامت و توبہ کے بعد رحمتِ حق کی توجہ...... حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ رحمت ہے کہ کتنا ہی بڑے سے بڑا جرم کر کے جب اخیر میں ندامت کا اظہار کرے پھر رحمت متوجہ ہو جاتی ہے، کبھی یہ نہیں ہوتا کہ اس پر الزام قائم کریں کہ ابھی اس کو اچھی طرح بھگت، جب ندامت ہوگئی تو گویا توبہ ہوگئی، حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ'' ① پشیمانی آجانا بس یہی توبہ ہے منفعل ہو جائے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ابھی زبان سے بھی نہیں کہا، فرماتے ہیں بس توبہ ہوگئی۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی بڑا جرم کیا اور اس کے بعد اسے ندامت ہوئی اور مغفرت کی دعا مانگنے کے لئے بیٹھا اور کہا: یَا رَبِّ! یَا رَبِّ! تو فرماتے ہیں: ''اَيَعْلَمُ اَنَّ لَهٗ رَبًّا'' اچھا یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کی پکڑ کر سکتا ہے اور جب جان گیا تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے ہم پہلے ہی مغفرت کئے دیتے ہیں اس لئے کہ یہ بارگاہِ کریمی ہے، فقط ندامت درکار ہے آدمی منفعل ہو جائے توبہ و اقرار کر لے، تو ہمارے ہاں کمی نہیں ہے ہم جو روکتے ہیں تمہاری مصلحت سے روکتے ہیں نہ اس لئے کہ ہمارے خزانے میں کوئی کمی ہے، جب معترف ہو گئے اور مان گئے مقصد پورا ہو گیا، تو پھر مانگنے سے پہلے ہم تمہیں دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ اس شخص کی مغفرت فرما دی، مگر اس نے جا کر پھر وہی گناہ کیا، مگر پھر ندامت ہوئی اور معافی مانگنے کی نیت سے بیٹھا اور عرض کیا یا رب۔ اے رب پھر وہی فرماتے ہیں: ''اَيَعْلَمُ اَنَّ لَهٗ رَبًّا'' ② اچھا

---

① المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمه احمد، ج: ۱ ص: ۱۰۴۔

② الصحیح لمسلم، کتاب التوبة، باب قبول التوبة من الذنوب وان تکررت ج: ۱۳ ص: ۳۲۱۔

یہ جان گیا اس کا کوئی رب ہے تو قبل اس کے کہ یہ مغفرت مانگے، پہلے ہی مغفرت فرما دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: اے لوگو! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے، لیکن اللہ تعالیٰ بخشتے بخشتے نہیں تھکے گا، اس لئے کہ تمہارے گناہوں کی ایک حد ہے، تم محدود ہو، مگر رحمت کی کوئی حد نہیں، مانگنے والا ہونا چاہئے۔ صداقت کے ساتھ پورا عالم مانگے وہ بھی مل کے رہتا ہے، کوئی مانگنے والا نہیں ہے، مانگ کر پھر دیکھو نہ ملے تو پھر شکایت کرو، مگر اخلاص ہو اضطراب اور بے چینی ہو، اپنے گناہ پر ندامت اور اعتراف ہو۔ پھر مانگتا ہے تو ضرور ملتا ہے، یا وہی چیز ملتی ہے یا اس سے بڑھ کر مل جاتی ہے، یا کوئی دوامی نعمت مل جاتی ہے، یہ نہیں ہے کہ آدمی محروم رہ جائے۔ ایک انسان جو ذرا اچھا سمجھا جاتا ہے کریم النفس ہے اس سے اگر کوئی مانگتا ہے تو اسے حیا آتی ہے کہ سائل کو خالی ہاتھ واپس کرے تو جو کریم الکرما ہے جو کریم کا بخشنے والا اور رحم وکرم کا سرچشمہ ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس سے کوئی صداقت سے مانگے اور محروم چلا آئے ضرور لے کر آتا ہے۔ ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ﴾ مانگنے میں اضطراب اور بے چینی ہونی چاہئے، خلوص کامل ہونا چاہئے، پھر انسان کبھی محروم نہیں ہوتا۔

ندامت کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے باغِ حیوان کا عطیہ ...... ان پانچوں بھائیوں نے بھی پوری ندامت کے ساتھ گناہ کا اعتراف کیا اور کہا: ﴿قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا طٰغِیْنَ﴾ بلاشبہ ہم نے سرکشی کی، ہم نے بہت بڑی غلطی کی۔ ﴿عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ ممکن ہے کہ اللہ اس کے بعد کوئی اس سے بھی بڑا باغ دے دے، اب تو ہم اسی کی طرف جھکتے ہیں اور غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ نے اس کا صلہ یہ دیا کہ جب یہ محروم ہو کر ہاتھ پاؤں شکستہ ہو کر اور دل ٹوٹا ہوا روتے ہوئے واپس ہوئے تو لوگوں میں چرچا ہوا، اور لوگوں کو پتہ چل گیا، کہ یہ تو عجیب حادثہ پیش آیا، باغ کا باغ ان لوگوں کا اجڑ گیا، کوئی آگ برسی بجلی گری، صفحۂ ہستی پر باغ کا نشان باقی نہیں رہا، صبح سے صبح بادشاہِ وقت کو خبر پہنچی، معلوم ہوا کہ یہ بڑے رئیس تھے، اور آج ایک دم قلاش بن گئے، کہ ان کی روزیوں کا بھی گھاٹا، بادشاہ کو رحم آیا کہ یہ لوگ قابل توجہ ہیں، بن کر جو بگڑتا ہے وہ زیادہ قابل رحم ہوتا ہے، جو شروع سے ہی گرا ہوا ہو اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی، عزت دار ہو کر ذلت میں گرفتار ہو جائے، مالدار ہو کر ایک دم مفلس بن جائے، سب کی توجہ اس کی طرف منعطف ہو جاتی ہے، تو بادشاہ وقت کی توجہ منعطف ہوئی تو کہا کہ: شاہی باغوں میں ایک پورے کا پورا باغ انہیں دے دو، جو ان کے باغ سے کہیں بڑھ کر تھا اور اس کا نام ''باغ حیوان'' یعنی زندگی کا باغ تھا، وہ ان کے باغ سے چوگنا زیادہ تھا بے حد بے شمار اس میں پھلوں کے درخت تھے، اور اس کی آمدنی اس سے کہیں زیادہ تھی تو ایک دم بادشاہ نے حکم دیا کہ ان پانچوں بھائیوں کو باغ دے دیا جائے، تو انہوں نے حق تعالیٰ شانہ کے سامنے سرکشی کی تو باغ کو سرے سے اجاڑ دیا، جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور جب ایک دم ندامت کے ساتھ متوجہ ہوئے تو اتنا بڑا باغ بنا بنایا دے دیا، یہ بھی نہیں کوئی دس بیس برس ان سے کوئی محنت لی ہو، پھر باغ دیا ہو، اس سے زیادہ بہتر دے دیا، وہ باغ ذروان تھا، یہ باغ

حیوان ہے، تو زندگی کا باغ عطا کیا، اب پھر نہایت ہی راحت سے فراغت حالی وفراغت بالی سے زندگی گزاری۔

اے اہلِ مکہ باغِ دین کے اجاڑنے سے ڈرو...... یہ حق تعالیٰ نے مثالی دی فرمایا: اے اہل مکہ! تمہارے سامنے بھی اللہ کا رسول آیا، اور اس نے ایک بہترین جنت کا باغ تمہارے سامنے پیش کیا، اور دین کا باغ پیش کیا، تم نے نافرمانی کی، ناقدری کی اور حق کے مقابلے پر آ گئے، وہ فقیروں کو روکتے تھے کہ باغ میں نہ آئیں میوہ نہ کھانے پائیں، تم اس باغِ دین سے غرباء کو روک رہے ہو کہ کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے پائے، ہر ایک کو بہکاتے ہو کوئی راہِ راست پر آ جاتا ہے تو اس کے دل میں شکوک وشبہات ڈالتے ہو، کہ کہیں یہ دل سے دینِ حق کو قبول نہ کرے، تو جیسے ان بھائیوں نے باغ کے پھلوں کے فقیروں کے اوپر دروازے بند کر دیئے تھے، انہوں نے باغ دین کے دروازے بند کر رکھے ہیں کہ جگہ جگہ لوگوں کے دلوں میں شک ڈالتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت مبارک یہ تھی کہ جہاں کوئی مجمع دیکھا، کوئی میلہ دیکھا، آپ دعوت الی اللہ کرنے کے لئے پہنچ جاتے تھے آپ جا رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: اے لوگو! قیامت سے ڈرو، اللہ کے دین کو اختیار کرو شرک اور بت پرستی چھوڑو۔

اور پیچھے پیچھے ابو جہل جا رہا ہے اور کہتا جاتا ہے لوگو! اس کی بات مت مانو، (معاذ اللہ) یہ مجنون آدمی ہے، ان کی عقل بہک چکی ہے، باپ دادا کے دین میں یہ شخص رخنہ ڈالنے کے لئے ایسا کہہ رہا ہے، اس نے برادری میں تفریق ڈال دی، اس کی بات مت سنو۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جا رہے ہیں کہ لوگوں کو باغِ دین میں داخل کر دیں، اور ابو جہل ولید ابن مغیرہ، اسود بن عبد یغوث اور اخنس بن شریق یہ سردارانِ قریش پیچھے پیچھے ہیں کہ لوگوں کو روک رہے ہیں کہ کسی کے دل میں حق نہ آ جائے، کوئی معترف نہ ہو جائے، تو جس طرح سے ان بھائیوں نے باغ کے پھلوں سے فقراء کو محروم کرنا چاہا اسی طرح سے اے مشرکینِ مکہ! تم لوگوں کو باغِ دین سے محروم کرنا چاہ رہے ہو، تو اپنے انجام کو سوچو، ان بھائیوں کے حق میں نتیجہ یہ ہوا کہ باغ سرے سے اجڑ گیا تمہارے حق میں نتیجہ آنے والا ہے، غزوۂ بدر کا سال آ رہا ہے، فتح مکہ کا سال آ رہا ہے، جس میں مشرکین کی کمریں توڑ دی جائیں گی، جس میں ان کی طاقتیں گھٹ جائیں گی، اور ان کی پیش نہیں چل سکے گی، تمہارا ایسا بیج مارا جائے گا کہ بعد میں تمہارا کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہوگا، یہ تمہاری جائیدادیں یہ تمہارے باغات یہ تمہاری تجارتیں یہ سب منٹوں میں ملیامیٹ ہو جائیں گی اگر تم نے اسی طرح حق کا مقابلہ جاری رکھا یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

باغِ ایمان قبول کرنے کی دعوت...... لیکن اگر باغِ ذروان کے مالکوں کی طرح اخیر میں ندامت کا اظہار کیا، اخیر میں سرکشی کا اعتراف کیا تو اللہ نے کتنا زیادہ بہتر پہلے سے بھی زیادہ بہتر دے دیا، تم بھی اگر اعتراف کرو کہ ہم سے جو بھی غلطی ہوئی ہم اس پر دل سے نادم ہیں اب ہم دینِ حق کو قبول کرتے ہیں تو دنیا میں تمہاری

سرداریاں قائم رہیں گی اور آخرت میں بھی تم ہی تم ہو۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے دینِ حق کو قبول کیا، فاروقِ اعظمؓ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ باندھ کر چلے تھے، اور حق کا مقابلہ کرنے چلے تھے، لیکن اخیر میں قلب کے اندر نرمائی آئی ندامت ہوئی اور جا کر اسلام قبول کیا تو کیا ہوا؟ فاروق اعظمؓ کی سرداری دنیا میں قائم رہی آج ابوجہل کا نام لینے والا کوئی نہیں اور فاروق اعظمؓ کا نام لے کر رضی اللہ عنہ کہتے ہوئے زبانیں تھک جاتی ہیں، دلوں کے اندر عظمت بڑھتی ہے، آج عثمانِ غنیؓ علی المرتضیٰؓ خالد بن ولیدؓ، جنہوں نے سینکڑوں مسلمانوں کو قتل اور شہید کیا، اخیر میں اللہ کی طرف رجوع ہوئے تو خطاب ملا: سیف من سیوف اللہ ''خالد بن ولیدؓ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے'' تو خالد بن ولیدؓ کے ہاتھ پر بڑے بڑے ممالک فتح ہوئے تو جنہوں نے اعتراف کیا، کیا ان کی سرداری ختم ہوگئی؟ یا اتنی بڑی سرداری ملی کہ قیامت تک ان کا نام روشن ہے، اور ان کے نامِ نامی کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے یہ تو دنیا میں ملا، اور آخرت یہ ہے کہ بہت سے حضرات عشرہ مبشرہ میں داخل ہوئے کہ انہیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دیدی گئی، تو دنیا ہی میں جس نے جنتیوں کو دیکھنا ہو وہ ان حضرات کو دیکھ لے کہ یہ جنتی پھر رہے ہیں تو دنیا میں بشارتیں ملیں، خلافت ایسی ملی کہ بڑے بڑے بادشاہ ان کے نام سے کانپتے تھے، ان کی اتنی ہیبت اور دبدبہ ہوتا تھا۔

تو اگر ان کے ایک باغ کی سرداری جس کو وہ اپنے زعم میں اپنا باغ سمجھتے تھے، وہ مٹا دی گئی، اس کے بعد ایک عظیم سرداری اللہ کی طرف سے دی گئی یہاں باغِ ذروان کے بعد باغِ حیوان دیا گیا تھا اور وہاں باغِ جنان دے کر باغِ ایمان عطا کیا گیا جس باغِ ایمان کی وجہ سے دنیا بھی درست ہوگئی اور آخرت بھی درست ہوگئی، مگر کب؟ جب اعتراف کر لیا اور نادم ہوگئے کہ اب تک ہم نے غلطیاں کیں، یہ مثال دے کر مشرکینِ مکہ کو عبرت دلائی گئی کہ باغ والوں سے عبرت پکڑو، کہ ان کی ابتداء کیسی ہوئی؟ اور اعتراف قصور کے بعد ان کی انتہا کیسی ہوئی کہ دنیا بھی بن گئی اور آخرت بھی بن گئی، اسی طرح سے تم بھی اعتراف کرو، اعتراف کرنے کے بعد پھر سب کچھ تمہارے لئے ہے، لیکن انہوں نے نہیں مانا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے باغ وغیرہ سب مٹ گئے، آج ان کا نام لینے والا کوئی نہیں۔

﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾ ①

کوئی بات بھی ان کی شنوائی نہیں دیتی، کوئی ان کا نام لینے والا موجود نہیں اگر نام ہے بھی تو وہ بھی قرآن و حدیث کی بدولت ہے، اس میں ان کا ذکر ہے تو نام چل رہا ہے مگر لعنت کے ساتھ چل رہا ہے رحمت کے ساتھ نہیں چل رہا، تو ساری چیزیں مٹ مٹا کر ختم ہوئیں۔

اعترافِ ندامت کے بعد باغِ اسلام کی عظیم الشان سرداری دی گئی...... جنہوں نے ندامت اور اعتراف کے ساتھ اسلام میں داخلہ لیا ان کو عظیم الشان سلطنتیں دی گئیں، عربوں کی شوکت قائم ہوئی تو اتنی بڑی

① پارہ: ۱۶، سورۃ: مریم، الآیۃ: ۹۸.

شوکت قائم ہوئی کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی، سلطنت بھی شوکت بھی اور ساتھ میں دیانت بھی ہے، سرداری بھی ہے عبدیت بھی ہے اور عبادت بھی ہے کہ تختِ سلطنت پر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن دین و دیانت کا پلّہ ہاتھ میں ہے۔

فاروقِ اعظمؓ سلطنت پر ہیں، صدیق اکبرؓ تخت سلطنت پر ہیں اور عبادت کا یہ حال ہے کہ عام آدمی میں اور ان میں فرق معلوم نہیں ہوتا، ایک ایسی دیانت اور مساوات کی حکومت ہے کہ امیر المومنین اور ایک عام مسلمان حقوق میں برابر ہیں۔

فاروق اعظمؓ سے ایک اعرابی کا مکالمہ...... مالِ غنیمت کی چادریں آئیں ایک ایک چادر بانٹ دی گئیں، فاروقِ اعظمؓ کے حصہ میں بھی ایک ہی چادر آئی، آپ خطبہ دینے کے لئے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کھڑے ہوئے تو دو چادریں بدن پر تھیں اس میں وعظ فرمار ہے تھے۔ تو فرمایا: اِسْــمَــعُــوْا وَاَطِيْــعُــوْا میں امیر المومنین ہوں میری بات سنو اور میری اطاعت کرو، ایک اعرابی کھڑا ہوا اور کہا۔ لَانَسْـمَـعُ وَلَا نُطِيْعُ نہ ہم تمہاری بات سنیں گے نہ ہم تمہاری اطاعت کریں گے۔

تو یہ نہیں تھا کہ اسی وقت گرفتار کرلیا جاتا کہ اس نے حکومت کے خلاف کہا اور بر سر منبر امیر المومنین سے گستاخی کی۔ فاروقِ اعظمؓ فوراً ڈھیلے ہوگئے، فرمایا بھائی کیوں؟ جب مجھے امیر المومنین بنادیا پھر کیوں اطاعت نہیں کرتے، اس نے کہا تم نے خیانت کی ہے؟ اس لئے کہ مالِ غنیمت میں سے ایک ایک چادر ایک شخص کا حق تھا، تمہارے بدن پر دو چادریں ہیں، تو تم نے ایک چادر زیادہ لے لی تو تم نے مسلمان کے مال میں خیانت کی اس لئے تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہاری بات سنی جائے اور تمہاری اطاعت کی جائے۔

فرمایا اس کا جواب میرا بیٹا عبداللہ بن عمرؓ دے گا، عبداللہ ابن عمرؓ کھڑے ہوئے، اور فرمایا: والد صاحب کے حصہ میں ایک ہی چادر آئی تھی اور ایک میرے حصہ کی چادر تھی، فاروقِ اعظمؓ ڈیل ڈول کے آدمی تھے، تو ایک چادر میں نے اپنے حصہ کی انہیں دے دی تو اس طرح دو چادریں تھیں، فاروق اعظمؓ نے از خود دو چادریں نہیں لیں۔ تو وہ اعرابی پھر کھڑا ہوا اور کہا: نَسْـمَـعُ وَنُطِيْعُ ہم سنیں گے بھی اور ہم اطاعت بھی کریں گے۔ تو سلطنت تھی مگر ایسی سلطنت جس میں کوٹ کوٹ کر دینداری دیانتداری اور خوفِ خدا بھرا ہوا ہے، مساوات کے ساتھ حکومت ہے امیر المومنین کا وہی حصہ ہے جو ایک غریب عامی کا حصہ ہے، ان کا کوئی زیادہ حصہ نہیں ہے۔

حقِ خلافت...... پھر یہ کیفیت کہ اگر اپنی غلطی پر کوئی عامی آدمی متنبہ کرے تو اسی وقت ڈھیلے پڑ جاتے تھے، اس کے سامنے معافی چاہتے تھے، یہ امیر المومنین کی حالت تھی۔ حدیث میں واقعہ بیان فرمایا گیا ہے، فاروقِ اعظمؓ رات کو گھوم رہے تھے کہ یہ معلوم کریں کہ لوگوں کی اخلاقی حالت کیا ہے، گویا مسلمانوں کا امیر محض ٹیکس وصول کرنے کا امیر نہیں یا محض خزانے بھرنے کا امیر نہیں، بلکہ اخلاقی حالتیں درست کرنے کا بھی ذمہ دار بنایا گیا اس لئے فاروق اعظمؓ راتوں کو گھومتے تھے کہ لوگوں کی اخلاقی حالت کیا ہے، منظر عام پر آکر یہ لوگ بے شک گناہ نہیں کرتے لیکن

ممکن ہے گھروں میں چھپ چھپا کر یہ لوگ کچھ کرتے ہوں، تورات کو نگاہ ڈالتے تھے کہ لوگوں کے گھریلو اخلاق کیا ہیں، چنانچہ ایک گھر کے قریب سے گذرے تو ایک عورت کی آواز سننے میں آئی کہ گنگنا کر کچھ اشعار پڑھ رہی ہے اور بڑے دردآمیز آواز کے ساتھ کچھ عاشقانہ مضامین کے اشعار ہیں، چونکہ عورت کی آواز تھی تو فاروقِ اعظمؓ چونکے کہ یہ کون گھر میں اس طرح عاشقانہ اشعار پڑھ رہی ہے اور آواز باہر بھی آرہی ہے، تو خطرہ اور خدشہ پیدا ہوا کہ کوئی اندر برائی تو نہیں ہو رہی، فوراً دروازے پر دستک دی یہ عورت کون ہے جو اس طرح گا کر اشعار پڑھ رہی ہے، وہ جو لڑکی گا رہی تھی امیر المومنین کی آواز پہچان کر سہم گئی، اس میں جرأت نہ رہی کہ بتلا سکے کہ اندر کون ہے، کوئی جواب اندر سے نہ آیا۔ اب ان کا شبہ اور قوی ہوا کہ اگر کوئی برائی نہیں تھی تو وہ عورت کہہ دیتی کہ کوئی برائی نہیں، آپ اطمینان رکھیں، مگر یہ چپ ہو جانا اس کی دلیل ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ہے۔ پھر زور سے دروازے کو کھٹکھٹایا، اب وہ اور ڈر گئی، چنانچہ پھر بھی دروازہ نہیں کھولا چانچہ فاروقِ اعظمؓ چھلانگ مار کے اندر پہنچے اور بحیثیت امیر المومنین یہ ان کا حق تھا جیسے پولیس چھاپہ مارتی ہے، اسی طرح امیر المومنین کا حق ہے کہ اگر وہ کوئی خدشہ یا خطرہ محسوس کریں تو وہ چھاپہ ماریں دیکھیں کہ کوئی بداخلاقی تو نہیں ہے چھلانگ مار کے اندر پہنچے فرمایا کون ہے جو اس طرح سے عاشقانہ اشعار پڑھ رہی تھی، ایک عورت کو کیا تعلق ہے کہ وہ عاشقانہ اشعار پڑھے۔

اب اس لڑکی کو جرأت پیدا ہوئی، اس نے کہا امیر المومنین! مجھے آپ کیوں عاشقانہ اشعار سے روکتے ہیں؟ فرمایا ایسے اشعار گناہ ہیں اور عورت کی آواز بھی گناہ ہے تو ایک گناہ میں مبتلا ہوئی، اس نے کہا میں نے تو ایک گناہ کیا آپ نے تو تین گناہ کئے اور قرآن وحدیث کی خلاف ورزی کی۔ بس فاروقِ اعظمؓ وہی ڈھیلے پڑ گئے اور وہ جوش وخروش ختم ہوگیا، فرمایا: بہن میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ اگر تو مجھے مطلع کردے کہ میں نے کیا گناہ کئے ہیں تو میں ممنون ہوں گا، اس نے کہا ایک نہیں تین صریح گناہ کئے ہیں اور قرآن وحدیث کی خلاف ورزی کی، اسی وقت فاروق اعظمؓ سہم گئے اور خوف زدہ ہوگئے اور کہا کہ مجھے مطلع کرو۔ اس نے کہا قرآن کریم میں صاف ارشاد موجود ہے۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا﴾ ① اہلِ ایمان کسی غیر کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ تم اس سے اجازت نہ لے لو، اور سلام کر کے داخل ہو۔ آپ بغیر میری اجازت کے میرے گھر میں داخل ہوئے، بلا اجازت اور بلا سلام آپ داخل ہوئے آپ کو ایسا کرنے کا کیا حق تھا؟ فرمایا میرے سے یہ غلطی ہوئی کہا ایک غلطی نہیں دوسری اور بھی ہوئی۔ قرآن کریم میں صاف حکم موجود ہے: ﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ ② گھروں میں دروازوں سے داخل ہو، آپ دروازے کی بجائے دیوار پھلانگ کے داخل ہوئے، آپ کو کیا حق تھا؟ یہ قرآن کریم کی خلاف ورزی ہے، اب اور زیادہ ڈر گئے کہ واقعی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ اس کے بعد اس نے کہا تیسری غلطی یہ ہے کہ صریح حدیث

---

① پارہ ۱۸، سورۃ: النور، الآیۃ: ۲۷۔ ② پارہ: ۲، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۱۸۹۔

میں حکم دیا گیا ہے کہ اجنبیہ کے خلوت کدے میں مت داخل ہوں، کسی اجنبی عورت کے ساتھ تخلیہ جائز نہیں ہے، میں یہاں اپنے گھر میں تنہا ہوں، آپ کو کیا حق تھا کہ آپ میرے خلوت کدے میں آ کودے۔ اب ایک دم فاروقِ اعظمؓ کپکپانے لگے، اللہ کا ڈر غالب آیا۔ فرمایا: بہن مجھ سے غلطی ہوئی مجھے معاف فرمادیں۔ اس نے کہا میں کون ہوں معاف کرنے والی جس کا گناہ کیا ہے اس سے معافی چاہو، قرآن کریم کا گناہ کیا، حدیث کا گناہ کیا، اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی چاہو، میں کون ہوں معافی دینے والی۔ چنانچہ آ کر بقیہ رات نوافل وتوبہ استغفار میں گذاری، رات بھر روتے رہے، حالانکہ یہ گناہ نہیں تھا امیر المومنین کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر کسی گھر پر شبہ ہو تو اس میں چھاپہ مارے، پولیس کو بھیجے کہ کوئی بدکاری تو نہیں ہو رہی، یہ امیر کے حق میں جائز ہے، مگر اس سب جائز کو بھول گئے، صرف ذہن میں یہ رہ گیا کہ واقعی تین حکموں کی خلاف ورزی کی میں دیوار پھلانگ کر داخل ہوا، بلا اذن داخل ہوا اور ایک عورت کے خلوت کدے میں داخل ہوا، غرض تمام رات روئے استغفار کیا، صبح کو قلب میں انشراح پیدا ہوا کہ میری غلطیاں معاف ہوگئیں اور اللہ تعالیٰ نے میری معافی کو قبول فرمالیا بہت منشرح ہوئے۔ اس کے بعد حکم دیا کہ اس عورت کو دربارِ خلافت میں حاضر کیا جائے چنانچہ وہ حاضر ہوگئی۔ فرمایا بہن! میں تیرا ممنون ہوں تو نے مجھے میرے گناہوں پر مطلع کیا، میں نے رات بھر توبہ استغفار کیا، اب مجھے اخیر میں انشراح اور اطمینانِ قلب حاصل ہوگیا کہ اللہ نے میرے گناہوں کو معاف کردیا میں مطمئن ہوں کہ مجھے معافی مل گئی۔

اب بحیثیت امیر المومنین یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ گانا بجانا کیسا تھا؟ اس طرح کے تجھے اشعار پڑھنے کا کیا حق تھا، وہ کیا واقعہ تھا؟ اس نے کہا امیر المومنین! میں زانیہ عورت ہوں نہ بدکار ہوں، میں ایک عفیفہ عورت ہوں، صورتِ واقعہ یہ ہے کہ میری شادی کو پندرہ دن ہوئے ہیں، میں بھی بھرپور جوانی رکھتی ہوں، میرا خاوند بھی بھرپور جوان ہے شادی کو پندرہ دن ہوئے تھے فلاں جنگ میں آپ نے میرے خاوند کو بھیج دیا، اور اس کو روانہ کردیا، اس کے فراق اور جوشِ جوانی میں کچھ اشعار پڑھ رہی تھی، میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔

فرمایا تو سچ کہتی ہے بیشک یہی واقعہ ہے اور تو بدکار نہیں ہے اس کے بعد اس کو عزت کے ساتھ واپس کیا اور شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد گھر میں جا کر اہلیہ محترمہ سے پوچھا! اگر عورت بھی بھرپور جوان ہو اور مرد بھی بھرپور جوان ہو اور ان میں جدائی کردی جائے، تو وہ کتنے دن جدائی کا تحمل کرسکتے ہیں اگر اس سے زیادہ دن ہوجائیں تو وہ زنا یا بدکاری میں مبتلا ہوجائیں گے اور صبر نہ کرسکیں گے، کتنی مدت ہوسکتی ہے۔ اہلیہ محترمہ نے جواب دیا اگر مرد وعورت میں بھرپور جوانی ہو تو تین مہینوں سے زیادہ ان کو جدا نہ کیا جائے، ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ بدکاری میں مبتلا ہوجائیں گے اور صبر نہ کرسکیں گے۔

یہ الگ بات ہے کہ اللہ کے ڈر سے عفت وپاکیزگی طبع سے گناہ میں مبتلا نہ ہوں، لیکن دنیا ہے تو عالم اسباب میں بھرپور جوانی مرد وعورت تین مہینے سے زیادہ صبر نہیں کرسکتے، اسی وقت آ کر سرکاری طور پر آرڈر جاری کیا کہ جس

شادی شدہ شخص کو جنگ کے لئے بھرتی کیا جائے، تین مہینے کے اندر اندر اسے پھر واپس گھر لایا جائے، اس کی جگہ دوسرا جوان بھیجا جائے تین مہینے سے زیادہ صرف نہ کئے جائیں، تو ان حضرات کی یہ بادشاہت نہ تھی بلکہ خلافت تھی کہ اقتدار بھی پورا اور ایسا کہ سلاطین دنیا کا نہیں، اور خوف خدا بھی پورا اور دیانت بھی پوری، اور اپنے نفس کا مراقبہ بھی پورا، اور یہ بھی خطرہ کہ ہم کسی گناہ میں مبتلا نہ ہو جائیں، تو حقیقت میں خلافت کا حق انہیں حضراتِ اکابر نے ادا کیا۔ تو پہلے فاروقِ اعظمؓ کفر میں مبتلا تھے، لیکن جب توبہ کی تو پچھلی سرداری کیا چیز تھی، جو بعد میں اللہ نے دنیا میں سرداری دی، اور آخرت کی یہ سرداری کہ دنیا ہی میں ان حضرات کو جنت کی بشارت دے دی، تو ان سے زیادہ کون خوش نصیب تھا کہ دنیا میں بھی سرداری پائی اور آخرت میں بھی سرداری پائی۔

دو جہاں کی سرداری کا راستہ...... تو اسی طرح سے مشرکینِ مکہ کو مطلع کیا جا رہا ہے کہ باغ والوں کے قصے سے عبرت پکڑو، انہوں نے اگر حق تعالیٰ سے بغاوت کی تو کیا نتیجہ نکلا کہ باغ کی جڑ بنیاد ختم ہو گئی، اس کے بعد اطاعت کی اور ندامت کا اظہار کیا اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس سے بہتر باغ مل گیا، تم بھی آج بغاوتِ حق پر آمادہ ہو، اللہ کے دین پر خود بھی نہیں آتے اور دوسرے کو بھی آنے سے روکتے ہو اس باغِ دین سے فائدہ نہیں اٹھانے دیتے، اگر تم توبہ کر لو تو اس سے بڑھ کر باغ دیا جائے گا اور سرداری دی جائے گی، تو جن کی قسمت میں تھا، انہیں سرداری مل گئی اور جن کی قسمت میں نہیں تھا ان سے یہاں سے بھی چھن گئی وہاں سے بھی چھن گئی دونوں جہاں سے محروم ہو گئے گویا عبرت کے لئے قصہ بیان فرمادیا گیا کہ اس طرح سے اگر چلو گے کہ اگر گناہ ہو جائے تو آدمی فوراً نادم ہو جائے، فوراً توبہ کرے استغفار کرے آدمی اپنی کمزوری اور غلطی کا اعتراف کرے، اللہ کے ہاں یہی چیز قبول ہوتی ہے۔

یہ مقصود نہیں ہے کہ کوئی گناہ کسی طرح سے نہ کرے، آدمی جب ہی بخشا جائے گا کہ بالکل گناہوں کا استیصال کر دیا، اسلئے کہ یہ تو ممکن نہیں انسان اور بشر جسے کہتے ہیں وہ تو خطا اور نسیان کا پتلا ہے، بشریت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے، غلطی بھی ہوگی کوتاہی بھی ہوگی گناہ بھی ہوگا گناہوں کا استیصال مقصود نہیں ہے، اس لئے کہ انسان میں جب گناہ کا مادہ رکھا ہے تو پھر تو کچھ نہ کچھ تو کرے گا مقصد یہ ہے کہ گناہ کر کے اس پر اصرار نہ کرو، نادم ہو کر اس سے ہٹ جاؤ، پھر گناہ ہو پھر توبہ کر لو، تو یہ نہیں کہا جا رہا کہ گناہ کا مادّہ اپنے اندر سے نکال دیں، یہ انسان کے بس میں ہی نہیں جیسے خیر کا مادہ انسان میں رکھا گیا ہے، شر کا بھی ہے۔

خیر و شر کا تصادم علامتِ بشریت ہے...... حدیث میں ہے کہ ہر انسان کے دل میں ایک داعیہ خیر کا پیدا کیا گیا ہے ایک داعیہ شر کا پیدا کیا گیا ہے، ہر انسان کے قلب کی دائیں جانب ایک فرشتہ بٹھلایا گیا ہے اور قلب کی بائیں جانب شیطان بٹھلایا گیا ہے، فرشتہ خیر کے خطرے ڈالتا ہے اور شیطان شر کے وسوسے ڈالتا ہے، انسان دو پہلوانوں کے بیچ میں ہے، ادھر سے فرشتہ چاہ رہا ہے کہ نیکی کرے شیطان چاہ رہا ہے کہ بدی کرے یہ جو آپ کسی وقت دیکھتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ فلاں برائی کر لوں پھر طبیعت ذرا رکتی ہے کہ بھائی دیکھو اللہ کے خلاف ہوگا، پھر

اس کے بعد آمادگی ہوتی ہے کہ توبہ کرلیں گے اس وقت تو کرلو، پھر اس کے بعد آدمی رکتا ہے کہ بھائی خدا تو دیکھ رہا ہے یہ تردّد فی الحقیقت شیطان اور فرشتے کے مقابلے سے ہوتا ہے، فرشتہ خیر کا خطرہ ڈال رہا ہے تو آدمی خیر کی طرف چلتا ہے اور شیطان شر کا وسوسہ ڈال رہا ہے تو آدمی شر کی طرف چل رہا ہے، ان دو پہلوانوں میں جو غالب آجائے، اسی راہ پر انسان چل پڑتا ہے مادے خیر کے بھی موجود ہیں شر کے بھی موجود ہیں، نیکی بھی کرے گا اور کبھی نہ کبھی بدی بھی کرے گا، بہتر سے بہتر آدمی صالح ہونا چاہئے۔ لیکن کبھی نہ کبھی بدی سرزد ہوجاتی ہے، اس لئے کہ اس کا مادہ رکھا ہوا ہے، تو حق تعالیٰ یہ نہیں فرماتے کہ جنت اس وقت دیں گے جب تم سے ایک گناہ بھی نہ ہو، بالکل پاک بن جاؤ، یہ شان حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہے وہ معصوم ہوتے ہیں یا اولیاء اللہ کی ہے کہ وہ محفوظ ہوتے ہیں، عام بشر چاہے کتنی ہی نیکیاں کرے مگر کسی نہ کسی وقت کمزوری سرزد ہو ہی جائے گی، بشریت موجود ہے اس لئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ گناہوں کی جڑ بنیاد کاٹ دو، اور بالکل مقدس ہو کر آؤ، یہ فرمایا گناہ تو ہوں گے، مگر اصرار مت کریں توبہ بھی کرلیں، نادم بھی ہوجائیں، ہزار دفعہ گناہ کرلو، پھر توبہ کرلو، معاف کرنے کو موجود ہیں۔

”مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ“ ①

جس نے توبہ کرلی وہ اپنے گناہ کے اوپر مُصر نہیں سمجھا جائے گا، مُصر وہ ہے کہ گناہ کرتا جائے اور توبہ نہ کرے اور اس کے دل میں ندامت نہ آئے معلوم ہوا نفسِ گناہ مُصر نہیں ہے، گناہ پر اصرار کرنا، نادم نہ ہونا یہ مُصر ہے۔ بلکہ حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا کہ:۔

”لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَجَآءَ اللّٰهُ قَوْمًا يُّذْنِبُوْنَ“ ② اگر تم بالکل گناہ کرنا چھوڑ دو، تو اللہ تعالیٰ ایک قوم پیدا کریں گے کہ وہ گناہ کرے، تا کہ اس کی شانِ غفاری ظاہر ہو۔

دوزخ کر ابسوزد گر بولہب نباشد

جیسے دوزخ کے لئے ابولہب کی ضرورت ہے کہ اگر ابولہب نہ ہو تو جہنم کہاں سے بھرا جائے، اسی طرح جنت کے لئے نیکوں کی ضرورت ہے، اب اہل جنت میں نیک بھی ہیں گناہ گار بھی ہیں نیکوکار فضل سے جائیں گے اور گناہ گار مغفرت سے جائیں گے، اگر گناہ کرنا ہی چھوڑ دیں تو شانِ غفاری کیسے ظاہر ہوگی؟ تو مغفرت کے لئے ضرورت ہے کہ گناہ کا کام ہو۔

عُجب، گناہ سے بھی زیادہ مہلک ہے...... اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ فوراً گناہ کرنا شروع کردیں کہ بھائی ہم تو اللہ کی مغفرت چاہ رہے ہیں، مطلب یہ ہے کہ گناہ کا مادہ ہے خواہی نخواہی کبھی نہ کبھی گناہ کر گذرے گا، لیکن گناہ کر کے مایوس نہ ہوجائے کہ اب رحمت کی کوئی صورت میرے لئے نہیں، رحمت کی صورت ہے اور وہ

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب فی دعاء النبی صلی الله علیه وسلم ج: ۱۱ ص: ۴۷۱.

② الصحیح لمسلم، کتاب التوبة، باب سقوط الذنوب بالاستغفار توبة ج: ۱۳ ص: ۳۰۱ رقم: ۴۹۳۶.

توبہ ہے، فرماتے ہیں کہ گناہ اتنا مضر نہیں ہے، جتنا گناہ کر کے توبہ نہ کرنا اور اس پر جمنا مضر ہے، اگر تم سب گناہ چھوڑ دو تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم پیدا کرے گا جو گناہ گار ہوتا کہ اس کی شانِ مغفرت ظاہر ہو، بلکہ ایک روایت میں ہے: خَیْرُ الْعِبَادِ الْخَطَّآءُ وْنَ التَّوَّابُوْنَ اللہ کے بہترین بندے وہ ہیں جو گناہ گار ہیں، مگر توبہ کرنے والے ہیں، اس واسطے کہ ایک شخص تو وہ ہے جو کبھی گناہ نہیں کرتا، اس کا احتمال ہے کہ اس کے دل میں غرور پیدا ہو جائے کہ میں بڑا متقی ہوں کبھی گناہ ہی نہیں کیا، تو یہ خیال آنا اس کے لئے مہلک ہے، یہ بھی اللہ کی رحمت سے بعید کرنے والا ہے، اگر ناز پیدا ہو گیا اتراہٹ پیدا ہوگئی کہ میں بڑا نیک ہوں کبھی گناہ نہیں کرتا، یہ اللہ کی رحمت سے بعید ہو جائے گا، لیکن گناہ کرتا ہے، پھر توبہ کرتا ہے، پھر گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے، اس کے دل میں کبھی خطرہ نہیں آئے گا کہ میں بڑا مقدس آدمی ہوں اس لئے کہ گناہ سامنے ہے، اس کا دل ٹوٹا ہوا رہے گا کہ میں تو گنہگار ہوں اور دل شکستہ ہونا یہی رحمت خداوندی کو جذب کرتا ہے، اس سے زیادہ رحمت متوجہ ہوتی ہے، اس لئے فرمایا: ''خَیْرُ الْعِبَادِ الْخَطَّآءُ وْنَ التَّوَّابُوْنَ'' ① بہترین بندے وہ ہیں جو گنہگار ہیں مگر توبہ کرتے ہیں توبہ سے غافل نہیں ہیں، تو جو کبھی گناہ نہیں کرتے ان کے اندر کبر اور غرور کا احتمال ہے لیکن جو گناہوں کے اندر ڈوبے ہوئے ہیں مگر توبہ کرتے ہیں ان کے اندر کبھی کبر نہیں ہو سکتا کہ ہم تو بہت گنہگار آدمی ہیں ہر دم گناہ ان کے پیشِ نظر رہیں گے، قلبی شکستگی گناہ سے ہوتی ہے، اور وہی شکستگی بارگاہِ حق میں مطلوب ہے جو رحمت کو کھینچتی ہے، اس کا حاصل یہی ہے کہ احیاناً گناہ سرزد ہو جائے تو مایوس نہیں ہونا چاہئے، یہ مطلب نہیں ہے کہ جری ہو کر گناہ شروع کر دو کہ اللہ کے بہترین بندے تو وہی ہیں جو گناہ گار ہیں لہٰذا خوب گناہ کرو۔

رحمتِ حق سے مایوسی کی ممانعت ہے..... خوب گناہ کرنے کے باوجود بھی فرماتے ہیں کہ مایوس مت ہو یہ نہیں فرماتے کہ خوب گناہ کیا کرو، تو یہاں یاس کی نفی کی جا رہی ہے، کہ کتنے ہی گناہ کرو مایوس مت ہوؤ، وہاں توبہ ہے ؎

بازآ بازآ ہر آنچہ ہستی بازآ | گر کافر و گبر و بت پرستی بازآ
این درگہ ما درگہ نومیدی نیست | صد بار گر توبہ شکستی بازآ

فرماتے ہیں، باز آجا باز آجا، نادم بن جاؤ، اگر کافر گبر اور بت پرست بھی ہو تب بھی مایوس نہ ہو باز آجاؤ، پھر رحمت کرنے کو تیار ہیں اس لئے کہ ہماری بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں ہے سو مرتبہ بھی اگر گناہ کرو گے اور پھر آؤ گے پھر بھی توبہ قبول کرنے کو تیار ہیں، پھر بھی رحمت کرنے کو تیار ہیں ہماری بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں ہے۔ اسی واسطے فرمایا گیا ہے ﴿لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ﴾ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو، کتنی بھی برائیوں کے اندر مبتلا ہو، یاس لے کر مت آؤ، مومن کا کام ہی مایوسی نہیں ہے، پھر متوجہ ہو جائے پھر رحمت کرنے کو تیار ہیں۔ اور سچی

① السنن للترمذی، کتاب صفة القیامة والرقاق والورع، باب منه ج: ۹ ص: ۳۰ رقم: ۲۴۲۳.

توبہ ایسی چیز ہے کہ ستر برس کا کفر بھی اگر سچے دل سے توبہ کر لی جائے تو مٹا دیتی ہے، گناہ تو کفر سے ہلکی چیز ہے، جب سو برس کا ایک کافر آ کر توبہ کرے تو کفر مٹ جاتا ہے اور ایسا مٹتا ہے کہ: ''اِنَّ الْاِسْلَامَ یَھْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَـهٗ'' ① اسلام سے پہلے جو کچھ بھی کیا تھا وہ سب ختم ہو جاتا ہے، آج وہ ایسا بن گیا جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا شدہ بچہ گناہ سے پاک ہوتا ہے تو گناہ سے توبہ کرنے کے بعد کیوں نہیں پاک بنے گا۔

اس لئے فرمایا: ''اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ'' ② گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں تھا، اس کو پاک بنا دیا جاتا ہے۔

حقوق العباد توبہ سے معاف نہیں ہوتے...... اِلّا یہ کہ حقوق العباد ہوں تو وہ توبہ سے معاف نہیں ہوتے، کسی کو گالی دے دی، کسی کی آبرو گرائی، کسی کا خون ناحق کیا، کسی کا مال جھپٹ لیا، چرا لیا، قرض لے کر نہیں دیا، امانت میں خیانت کی، کتنی ہی توبہ کرے یہ معاف نہیں ہوں گے جب تک کہ صاحبِ حق معاف نہ کر دے، یہ حق تعالیٰ کی بارگاہ کا عدل و انصاف ہے، حالانکہ مالک الکل وہ ہیں، لیکن فرماتے ہیں کہ یہ ہمارا گناہ نہیں، اس نے اپنے بھائی کا گناہ کیا ہے وہی معاف کرے گا تو معاف ہوگا، ہمیں معاف کرنے کا حق نہیں ہے، ہم معاف نہیں کریں گے، حالانکہ اگر وہ معاف کر دیں تو بندے کیا کر سکتے ہیں، لیکن یہ عدلِ کامل ہے کہ ہم معاف نہیں کریں گے، جس کا قصور کیا اس سے معافی چاہو۔

اگر کسی کی غیبت کی ہے کسی کو برا بھلا کہا ہے، پشت پیچھے اس کے عیب بیان کئے ہیں آدمی اس کے پاس تنہائی میں جا کر کہے، بھائی! میں نے تیرے ساتھ برائی کی ہے، میں نے غلطی کی تیرے عیب بیان کئے، اللہ کے لئے مجھے معاف کر دے، وہ معاف کر دے گا معاملہ صاف ہو جائے گا، کسی کا قرض دبا لیا ہے آدمی وہ جا کر دیدے کہ اب تک مجھ سے غلطی ہوئی اب میں ادا کروں گا، اگر بالفرض دینے کو نہیں رہا لیکن اقرار کر لیا کہ بے شک آپ کا پیسہ مجھ سے کھایا گیا میں نے خطا کی لیکن اب میں معترف ہوں کہ جب میرے پاس ہوگا پہلے میں تجھے دوں گا، اب اس مستعد ہونے پر آدمی قائم رہے، اگر پانچ روپے ہیں تو ایک حصہ اس کو جا کر دیدے، کہ بہرحال مجھے یہ ادا کرنا ہے صرف کھانے کے لئے اتنا رکھ لے کہ فاقہ نہ ہو، بقیہ سب اس کو دے دے جب اس طرح سے کوئی ادائے قرض میں ہمت باندھے گا تو پھر اللہ کی طرف سے بھی مدد ہوتی ہے، ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ اسے جلدی سبکدوش کر دیتے ہیں، غرض کسی کی غیبت کی ہو آبروریزی کی ہو، مال چھینا ہو تو مومن کا کام یہ ہے کہ بے تکلف جا کے کہہ دے کہ بھائی! مجھے معاف کر دے بس معاملہ صاف ہو گیا، اسی طرح اللہ کا حق مارا تو اللہ سے توبہ کر لے، وہ تو کریم ہیں معاف کر دیں گے، بہرحال یہ ندامت اور توبہ ایسی چیز ہے کہ اس سے کفر تک مٹ جاتا ہے، اس واسطے

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب كون الاسلام يهدم ما قبله وكذا الهجرة والحج ج: ۱ ص: ۳۰۴ رقم: ۱۷۳. ② السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر التوبة ج: ۱۲ ص: ۳۰۱ رقم: ۴۲۴۰.

فرمایا گیا کہ باغ والوں کی مثال سامنے رکھو کہ انہوں نے جب سرکشی کی تو اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کہ باغ جڑ بنیاد سے ختم ہو گیا، اور جب کہا ﴿اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾ ہم اللہ کی طرف جھک رہے ہیں، ہم نے سرکشی کی ہم اس سے توبہ کرتے ہیں اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کہ انہیں باغِ حیوان دے دیا گیا۔

بغاوت اور توبہ کے ثمرات...... تو اے مشرکینِ مکہ! آج تک تم بغاوت کر رہے ہو اس کا ثمرہ بھی تمہارے سامنے آ گیا کہ غزوۂ بدر کے اندر تمہارے بڑے بڑے سردار قتل ہو گئے، فتح مکہ کے اندر سب کے گھروں پر تالے پڑ گئے، یعنی ان کی ریاستیں ختم ہو گئیں اور جنہوں نے توبہ کر لی اس کا ثمرہ بھی سامنے آ گیا کوئی امیر المومنین بنا، کوئی خالد سیف اللہ بنا، کوئی ابوتراب بنا، کوئی ذی النورین بنا، حق تعالیٰ کی حکومت سے خطابات دیئے گئے۔ اس کا بھی ثمرہ سامنے آیا، تو دونوں چیزیں سامنے رکھو اور اس واقعہ سے عبرت پکڑو اور اس سرکشی کو ترک کرو، اس واقعہ پر جن کی قسمت میں سعادت تھی وہ تائب ہو گئے، جن کی قسمت میں نہیں تھی، وہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے دعا کیجئے حق تعالیٰ توفیقِ عمل عطا فرمائے۔

مشرکینِ مکہ کو تنبیہ...... ﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ○ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ○ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ○ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ○ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ○ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ○ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ○ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ﴾

بزرگانِ محترم! جیسا کہ آپ معلوم کر چکے ہیں حق تعالیٰ شانہ نے مشرکین مکہ کو عبرت دلانے کے لئے باغ والوں کی ایک مثال بیان فرمائی اور جو کچھ سانحہ گذرا تھا وہ ارشاد فرمایا کہ اس طرح سے ان پر آ کر آفت پڑی، اور پھر یہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے، تو انہیں نعم البدل دے دیا گیا، تو یہ مثال عبرت کے لئے ان کے سامنے پیش کی گئی کہ تم بھی اسی حالت میں ہو جیسے اصحاب الجنہ تھے، تم پر ایک مصیبت آنے والی ہے، یعنی یوم بدر آنے والا ہے، اس میں تمہارے سردار قتل ہونگے تمہاری طاقت ٹوٹ جائے گی، قحط سالی آنے والی ہے جس کے اندر تم کئی برس تک مبتلا رہو گے یہ ساری آفتیں آئیں گی، اگر تم نے ان آفات سے عبرت پکڑی اور اللہ کی طرف رجوع کیا پھر اس کے بعد بہترین ثمرہ بھی اسی طرح آئے گا جس طرح باغ والوں کے لئے آیا۔

اس واقعہ کو بیان فرما کر بطور نتیجہ کے حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: ﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ﴾ کہ آفت یا مصیبت اسی طرح آیا کرتی ہے کہ اچانک آ پڑتی ہے، آفت یا مصیبت دستک دے کر نہیں آیا کرتی کہ وہ پہلے دروازے پر آ کر اطلاع دے اور دو چار دن پہلے سے تیار کرے، وہ عذاب ہی کیا ہو جس کی استعداد پہلے سے تیار

کی جائے، اس طرح تو آدمی سنبھل جاتا ہے کہ مجھے مصیبت کے لئے تیار ہونا ہے، تو مصیبت حقیقت میں وہی ہوتی ہے جو اچانک آتی ہے، اور آفات کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اچانک ہی آتی ہیں، چنانچہ سب آفتوں کی جڑ بنیاد موت ہے تو وہ بھی اچانک آتی ہے، پہلے سے کسی کو کوئی اطلاع نہیں ہوتی، بالفرض اگر کوئی بیمار بھی ہو، بہت شدید بیمار ہو جائے اور مایوس بھی ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہوتا ہے کہ موت قریب ہے مجھ سے کوئی دور نہیں ہے، لیکن یہ کہ کب آجائے گی؟ جب آئے گی تو اچانک ہی آئے گی بغتۃً ہی آتی ہے۔

قلبی قساوت کا انجامِ بد...... اور دنیوی مصائب تو اچانک ہی آتے ہیں، جب اقوام اور افراد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تمام وسائل دنیا ہمارے ہاتھ میں آگئے ہیں اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم پر آفت آئے، انہی پر زیادہ آتی ہے اور اچانک آتی ہے، اسوقت حیرت زدہ ہوتے ہیں کہ یہ کدھر سے آگئی، جس کا نقشہ بھی قرآن کریم نے ایک جگہ کھینچا ہے، فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ﴾ آپ سے پہلے ہم نے دنیا کی اقوام کو جانچا، ان میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام بھیجے، اپنا قانون بھیجا تاکہ وہ اس پر چلیں، جب وہ نہ چلے، خلاف ورزیاں کیں اور فطرت کے خلاف چلے معصیتوں میں مبتلا ہوئے تو پھر ہم نے ڈرانے والے بھیجے کچھ آفات بھیجیں، تاکہ وہ سنبھلیں، کبھی مصیبتیں اور کبھی خوفناک چیزیں بھیج کر ان کو متنبہ کرنا چاہا، تاکہ وہ ہماری طرف رجوع کرلیں تضرع زاری، اللہ کی طرف جھکنا اور عجز وانکسار پیدا کریں لیکن ایسا نہ ہوا ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ﴾ آگے بطور شکایت فرماتے ہیں ﴿فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا﴾ آخر ایسا کیوں نہ ہوا؟ جب ہم نے آفت بھیجی تو وہ سمجھ جاتے؟ آفت کا تو خاصہ ہی یہ ہے کہ آدمی کے اندر رجوع الی اللہ پیدا کرتی ہے، بہت ہی کوئی قساوۃ قلب رکھتا ہو کہ اس پر آفتوں پر آفتیں آئیں پھر بھی اس میں رجوع الی اللہ پیدا نہ ہو، معلوم ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کا قلب دنیوی مسائل اور اسباب کے ساتھ اٹک چکا ہے، مسبب الاسباب کی طرف رجوع رہا ہی نہیں، مصائب اور خوفناک مسائل پیش آنے کے باوجود یہ لوگ کیوں نہ جھکے؟ ﴿وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ان کے دلوں میں سختی پیدا ہوگئی تھی، یہ جو دل میں نرمائی اور دل میں رقت ہوتی ہے جس سے آدمی اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے اور خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے وہ مادہ ہی ان میں باقی نہیں رہا وہ استعداد ہی انہوں نے فنا کردی۔ ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ اور جو کچھ ان کی خرافات اور عمال تھے، وہ شیطان نے کچھ ایسے مزین کردیئے کہ اسی میں الجھ کر رہ گئے کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے، یہی اسباب ہیں تو یہ بھی ہمارے قبضے میں ہیں اور ہمارے پاس سارے جمع ہیں۔ لیکن فرماتے ہیں: ﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ جو کچھ انہیں نصیحتیں کی گئیں عبرتیں دلائی گئیں، وہ سب کچھ وہ بھلا چکے تو ہم نے بھی پھر راحتوں اور آسائشوں کے دروازے کھول دیئے، کہ اچھا چلو کہاں تک چلتے ہو، اور جب دروازے کھل گئے تو انہوں نے دنیا اور اسباب دنیا پر مزید اطمینان کرلیا کہ اب تو ساری چیزیں ہمارے قبضے میں آگئیں، وسائل رزق

ہمارے ہاتھ میں ہیں وسائل نقل وحمل بھی ہمارے ہاتھ میں ہیں وسائل علم وخبر بھی ہمارے ہاتھ میں ہیں جس کو جو چاہیں ہم اطلاع پہنچائیں، دوسری کوئی اطلاع دی نہیں جاسکتی کہ پبلک میں بدگمانیاں پیدا ہوں، اسی طرح وسائل حمل ونقل بھی کہ ہم ہی سواریوں پر لے جاسکتے ہیں، ہمارے ہی ہاتھ میں سب کچھ ہے حتی کہ پبلک کی روشنی اور پانی بھی ہمارے قبضے میں ہے، جب چاہیں اندھیرا کردیں اور جب چاہیں پانی بند کردیں، تو ہم تمام وسائل دنیا پہ قابض ہیں، اب آفت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟ آفتوں کے دروازے تو ہم نے بند کردیئے ہیں تو فرمایا: ﴿حَتّٰی اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْآ﴾ جب وہ مطمئن ہوجاتے ہیں، اتراہٹ میں آجاتے ہیں کہ اب سب کچھ قبضہ میں آگیا۔ ﴿اَخَذْنٰھُمْ بَغْتَةً﴾ اچانک ہماری مصیبت کا پنجہ ان کے سروں پر گرتا ہے۔ ﴿فَاِذَا ھُمْ مُّبْلِسُوْنَ﴾ اب حیرت زدہ ہوکر رہ جاتے ہیں کہ یہ مصیبت کہاں سے آن پڑی، ؟ ہم نے تو چہار طرف سے راستے بند کردیئے تھے اور پوری طرح ناکہ بندی کردی تھی پھر آفت کہاں سے آئی۔؟ اب حیرت میں پڑجاتے ہیں۔

ظلم کا انجام ...... اب کمیشن بیٹھے ہیں کہ اسباب پر غور کیا جائے کہ کہاں سے یہ صورت پیدا ہوئی، اگر عیاذاًباللہ کوئی ہوائی جہاز گرگیا تو بجائے اس کے رجوع الی اللہ کرے، کمیشن بیٹھتا ہے کہ اسباب پر غور کرے کہ مشین میں کیا خرابی تھی، تو مشینوں ہی میں دل الجھا ہوا ہے اس طرف ذہن جاتا ہی نہیں کہ مشینوں سے بالاتر بھی کوئی طاقت ہے، قلوب میں سکت باقی نہیں ہے، اب بھی انہیں اسباب کے جھروکے میں گھر کر اسی پر غور کرتے ہیں، ہم اچانک مصیبت بھیجتے ہیں اور اسباب سمجھ میں نہیں آتے تو حیرت زدہ ہوکر رہ جاتے ہیں ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ①

پھر ظالموں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے، ان کا بیج باقی نہیں رہتا، نہ وہ رہتے ہیں نہ ان کی حیرت باقی رہتی ہے، تو مطلب یہ ہے کہ مصیبت جب آتی ہے تو وہ اطمینان دلاکر نہیں آتی، اچانک آتی ہے لوگ مطمئن ہوتے ہیں کہ اب کوئی چیز آنے والی نہیں ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ بیماریوں پر ہم نے قبضہ پالیا، دوائیں ایجاد کرلیں سواریوں پر ہم نے قبضہ پالیا، مشینیں ہمارے قبضہ میں ہیں، رزق دانے اور پھل پھول سب ہمارے قبضے میں ہیں، اب آخر آفت آئے گی تو کہاں سے آئے گی؟

آفاتِ آخرت کا تدارک بھی نہیں ...... یہ ان کے علم میں نہیں کہ آفات کا پیدا کرنے والا تمہارے سے زیادہ عالم ہے وہ تمہارے سے زیادہ راستے جانتا ہے، جیسے اس کو نعمت کا دینا آتا ہے اس کا چھیننا بھی آتا ہے، سب اسی کے قبضے میں ہے تم تھوڑے سے قبضہ پر آکر اتراہٹ میں آکر اپنی اصلیت کو بھی بھول گئے کہ ہم کیا تھے، اور ہماری طاقت کیا تھی ایسی قوموں کے لئے جب اچانک مصیبت آتی ہے تو جڑ کٹ جاتی ہے، اگر اس میں کوئی سعادت مند ہے اور وہ رجوع الی اللہ کرگیا تو اس کے لئے نیک نتیجہ آجاتا ہے، ورنہ قوم کی قوم کا اقتدار اور اس کی زندگی ختم کردی

① پارہ:۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ:۴۵.

جاتی ہے، اسی کو فرماتے ہیں: ﴿کَذٰلِکَ الْعَذَابُ﴾ اسی طرح آفت آیا کرتی ہے، اور دنیا کی آفت جب آتی ہے تو کوئی اس کا ٹالنے والا نہیں ہوتا، تو ﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَکْبَرُ﴾ پھر آخرت کا عذاب جو ہوگا تو اس کو کون ٹال سکتا ہے؟ دنیا میں انسان سوچ بچار تو کرتا ہے کہ کیا وجہ پیش آئی جو یہ مصیبت پیش آئی آخرت میں سوچ بچار کا بھی راستہ نہیں ہے وہاں براہ راست مسبب الاسباب سے واسطہ ہے وہاں اسباب نہیں ہیں، اس لئے وہاں سوچ اور فکر کا دخل نہیں ہے۔ اس واسطے عبرت دلائی گئی کہ جب دنیا کی آفت آئے تو اس سے عبرت پکڑو اور آخرت کی آفت کو پیش نظر رکھو کہ اس کا تو کوئی تدارک بھی نہیں۔

آفاتِ دنیا کو کم کرسکتا ہے مگر آفاتِ آخرت کو نہیں...... یہاں کم سے کم یہ تو ہے کہ جب آفت آئے تو توبہ کا دروازہ تو بند نہیں ہے، آدمی توبہ کرکے آفت کو ٹال سکتا ہے، مگر آخرت میں تو توبہ بھی قبول نہیں وہاں نہ توبہ کا وقت ہے نہ عذاب کم کرنے کا وقت ہے اور نہ انفعال و ندامت کا وقت ہے یہ سب چیزیں یہاں کام آتی ہیں، تو کوئی سبب اس کو ٹالنے کا باقی نہیں ہوگا، اس واسطے فرمایا: ﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَکْبَرُ﴾ جب دنیا کی آفت کو کوئی ٹالنے والا نہیں باوجودیکہ رجوع کے اسباب موجود ہیں، وہاں تو یہ بھی نہیں ہوگا، عذاب بہت سخت ہوگا، یہ وقتی ہے وہ دوامی ہے، یہ تھوڑے وقت کے لئے آتا ہے، وہ ابد تک کے لئے آتا ہے، اس لئے وہ زیادہ ڈر کی چیز ہے تو دنیا کی مصیبتوں کو نمونے کے طور پر پیش کیا گیا کہ ان سے عذاب آخرت کو سمجھو۔

دنیا کے مصائب میں بہرحال کچھ نہ کچھ اسباب موجود ہیں کہ آدمی مصیبت کو ہلکی کرسکتا ہے، اور اربابِ باطن نے ادھر توجہ دلائی ہے کہ اگر آدمی غور کرے تو مصیبتوں کو ہلکا کرنے کی صورتیں ہیں۔

مصیبت ٹالنے کے لئے حضرت علیؓ کی تدبیر...... چنانچہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے ایک جملہ فرمایا جس سے مصیبت بڑی ہلکی ہوسکتی ہے، فرمایا: جب کوئی مصیبت آئے تو وہ اپنی ایک عمر ساتھ لے کر آتی ہے، تدبیر کئے جاؤ مگر اتنی جدوجہد نہ کرو کہ آج ہی اُسے ٹال دیں، وہ تو اپنے وقت پر ہی جا کے ٹلے گی، تسلی کے لئے کچھ تدبیر کرنا اسباب فراہم کرنا درست ہے، مگر اتنی جلدی کرنا کہ آج ہی ٹل جائے، اس طرح مصیبت میں الجھ کر بعض اوقات مصیبت کی عمر دراز ہوجاتی ہے اگر آدمی پر بیماری آئی ہے تو طبعی طور پر جو تدبیر ہے آدمی کرلے، لیکن بعض لوگ گھبرا کر صبح کو ایک ڈاکٹر دوپہر کو دوسرا اور شام کو تیسرا، ایک طوفان باندھ دیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرض الجھ کر دو دن کی بجائے ہفتہ بھر میں جاتا ہے۔ اس واسطے کہ گویا وہ تقدیرِ خداوندی کا مقابلہ ہوتا ہے، اگر طے شدہ ہے کہ مصیبت ہفتہ بھر کی ہے تو جو دو دن ٹلانا چاہے تو وہ ہفتہ کی بجائے چودہ دن کی ہوجائے گی، اس واسطے طبعی تدابیر اختیار کرکے اللہ پر بھروسہ کرے اور اسی کی طرف رجوع کرے، تو مصیبت آسان ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

''اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوْا عَلَیْہِ''①

① السنن لابن ماجہ، کتاب التجارات، باب الاقتصاد فی طلب المعیشۃ ج:۵ ص:۳۷۸ رقم:۲۱۳۵.

طلب کے اندر جمال پیدا کرو، اسباب فراہم کرو مگر جمال کے ساتھ اتنا گلو اور انہاک کہ بس اسباب ہی کے بندے بن جاؤ، یہ نہیں ہونا چاہئے حکم خداوندی سمجھ کر تدبیر کے درجے میں اسباب اختیار کرو مگر بھروسہ حق تعالیٰ کے اوپر کرو کہ دراصل وہی ٹالنے والا ہے، اسباب ٹالنے والے نہیں ہیں، طبیب مرض کو رفع نہیں کر سکتا، اللہ ہی دفع کرے گا۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلطَّبِیْبُ ھُوَ اللّٰہُ وَالطَّبِیْبُ ھُوَا لرَّفِیْقُ'' طبیب محض ایک رفیق ہے، مگر حقیقت میں طبیب وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو مرض کو دور فرماتے ہیں۔ دافع امراض، حل مشکلات اور دافع مشکلات صرف حق تعالیٰ ہیں، طبیب صرف رفاقت کرتا ہے، کچھ تسلی دے دیتا ہے اور کچھ اسباب کی طرف توجہ دلا دی، لیکن وہ اسباب مرض کو دفع نہیں کرتے اس لئے کہ ان میں تاثیر رکھنے والے حق تعالیٰ شانہ ہیں، اگر وہ تاثیر کھینچ لیں تو وہ سبب ہی کیا کرلے گا؟ اس لئے موثر حقیقی موثر بالذات وہ ذاتِ بابرکات حق ہے اس لئے اسباب اختیار کرو، مگر مسبب الاسباب کو مت بھولو، اطمینان ان پر نہ کرو، اطمینان اللہ کی ذات پر کرو، اس کی صورت یہی ہے کہ اسباب میں غلو اور مبالغہ کر کے مصیبت کی مدت مت بڑھاؤ!

تو حضرت علیؓ نے کیسی حکمت کی بات بتلائی کہ ہر مصیبت ایک وقت لے کر آتی ہے اور اسی وقت پہ وہ ٹلے گی، اس لئے طبعی طور پر اسباب اختیار کرو، مگر غلو مت کرو، اللہ پر چھوڑ دو، تھوڑے بہت اسباب اختیار کرو، اور اللہ پر توکل کرو۔

مصیبت پر حضرت عمرؓ کا قول...... اس کے علاوہ ایک دوسری عجیب وغریب تدبیر حضرت عمر فاروقؓ نے بیان فرمائی۔ فرمایا: جب کوئی مصیبت آئے تو پہلے یہ سوچو کہ یہ مصیبت میری دنیا پر آئی ہے یا میرے دین کے اوپر آئی ہے، آیا کوئی میرا عقیدہ بگڑا یا میرا عمل خراب ہوا، یا خدا نہ کرے میرا قلب اللہ سے منحرف ہوگیا، کوئی ایسی صورت تو نہیں ہوئی بلکہ دنیا پر مصیبت آئی فرمایا اگر یہ بات یقین میں آگئی کہ مصیبت دنیا پر آئی ہے اور دین محفوظ ہے تو اطمینان حاصل کرو کہ ایسی چیز پر مصیبت آئی کہ جو زائل ہونے والی ہی تھی بس دو دن پہلے زائل ہوگئی مال ہو فقر ہو، غنا ہو فقر ہو، ایک دن سب ختم ہو جانے والا ہے یہ دوامی چیز نہیں ہے۔ نہ ایک لکھ پتی کی دولت دوامًا باقی رہے گی نہ ایک فقیر کا فقر وفاقہ باقی رہے گا، یہ چند روزہ بہار ہے، اس سے زیادہ یہ کچھ نہیں، تو اگر دولت پر یا جائیداد پر بنی، فرمایا اطمینان حاصل کرو، دین محفوظ ہے جو کچھ بنا دنیا کے اوپر بنا، اس سے ایک تسلّی کی صورت پیدا ہوئی ہے۔

مصیبت میں بھی نعمت کا پہلو ہے...... لیکن بہر حال دین محفوظ ہے مگر دنیا تو گئی، تو اس کے بعد اس پر غور کرو کہ اگر یہ دنیا گئی تو تو نے ضرور کوئی حرکت کی ہوگی، اس کی پاداش میں یہ ایک مصیبت پڑی، تو یہ مصیبت تمہارے لئے کفارے کا ذریعہ بن رہی ہے، کہ جو پچھلے گناہ تھے اس کو مٹا رہی ہے پھر یہ مصیبت مصیبت نہ رہی یہ تو نعمت بن گئی کہ جس نے گناہوں کو مٹانا شروع کیا، روح کے اندر کا میل کچیل ختم کرنا شروع کیا، مصائب کے اندر یہی ہوتا ہے کہ جوں جوں آدمی صبر کرتا ہے ویسے ویسے اس کی روح کے اندر اخلاق کی پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، اور مصیبت وغفلت کا میل کچیل ٹوٹتا

ہے اور کتنا ہے پھر روح کے اندر پاکی آتی ہے تو دین تو محفوظ رہا کہ دنیا پہ مصیبت آئی اور وہ مصیبت گناہوں کے کفارہ کا ذریعہ بنی تو وہ معصیت کیا وہ تو بڑی عمدہ نعمت بن گئی جس سے میل کچیل ڈھل گیا، تو یہ مصیبت نہ ہوئی بلکہ اللہ نے دھوبی لگا دیا کہ روح کو بھگو بھگو کر مار کر میل کچیل سے پاک اور صاف کر دیا، تو یہ دوسری وجہ تسلّی کی ہوئی۔ غرض جو مصیبت آئی تو یہ غور کرو کہ دین پر تو نہیں آئی، دنیا پہ آئی تو ایک تسلی تو یہ ہوئی کہ الحمد اللہ دین محفوظ ہے، اب اگر دنیا پہ آئی تو غور کرو کہ اگر آئی ہے تو گناہوں کا کفارہ بن گئی، تو یہ دوسری تسلی حاصل ہوئی، اگر چند پیسے اور چند سامان چلے بھی گئے تو جو کچھ روح کے اندر آتا ہے وہ کتنی بڑی دولت ہے کہ ایمان تازہ ہو گیا اور معصیتوں سے پاک ہو گیا۔

علم دین اور دنیوی بادشاہت کا تقابل...... کہتے ہیں کہ ایک بزرگ چلے جا رہے تھے، ان کے پاس نہ سامان نہ کچھ زیادہ اسباب وسائل بس پھٹے پرانے کپڑے، مگر بہر حال یہ لوگ قلوب کے بادشاہ ہوتے ہیں اور ظاہر سے مسکین نظر آتے ہیں، اس معمولی حالت میں ایک بڑے شہر سے گذر ہوا، اس زمانے میں شہر کے اردگرد دیوار ہوتی تھی، جسے شہر پناہ کہتے تھے تو ایک بہت بھاری قلعہ تھا اور اندر شہر تھا، تو دیکھا کہ قلعے کے سارے دروازے بند ہیں، نہ اندر کی گاڑیاں باہر آ رہی ہیں اور باہر ہزاروں گاڑیاں مال و اسباب سے لدی کھڑی ہیں، جو شہر میں جانے والی تھیں وہ سب رُکی کھڑی ہیں اور شہر کے دروازے چاروں طرف سے بند ہیں۔

انہوں نے پوچھا کہ اتنا بڑا شہر دن میں دروازے بند کر دیئے، تو معلوم ہوا کہ اس شہر کا جو بادشاہ ہے اس کا باز گم ہو گیا یہ ایک پرندہ ہوتا ہے جس سے شکار کرتے ہیں، اس نے کہا شہر کے دروازے بند کر دو کہیں باہر نہ نکل جائے، انہوں نے کہا لاحول ولا قوۃ عجیب قسم کا بادشاہ ہے کہ باز کو روکنے کے لئے دروازے بند کر رہا ہے حالانکہ وہ اڑنے والی چیز ہے اگر جال ڈلوا دیتا تو خیر ایک امید بھی تھی کہ وہ اڑ نہ سکے رک جائے دروزوں پر تالے ڈلوا دیئے بھلا باز کیسے رکے گا۔؟ ان کو بڑی ہنسی آئی اور عرض کیا۔

یا اللہ! آپ کے عجیب حکمت کے کارخانے ہیں اس کندۂ ناتراش کو تو بادشاہ بنا دیا جسے اتنی بھی عقل نہیں کہ پرندے کو روکنے کے لئے جال ڈالنا چاہئے، یا دروازے بند کرنے چاہئیں، اور مجھ جیسے فاضل کو جس میں علم اور معرفت ہے، جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں نہ سواری ہاتھ میں نہ وسائل ہاتھ میں نہ کوئی پوچھنے والا ہے تو آپ کی عجیب شان ہے کہ اس کندہ ناتراش کو بادشاہ بنا دیا اور مجھ جیسے فاضل کو محروم رکھا۔

جیسے وہ تلخیص والے نے کہا۔

کَمْ عَـاقِلٍ عَـاقِلٍ اَعْيَتْ مَذَاهِبُهٗ ۔۔۔ وَكَمْ جَاهِلٍ جَاهِلٍ تَلْقَاهُ مَرْزُوْقًا

هٰـذَا الَّذِىْ تَـرَكَ الْاَوْهَـامَ حَـائِرَةً ۔۔۔ وَجَعَلَ الْعَـالِمَ النِّحْرِيْرَ زِنْدِيْقًا

• جس کا مفہوم یہ ہے کہ بہت سے عقل منداور دانش مندان کو تم دیکھو گے کہ وہ بالکل مفلس قلاش اور بے وسیلہ پھر رہے ہیں جوتیاں چٹخارہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، اور بہت سے جاہل جنہیں بات کرنے کی تمیز

نہیں، کروڑ پتی بنے ہوئے ہیں تو دنیا کا عجیب کارخانہ ہے کہ فضلا جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں اور جہلاء اس طرح کمائیں اور کروڑ پتی بن جائیں۔ تو شاعر کہتا ہے کہ وہ چیز ہے جس نے عقلوں کو حیرت میں ڈال رکھا ہے کہ یا اللہ! تیری قدرت کہ ان عقل والوں کو کہاں پہنچادیا اور کہاں یہ جاہل ان کو کہاں تک پہنچادیا۔

غرض اسی طرح سے اس بزرگ کے دل میں بھی گویا ایک گونہ شکایت کا پہلو آیا، اگر چہ وہ وسوسہ کے درجے میں تھا، اس لئے کہ اہل اللہ کبھی اللہ کی شکایت نہیں کرتے تو تحیُّر کا اظہار کیا کہ یا اللہ یہ کیا بات ہے؟ کہ مجھ جیسے فاضل کی تو یہ حالت اور یہ کندۂ ناتراش بادشاہ، تو حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ: کیا آپ اس کے لئے تیار ہو کہ اس بادشاہ کی ساری دولت ملک و مال سب چھین کر تمہیں دے دیں، اور تمہارا ایمان اور علم و معرفت چھین کر بادشاہ کو دے دیں، کیا اس سودے پر تیار ہو؟ تھرّا گئے کہ یا اللہ! نہیں، فرمایا تمہیں اتنی بڑی دولت دی ہے کہ اس دولت کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کرسکتی، اور تم اس چندروزہ دولت پر حرص کرنے لگے تمہیں ایمان، علم معرفت توکل صبر دیا، حضرات انبیاء علیہم السلام کے اخلاق دیئے، اب بھی آپ یہ سمجھ رہے ہو کہ میں مفلس ہوں، مفلس وہ ہے جس کے پاس ایمان نہ ہو، یہ چندروزہ مفلس ہے دوامی مفلس وہ ہے جس کا قلب ایمان اور علم سے خالی ہو، اس لئے جس کو علم اور معرفت کی دولت دی گئی، وہ اتنی بڑی دولت ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے ہفت اقلیم کی سلطنت بھی آجائے تو اس دولت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

دولتِ ایمان اور دولتِ دنیا کی تقسیم میں عدلِ خداوندی...... حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں، یہ تین بزرگ ایک ہی زمانے میں گزرے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مرزا مظہر جان جاں، اور حضرت شاہ غلام علی رحمہم اللہ تینوں بڑے پائے کے بزرگ ہیں، رنگ تینوں کے الگ الگ ہیں، تو شاہ غلام علیؒ سے ٹونک کے نواب میر خاں بیعت تھے، شاہ غلام علیؒ کے ہاں مہمان داری اتنی تھی کہ چار چار سو مہمان ایک ایک وقت میں ہوتے اور ظاہر میں نہ کوئی تجارت نہ ملازمت تھی نہ کوئی آمدنی کا ذریعہ تو نواب میر خاں نے سوچا کہ شیخ کو بڑی مصیبت پیش آتی ہوگی، مہمان داری کی کثرت ہے اور گھر میں کچھ ہے نہیں، کوئی جائیداد نہیں کوئی تجارت نہیں، گویا شیخ صاحب پر بڑا رحم آیا، تو انہوں نے اپنی ریاست کا ایک پورا ضلع اس کے بارے میں ایک پیتل کے پتے کے اوپر لکھ کر بھیجا کہ آج سے اس کو آپ کے نام کرتا ہوں یہ پورا ضلع آپ کی مِلک ہے اس کی لاکھوں روپے سال کی آمدنی ہے تو آپ کے لئے مہمانداری اور ضیافت میں آسانی ہوگی، اور وہ بھی کاغذ پہ نہیں لکھ کر بلکہ پیتل کے پتے کے اوپر پختگی کے ساتھ کہ آج سے یہ پورا ضلع میں نے آپ کے حوالے کردیا، حضرت شاہ صاحبؒ کے پاس یہ پتہ پہنچا، تو نواب صاحب تو یہ سمجھ رہے تھے کہ میں نے بہت بڑی چیز پیش کی ہے اور حضرت شاہ غلام علیؒ کے تو گویا جان میں جان آجائے گی کہ اس نے بڑے وقت پہ خبر گیری کی کہ میرے مہمان تھے یہ مصیبت پڑتی تھی ایک ضلع دے دیا تو اب آسانی سے مہمانوں کی مدارات کروں گا، تو یہ اپنے ذہن میں سوچ رہے تھے۔ لیکن جب یہ

چیتل کا پتہ پہنچا تو اسی وقت اسی چیتل کے پتے کی پشت پر جواب لکھا اور شعر لکھ کر بھیج دیا، نہ القاب و آداب نہ محبت و کشر یہ کہ آپ نے لاکھوں روپے کی مالیت کا ضلع دیا، کچھ نہیں صرف ایک شعر لکھ کر بھیج دیا وہ شعر کیا تھا؟

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم　　بامیر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

ہم اپنے فقر و فاقہ کی آبرو کھونا نہیں چاہتے، میر خاں سے کہہ دو کہ روزی مقرر ہے جو آسمان سے آ رہی ہے، تیرے ضلع کے ہم محتاج نہیں ہیں یہ قناعت ہے، تو یہ دولت اتنی ہے کہ اتنی بڑی مالیت کا ضلع وہ قوت نہیں رکھتا تھا جو صبر و توکل توجہ الی اللہ اور اللہ پر بھروسہ میں ہے، سارے اعتماد کی جڑ بنیاد تو ہاتھ میں ہے اور کیا نعمت چاہئے؟

بہرحال حق تعالیٰ کے ہاتھ عدل ہے کسی کو دولتِ ایمان اور دولت علم دیتے ہیں، وہاں دولت دنیا کم دیتے ہیں اور جہاں دولتِ دنیا زیادہ ہوتی ہے وہاں ان دولتوں کی کمی ہوتی ہے، ایک تو کفار ہیں ان کی بات نہیں ایمان والوں میں ہی جہاں دولت زیادہ ہوتی ہے تو طبعی طور پر ہی ایمانی اور علمی قوت کم ہوتی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ساری توجہ تو اسی کے بڑھانے کی طرف رہتی ہے ایمان وعلم کی طرف توجہ کم ہوتی ہے تو طبعاً یہ چیز گھٹ جاتی ہے اور وہ بڑھ جاتی ہے اور جن کو علم دیا جاتا ہے ان کی ساری توجہ علم کے بڑھانے کی طرف ہوتی ہے، انہیں دنیا بڑھانے کی فرصت کہاں ہوتی ہے۔؟ تو صورت یہ کہ ان کی دنیا کے لئے تو حق تعالیٰ دلوں میں ڈالتے ہیں کہ لوگ ان کی خدمت کریں اور ان کے دلوں میں غیرت ایمانی کی کمی ہے تو اہل علم کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ وہ اپنے علم سے ان کی خدمت کریں، تو دونوں کے لئے کچھ سہارے لگا دیئے ہیں، مگر یہ طبعی چیز ہے، کہ اگر ادھر کی دولت زیادہ ہے تو ادھر کی کم ہے، ادھر کی زیادہ ہے تو ادھر کی کم ہے جامع ہستیاں کم ہیں کہ علم بھی پورے کا پورا اور دولت بھی پوری کی پوری مالدار بھی بہت اور عالم بھی بہت ایسے افراد گنے چنے ہیں ورنہ عام طور پر یہی ہے کہ دولت دین زیادہ تو دولت دنیا کم ہے، اور دولت دنیا زیادہ تو دولت دین کم، دونوں چیزیں ترازو کے پلّے کی طرح سے ہیں، ایک جھکتا ہے تو دوسرا اونچا ہو جاتا ہے، دوسرا جھکا تو ادھر کا اٹھ گیا، حاصل یہ نکلا دولت ایمان بہت بڑی دولت ہے، توکل صبر و قناعت حق تعالیٰ جس کو دے دیں یہ عظیم نعمت ہے اس کے ہوتے ہوئے دوسری دولت بھی ہاتھ سے نہیں جاتی حدیث میں فرمایا گیا ہے جو حق تعالیٰ پر بھروسہ کر لیتا ہے تو: ''اَتَتِ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ'' ① دنیا سر پر خاک ڈالتی ہوئی ذلیل بن کر اس کے قدموں میں آکر گرتی ہے، خود بخود آتی ہے وہ دھکے بھی دے تب بھی وہ آتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیا کے کام بھی پورے کر دیتا ہے، چنانچہ وعدہ خداوندی ہے: ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ ② جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، تو اللہ اسکے لئے کافی ہو جاتا ہے وہ اس کا کام بنا دیتا ہے، حدیث میں فرمایا گیا ہے ''مَنْ اَصْلَحَ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ اَصْلَحَ اللّٰهُ فِيْمَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْخَلْقِ'' ③ جو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کا معاملہ صاف اور سچا کرے، تو

① السنن لابن ماجه، كتاب الزهد، باب الهم بالدنيا ج: ١٢ ص: ١٢٨ رقم: ٤٠٩٥. ② پارہ: ٢٩، سورة: الطلاق، الآية: ٣. ③ كنز العمال، الديلمي، عن قدامة بن عبدالله بن عمار رجل له صحبة ج: ١٥ ص: ٧٩٨ رقم: ٤٣١٦٦.

اللہ اس کے اور مخلوق کے درمیان کا معاملہ سچا کر دیتا ہے، اس کے معاملات صحیح ہوتے ہیں، اگر کہیں پھنس جاتا ہے تو غیب سے اس کے لئے مخرج پیدا ہو جاتا ہے اور راہیں نکل آتی ہیں، حاصل یہ نکلا کہ اصل تو دولت دین کو سمجھا جائے، اس کو مقصودِ زندگی بنائے اور دنیا کو بھی کمایا جائے اس لئے کہ حکم ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مت بیٹھو، بس اولیت اور ثانویت کے درجے کا فرق ہو، اولیت دولتِ دین کو حاصل ہو اور ثانوی درجہ دولت دنیا کو ہو، دونوں چیزیں رہیں گی کسی وقت بھی آدمی محروم نہیں رہے گا، اب جتنا جس کی قسمت میں ہے اس کا مقدر اس کو مل جائے گا، تو خلاصہ یہ نکلا کہ آفت یا مصیبت اچانک آتی ہے، وہ اطلاع دے کر نہیں آتی، اس وقت کوئی ٹالنے والا نہیں ہوتا، تو عبرت دلائی گئی کہ جب دنیا کی مصیبت کا ٹالنے والا کوئی نہیں، اللہ ہی ٹالے تو ٹال سکتا ہے، تو آخرت کی مصیبت کو تو کوئی ٹالنے والا ہے ہی نہیں، صرف اللہ کی ذات ہے وہی ٹالے تو ٹل سکتی ہے، اس لئے اس سے عبرت پکڑیں، مگر فرماتے ہیں ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ کاش کہ یہ جاہل جانتے، مگر یہ تو ادھر دل لگاتے ہی نہیں کہ یہ کوئی اصول کی بات سمجھیں، یہ تو عناد، تعصب، برائی اور نبی کے مقابلے میں ہیں کہ کسی طرح انہیں نیچا دکھاؤ، نہ انہیں عقل سے تعلق نہ علم سے تعلق کہ بات کو سمجھیں۔ ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ کاش کہ یہ جانتے۔

مطیع و باغی برابر نہیں ہو سکتے...... اور اگر جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو اوندھی سمجھتے ہیں، ہر سیدھی بات کو الٹا کر کے سمجھیں گے ایسا سمجھا تو کیا سمجھا؟ گویا عجیب وغریب نتیجہ نکالا چنانچہ کہتے ہیں۔ آپ کے خدا نے باغ والوں کی مثال بیان کی ہے، اور وہ پانچ بھائی تھے، ایک نے کہا کہ دیکھو ایسا مت کرو، فقیروں کا راستہ مت بند کرو، خیرات جاری رکھو، برے کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے اس کی نہیں سنی، لیکن جب مصیبت آئی تو نیک مشورہ دینے والا بھی اس میں مبتلا ہوا، یہ نہیں ہوا کہ اس کا حصہ بچ گیا ہو اور باقی بھائیوں کا تلف ہوا ہو، تو نتیجہ یہ نکالا کہ ہم بھی تمہارے نبی کو نہیں مانتے تمہارے دین کو نہیں مانتے، لیکن اگر کوئی قحط وغیرہ کی مصیبت آئی تو تم بھی مبتلا ہو گے ہم بھی مبتلا ہوں گے، کوئی ہمارے دروازے کو دیکھ کر تھوڑا ہی قحط آئے گا، تم بھی اس میں شریک ہو گے، تو جب ہم تم یہاں مصیبت میں شریک ہیں تو کیا فائدہ کہ ہم تمہارے رسول کے اوپر ایمان لائیں، یہاں بھی برابر وہاں بھی برابر، یہاں کی برابری آنکھ سے دیکھ لی وہاں کی برابری قیاس سے سمجھ لیں، جیسے خدا نے یہاں برابر کیا، وہاں بھی برابر ہو جائیں گے، گویا طبعی مصیبت میں اور انتقامِ خداوندی میں فرق کرنے کی ان کے اندر سکت ہے ہی نہیں۔

اس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ تو بداہتِ عقل کے خلاف ہے جو تم سوچ رہے ہو۔ اس لئے کہ مثلاً دنیا میں ایک شخص کے دو غلام ہیں، ایک سرکش ہو اور ایک مطیع ہو، تو کیا آقا ان دونوں کو برابر سمجھتا ہے، مطیع غلام کو ہمیشہ انعام دے گا اور سرکش کو ہمیشہ نیچا دکھائے گا، ایک گورنمنٹ کے دو ملازم ہیں، ایک کام چور ہے اور ایک نہایت محنت سے کام کرتا ہے، ایک بغاوت کرتا ہے ایک اطاعت کرتا ہے تو کیا گورنمنٹ دونوں کو ایک نگاہ سے دیکھے گی؟ جو باغی ہے اس کو سزائیں دے گی، جو مطیع ہے اس کو انعامات دے گی اور ترقیات دے گی، دنیا کا یہی دستور ہے کہ جو انتقامی طور

پر مصیبت آتی ہے وہ باغی کے اوپر آتی ہے، مطیع کے اوپر نہیں آتی، زیادہ تر باغی کے اوپر آتی ہے، تو عقل اس کے اوپر شاہد ہے کہ اگر کوئی بغاوت کررہے ہوں تو قحط اگر ان پر آئے گا تو وہ سزا ہوگی جس سے بچنا مشکل ہوگا، مطیع اگر قحط میں آئیں گے تو چونکہ اللہ پر بھروسہ ہوگا تو ہمارے دلوں میں کوئی پراگندگی یا تشویش نہیں ہوگی، چند دن کے بعد وہ رفع ہوجائے گا اور جب تک رہے گا ہمارے دلوں میں کوئی تشویش نہیں ہوگی اور تم مرنے سے پہلے ہی مرجاؤ گے، جس کے دل میں ایمان ہوتا ہے اس پر اگر مصیبت آتی بھی ہے تو اس کے دل میں پراگندگی نہیں ہوتی حق تعالیٰ پر مطمئن رہتا ہے کہ یہ چند روزہ ہے، فاسق اور ملحد مرنے سے پہلے مرجاتا ہے اسلئے کہ اس کا بھروسہ ہی اسباب کے اوپر ہوتا ہے، اور اسباب کے درجے میں راحت کی کوئی چیز نہیں ہے، غرض یہ فرق رہتا ہے کہ ایک چیز آفت کی مطیع پر بھی آتی ہے، اور باغی پر بھی، مطیع اپنی اطاعت کی وجہ سے مطمئن القلب ہوتا ہے اور باغی اپنی بغاوت کی وجہ سے ہر وقت پراگندہ قلب رہتا ہے، اور مصیبت نام دل کی پراگندگی کا ہے اسباب مصیبت کا نام مصیبت نہیں ہے دل میں پریشانی کا اثر ہو یہ مصیبت ہے، کوئی آفت آجائے تو مومن کے دل میں کبھی پریشانی نہیں ہوگی، اس کی نگاہ اللہ پر ہوگی، اور ملحد کا دل کبھی مطمئن نہین ہوگا اس کی نگاہ اسباب پر ہے اور اسباب کے درجہ میں مصیبت آگئی ہے، فرمایا کہ یہ ہدایت عقل کے خلاف ہے جو تم نے نتیجہ نکالا مطیع اور باغی برابر نہیں ہوسکتے اسی کو فرمایا: ﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ﴾ کیا ہم مسلمین کو مجرمین کے برابر کردیں گے، جو ہمارے ماننے والے ہیں اور جو ہمارے باغی ہیں کیا ان کو ایک درجہ میں رکھیں گے؟ ﴿مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ﴾ تمہیں ہوا کیا ہے تم کیسا حکم لگارہے ہو، عقل کے خلاف، فراست کے خلاف اور فطرت کے بھی خلاف، تو ایک جواب تو عقلی دے دیا۔

دنیا میں اجتماعی عذاب کے باوجود آخرت میں مؤمن وکافر کا فرق ہوگا......اس کے بعد ممکن تھا وہ یہ کہتے کہ صاحب! عقلاً تو چاہے یہی جواب ہے مگر نقل تو یہی بتاتی ہے کہ جب اللہ کی طرف سے مصیبت آتی ہے تو سب پر یکساں ہی آتی ہے اور جب یہاں یکساں ہے تو آخرت میں بھی جب مصیبت آئے گی تو ہم پر بھی آئے گی تم پر بھی آئے گی؟ وہاں بھی برابر ہوگئے۔ اس کا جواب آگے دیا کہ یہ جو تم عقل کو چھوڑ کر نقل لے رہے ہو تو فرمایا ﴿اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ﴾ یہ تم نے جو نقلی روایت بیان کی کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے یا پچھلے ادیان کا کوئی نوشتہ تمہارے پاس رکھا ہوا ہے؟ جس میں دیکھ کر تم نے دعویٰ کیا کہ قیامت میں مسلم اور مجرم برابر ہوجائیں گے، عقلاً تو برابر نہیں ہوتے، اب تم نقل کا دعویٰ پیش کرتے ہو؟ تو کوئی کتاب دکھلاؤ کوئی آسمانی نوشتہ دکھلاؤ، جس میں یہ لکھا ہوا ہو کہ اللہ کے ہاں مطیع اور باغی دونوں برابر ہوتے ہیں، دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈال جاؤ، کیا حضرت موسیٰ اور فرعون کو معاذ اللہ حق تعالیٰ نے ایک درجے میں رکھا، موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی اور فرعون کو غرق کیا، کیا حضرت ابرہیم اور نمرود کو معاذ اللہ حق تعالیٰ نے ایک درجہ میں رکھا، نمرود کو مچھر سے پٹوادیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام عالم بنادیا، غرض حق تعالیٰ نے ہر زمانے میں مطیع اور مجرم دونوں کو یکساں نہیں رکھا، مطیعوں کو سربلند کیا اور مجرموں کو سزائیں

دیں، لیکن اگر تم کہتے ہو کہ مطیع وباغی کو اللہ نے یکساں کیا تو یہ تمہارے پاس کہاں سے خبر آئی؟ کوئی وحی آئی، کوئی کتاب آئی؟ ﴿اَمْ لَکُمْ کِتٰبٌ فِیْهِ تَدْرُسُوْنَ﴾ کوئی کتاب ہے جس کا تم درس دے رہے ہو؟ اس میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کی طرف سے تمہارے اوپر کوئی الہام آ گیا ہے۔ ﴿اِنَّ لَکُمْ فِیْهِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ﴾ اس کتاب میں لکھا ہوگا کہ جو تم چاہتے رہو گے وہی ہوتا رہے گا، جو تم الٹے سیدھے اصول بیان کردو گے وہی کتاب میں نکلتا رہے گا کیا ہے ایسی کوئی کتاب؟ نہیں ہے تو نہ تمہاری بات کو عقل تسلیم کرتی ہے نہ نقل تسلیم کرتی ہے۔ ﴿اَمْ لَکُمْ اَیْمَانٌ عَلَیْنَا بَالِغَةٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ﴾ اچھا اگر نوشتہ نہیں ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تمہیں آخرت میں مصیبت کے اندر برابر کردے گا، تو کیا اللہ نے کوئی قسم کھا رکھی ہے کہ اگر دنیا میں تم پر قحط بھیجے تو آخرت میں بھی سب پر یکساں مصیبت بھیجے گا؟ کیا ہم نے کوئی حلف اٹھایا ہے کہ قیامت تک اور اس کے بعد تک یہ حالت رکھیں گے، دنیا کے اندر جب ہم نے قحط اتارا تو مصلحتاً مسلم اور مجرم دونوں کو برابر کیا، طاعون آیا تو سب کے اوپر آیا، لیکن کیا اللہ نے یہ عہد کیا ہے کہ قیامت میں بھی یہی صورت رہے گی، صاف صاف فرمادیا کہ اگر وبائی امراض میں برابر سرابر مریں تو ظاہر میں سب مر رہے ہیں، مگر آخرت میں سب کے درجات الگ الگ ہیں، ایک مقبول ہے اور ایک غیر مقبول ہے ایک پر طاعون آتا ہے وہ شہید ہوتا ہے اور ایک پر طاعون آتا ہے تو وہ معذّب ہوتا ہے، تو کفار کے حق میں طاعون عذاب ہے، اور مومن کے حق میں شہادت اور ترقی درجات کا ذریعہ ہے، تو یہ اندازہ تم نے کہاں سے لگایا کہ اگر ہم نے انہیں دنیا میں بیماری میں برابر کردیا تو نتائج میں بھی برابر کردیں گے آخرت میں مطیع اور مجرم میں کوئی فرق نہیں رہے گا، کوئی حلف اور کوئی نوشتہ دکھلاؤ یا ہم نے تمہارے سامنے کوئی قسم کھائی ہو تو اسے دکھلاؤ۔

اخذ نتائج میں غلطی ...... اچھا اگر یہ نہیں (یعنی حلف اور نوشتہ نہیں) یہ جو تمہارے شرکاء ہیں جن کو تم اللہ کے ساتھ عبادت میں شریک کرتے ہو، یہ جو تم نے بت رکھے ہوئے ہیں جن کو تم نے کرتا دھرتا مان رکھا ہے اور سارے عالم کی باگ دوڑ انہیں دے رکھی ہے، ذرا ان سے پوچھ لیں یہی جواب دے دیں کہ انہوں نے تمہارے کان میں کوئی بات کہہ دی، ان میں بولنے کی طاقت نہیں ان میں سننے کی طاقت نہیں، کل یہ پتھر پڑے ہوئے تھے، تم نے خود ہی آج ان کو گھڑ گھڑا کے رکھ لیا، آج خدا بنالیا، تو کیا خدا بن گئے؟ اور سارے جہاں کی باگ ڈور کے مالک ہوگئے؟ اگرچہ ایسا نہیں ہے، لیکن بہرحال تم نے انہیں خدا کا شریک ٹھہرایا ہے تو چلو انہیں سے پوچھ لو، کیا انہوں نے تمہارے دماغ میں ٹھونس دیا ہے کہ قیامت میں جاکے دونوں (مسلم، مجرم) برابر رہیں گے؟ اگر دنیا کی مصیبت یا وباء میں مومن وکافر مشترک ہوگئے تو آخرت میں بھی برابر ہوں گے؟ اسی کو فرمایا: اپنے ان شریکوں کو ہمارے سامنے لے آؤ، خدا کے مقابلے میں لاکے پیش کردو یہ اپنا دعویٰ ثابت کریں۔ ﴿سَلْهُمْ اَیُّهُمْ بِذٰلِکَ زَعِیْمٌ﴾ تم میں سے جو اس کا لیڈر بننا چاہے اسے بنا کے ساتھ لے آئے، لات ہو یا عزّیٰ ہو یا کوئی بڑے سے بڑا ہو، اگر سب نہ آئیں تو ایک وکیل بن جائے اور آکر اپنا دعویٰ ثابت کرے۔

الغرض یہ کہ جو تم دعویٰ کر رہے ہو اس باغ والے قصے سے تم نے الٹا سمجھا تو نہ تو عقل اس کا ساتھ دیتی ہے نہ نقل اس کا ساتھ دیتی ہے، نہ یہ شرکا ہی زعیم بن کے آگے آتے ہیں، نہ ہم نے تمہارے سامنے کوئی حلف ہی اٹھایا ہے، پھر آخر حجت کیا ہے؟

قرآن کریم اصولی کتاب ہے وہ نہ کسی چیز کو بلا حجت منوانا چاہتا ہے نہ خود بلا حجت کچھ مانتا ہے اس لئے جو دعویٰ کیا اس کے لئے دلائل پیش کئے، اور اگر کوئی دوسرا دعویٰ کرے تو فرماتے ہیں: ﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ ① کوئی حجت اور دلیل عقل سے نقل سے، تاریخ سے لاؤ، کسی دلیل سے آپ نے کوئی معقول دعویٰ ثابت کیا تو ہم مان لیں گے، دعوے کی پشت پر نہ تو عقل ہو تاریخ ہو نہ کوئی زعیم اور لیڈر ہو جو دعوے کی ذمہ داری لے کہ میں دعوے کو ثابت کروں گا، آخر اس دعوے کو کیوں مانا جائے؟ دعوے کے لئے ماننے کی چیز دلیل ہوتی ہے جو دعوے کو منواتی ہے نہ نقل نہ عقل بلا دلیل دعویٰ ماننے کو کوئی تیار نہیں کوئی آدمی دعویٰ کر دے کہ ساری بمبئی کا میں مالک ہوں، اس سے پوچھا جائے گا کہ بھائی کیا وجہ ہے کوئی دلیل بھی ہے؟ کوئی پرچہ اور دستاویز لکھی ہوئی ہے کہ پچھلے لوگ کہہ گئے ہیں کہ تم بمبئی کے مالک بنا دیئے جاؤ گے تو کہتا ہے کہ نہیں ان میں سے تو کوئی بات نہیں بس میں کہتا ہوں تو کہا جائے گا کہ تو کیا چیز ہے جو تو کہتا ہے تیرے تخیل میں اگر آ گیا کہ میں ساری دنیا کا مالک ہوں بس ہو گیا مالک، نہیں بلکہ حجت اور دلیل مانگی جائے گی جب دلیل نہیں تو دعویٰ ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے قبول کیا جائے۔

تو یہاں تک گویا یہ واضح فرمایا گیا کہ ان کفار میں تو عقل ہے نہیں، کہ واقعات اور حوادث کو دیکھ کر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچیں، اگر ان پر غور کرنے کو کہا تو الٹے نتائج نکالنے شروع کر دیئے اور وہ بھی اپنی ہی من مانی کی اور بات آگے چلا دی کہ صاحب جب باغ والے واقعہ میں سب برابر ہو گئے وہ بھی برابر ہو گیا جس نے کہا تھا کہ فقیروں کے راستے مت روکو، اس کا بھی حصہ گیا وران کا بھی گیا جو فقیروں کے راستے بند کرتے تھے، تو ایسے ہی اگر دنیا کا ہمارا حصہ قحط میں جائے گا تو تمہارا بھی جائے گا، جب دنیا میں یہ ہوا تو آخرت میں بھی ہم تم برابر ہیں، اگر مصیبت آئی تو نتائج میں سب شریک رہیں گے، اس کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے رد کر دیا کہ اگر دنیا میں کبھی مصائب میں سب یکساں نہیں ہوتے، مومن کے قلب کو ایمان اور توکل کی وجہ سے ایک ڈھارس رہتی ہے مصیبتیں آ جاتی ہیں تو وہ اثر نہیں لیتا، جبکہ ملحد کے قلب کے اندر ہر وقت تشویش اور پراگندگی رہتی ہے تو مصیبت کے اندر یہاں بھی برابر نہیں بھلا آخرت کے اندر تو کیا برابر ہوں گے، اور اگر کوئی دعویٰ کرتے ہو تو دلیل لاؤ، دلیل ہے نہیں، لہٰذا تمہارا دعویٰ نامعقول ہے، اس لئے بات وہی رہی کہ حوادث سے عبرت پکڑو، اس سے اپنے حالات درست کرو، ان کو دیکھ کر سمجھو کہ یہ منجانب اللہ واعظ ہیں اور نصیحتیں ہیں جو منجانب اللہ کی جا رہی ہیں تا کہ اپنا مستقبل درست کریں۔

ہر کرّہ کا تغیر کسی جابر قوت کی نشاندہی کرتا ہے...... حق تعالیٰ شانہ نے جیسے وہ واعظ مقرر کئے ہیں جو زبان

---

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۱۱.

سے وعظ کہتے ہیں، اسی طرح سے کائنات کے ذرّے ذرّے کو واعظ بنادیا ہے، ہر چیز میں انقلاب اور تغیر ہے وہ زبانِ حال سے پکار رہی ہے کہ کوئی چیز یہاں برقرار نہیں ہے، کسی چیز کو ثبات نہیں آفتاب جیسی بڑی چیز جس کو لوگوں نے خدا تک کہہ دیا ہے، ایک دم چمکا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ عروج والا کوئی نہیں ہے اور زوال کے بعد جب بجھنا شروع ہوتا ہے تو مغرب تک اس کا رنگ فق ہو جاتا ہے، تو بتلا دیا جاتا ہے کہ اتنا عظیم کرہ بھی اپنے آپے میں نہیں اس کے اوپر کوئی جابر طاقت ہے جس نے مجبور کی طرح اسے نچار کھا ہے یہی حالت چاند اور ستاروں کی ہے یہی زمین کی کہ کبھی دن ہے کبھی رات ہے کبھی دکھ ہے کبھی سکھ ہے کبھی بیماری کبھی صحت ہے، کبھی غربت ہے کبھی امارت ہے تو عالم یکساں نہیں رہتا کوئی چیز برقرار نہیں ہے تو نہ کوئی دولت والا اس گھمنڈ میں رہے کہ بس یہ تو برقرار ہی رہے گی نہ غربت والا اس مایوسی میں رہے کہ اس کے جانے کی کوئی صورت نہیں ایک ہی صورت ہے کہ رجوع الی اللہ کرے، اللہ کی طرف سے یہ تغیرات آرہے ہیں، اس کی طرف رجوع کرے وہی راستے صحیح کرنے والا ہے یہ گویا نصیحت اور عبرت اس مضمون کے مقام سے نکلی اس کے بعد ان شاء اللہ کل بیان ہوگا، دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں علم وعمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ○ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ، وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سَالِمُوْنَ ○ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴾

جوازِ شرک کی غلط تاویل ...... بزرگانِ محترم! جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفارِ مکہ کو فرمایا کہ ان بتوں کی پرستش مت کرو، صرف ایک خدائے واحد کی پوجا کرو، اسی میں تمہاری دنیا کا بھی بھلا ہے اور آخرت میں بھی نجات ہے ورنہ دنیا میں بھی مصائب اور فتن ہوں گے اور آخرت میں بھی عذاب اور ہلاکت واقع ہوگی۔

اس پر انہوں نے اپنے شرک کی ایک تاویل کی، اور کہا کہ ہم توحید کے تو قائل ہیں، باقی یہ جو ہم شرک کرتے ہیں اس لئے کہ یہ بت جو ہیں ان کے ذریعہ حق تعالیٰ کے کمالات کا ظہور ہو رہا ہے اس لئے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو براہ راست دیکھ نہیں سکتے اس واسطے ہم ان محسوس خداؤں کو سامنے رکھتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے ہم اس تک پہنچ جائیں۔ ﴿لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ ① کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے، تو قرب حاصل کرنے کے لئے ہم ان کی پوجا کرتے ہیں، اصل مقصود حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے، گویا مذاہب کی بنیاد توحید ہے، توحید کا کسی درجے میں انہیں انکار نہیں تھا، توحید کو مان کر پھر شرک کرتے تھے محض اس لئے کہ یہ قرب کا ذریعہ ہے۔

شرک کی تاریخ ...... یہ شرک سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں شروع ہوا ہے، نوح علیہ السلام کی قوم میں جب ان کی بعثت کا زمانہ قریب آیا، اس وقت شرک کے شروع ہونے کی صورت یہ ہوئی کہ قومِ نوح میں پانچ بزرگ اولیائے کاملین میں سے تھے، جن کے نام قرآن کریم میں ذکر کئے گئے ہیں۔

ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر، یہ ان بزرگوں کے پانچ نام تھے، ان کی مجالس میں لوگ بیٹھتے تھے تو اللہ یاد آتا تھا، وہ توحید کی بات کرتے تھے، اللہ کی صفات اور اس کے کمالات بیان کرتے تھے، تو ان کی باتیں سن کر ان کی

① پارہ: ۲۳، سورۃ: الزمر، الآیۃ: ۳۔

مجلس سے فیضِ محبت حاصل کر کے توجہ الی اللہ پیدا ہوتی تھی، جب ان پانچوں بزرگوں کی وفات ہوگئی، تو قوم سوچ میں پڑ گئی کہ اب کس کی مجلس میں بیٹھا کریں کہ اللہ کو یاد کریں اور ذکر اللہ کے لئے کہا جائے اور اللہ کی پہچان کے لئے کہا جائے، اس فکر میں وہ مستغرق تھے، تو شیطان ایسے موقعوں کو تاکتا ہے کہ اس وقت یہ ان بزرگوں اور اکابر کو یاد کررہے ہیں کہ ان کی مجلس قُربِ خداوندی کا ذریعہ بنتی تھی۔

اس وقت اس قوم کے جو رئیس تھے، اور بڑے تھے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ صورت تو اب بھی ممکن ہے اگر وہ بزرگ موجود نہیں تو ان کی تصویریں اور بت بنا کر عبادت گاہوں میں رکھ لو، وہ شکلیں دیکھ دیکھ کر تمہیں وہ بزرگ یاد آئیں گے، اور یہ اس یادداشت کا ذریعہ بن جائیں گے، اس واسطے ان کی پوجا تو نہ کریں گے مگر انہیں قرب اور توجہ کا ذریعہ بنائیں گے، اس طرح ان کی صورتیں دیکھ کر وہ مجلسیں یاد آجائیں گی اور وہ باتیں یاد آجائیں گی، چونکہ کوئی راہنما نہیں تھا اور ایسے موقعوں پر وساوس بہت دفعہ حالات کو خراب کردیتے ہیں، حقیقی معنی میں جو راہِ خدا کا سالک ہو بعض اوقات اس کے دل میں ایسے وسوسے آتے ہیں کہ اگر راہنما نہ ہو تو وہ شرک میں فسق اور فجور اور گمراہی میں مبتلا ہوجاتا ہے، تو شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا، ان کے دل نے اس وسوسہ کو راہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے قبول کرلیا، تو انہوں نے ان بزرگوں کی تصویریں بنالیں، اور ان کی صورتیں پتھروں پر کندا کر کے بلکہ پتھروں کو تراش کر ان کی شکلوں کے قریب کرلیا اور عبادت گاہوں میں رکھ لیا، یہ لوگ چونکہ نیک نیت تھے، اور حقیقت میں توجہ الی اللہ ہی چاہتے تھے، اس لئے ان کی موجودگی میں وہ بت توجہ کا محض ذریعہ اور واسطہ رہے، جیسے کسی تصویر کو سامنے رکھ کر آدمی اصل کو یاد کرلے، تو تصویر کی طرف توجہ نہیں ہوتی، وہ محض اصل کی طرف توجہ کا ذریعہ بنتی ہے، جب تک اس قوم کے افراد موجود رہے تو انہوں نے ان بتوں اور تصاویر کو محض توجہ الی اللہ اور توجہ الی الاکابر کا ذریعہ بنائے رکھا، لیکن جب وہ نسل گذر گئی اور اس کے بعد دوسری نسل آئی، اس کے دل میں وہ معرفت نہیں تھی، اس لئے کہ پہلی نسل تو پھر بھی بزرگوں کو دیکھی ہوئی تھی، تو ان کے دلوں میں ایک پہچان، یاد، معرفت اور عرفان کا مادہ موجود تھا اور نئی نسل میں یہ چیز تھی نہیں اس لئے ان کے دلوں میں کچھ بتوں کی عظمت بیٹھ گئی کچھ وہ اللہ کو بھی یاد کرتے تھے، لیکن بہر حال ایک مخفی سا شرک رہا، کھلا ہوا شرک نہ ہوا۔

پھر جب یہ نسل بھی گذر گئی اور تیسری نسل آئی اس میں سرے سے علم کا نشان نہیں رہا تھا، وہ صورتیں صرف سامنے رہ گئیں، اور حقیقت دلوں سے اوجھل ہوگئی تو انہوں نے انہی بتوں ہی کی پرستش شروع کردی، کہ بس کرتا دھرتا یہی ہیں، اور انہی کے ذریعے سے ساری مرادیں پوری ہوں گی، تو انہی بتوں کے سامنے انہوں نے منتیں بھی ماننا شروع کیں، نذر و نیاز بھی پیش کرنا شروع کیں، قربانیاں بھی انہی بتوں کے نام پر دینے لگے، خدا کی ذات تو بالکل اوجھل ہوگئی اور محسوس خدا سامنے رکھ لئے اور انہیں کے ہوکر رہ گئے، یہاں سے کھلا شرک شروع ہوگیا۔

اس شرک کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام بھیجے گئے، اور انہوں نے

کہا: تمہارے بزرگوں نے تو ذریعہ بنایا تھا، اس کے بعد کی نسل نے کچھ خلط ملط کردیا، اور تیسری نسل بالکل شرک میں مبتلا ہوگئی، پھر اللہ سے دور پڑ گئے، یہی بت اللہ سے دور ہٹانے کا ذریعہ بن گئے، اب تمہاری ساری توجہ انہیں میں الجھ کر رہ گئی، اس واسطے انہیں ختم کرو، اور اصل خدا کی طرف توجہ کرو جو نفع وضرر کا مالک ہے۔

لیکن چونکہ ایک صدی گذر گئی تھی وہ اس بت پرستی سے مانوس ہوگئے تھے، اور باپ دادا کا دین یہی بتوں کی پوجا ٹھہر گیا تھا اس لئے حضرت نوح علیہ السلام کی بات نہ مانی، ساڑھے نو سو برس تک حضرتِ نوح علیہ السلام نصیحت کرتے رہے، مگر قوم نے مان کر نہیں دیا، اور وہ انہیں محسوس خداؤں میں الجھ کر رہ گئے، تو یہاں سے شرک کی ابتداء ہوتی ہے تصویر اور بت شرک کا ذریعہ بنے ہیں۔

تصویر اسبابِ شرک میں سے ہے...... اس لئے شریعتِ اسلام نے جہاں شرک کو رد کیا وہاں اسبابِ شرک کو بھی ختم کیا، قوم کو سرے سے تصویر کی ممانعت کردی اور تصویر حرام قرار دے دی، کیونکہ یہ شرک کا ذریعہ بنی ہے، تو اس کی جڑ کاٹنی چاہئے تاکہ آئندہ شرک کا ذریعہ نہ بنے، تو ممانعت فرمادی کہ تصویر نہ رکھی جائے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: جس مکان کوٹھڑے میں تصویر ہوگی اس میں ملائکہ رحمت داخل نہیں ہوں گے، گویا اس طرح شرک اور اسبابِ شرک کی جڑ کاٹی تو مشرکینِ مکہ کی شرک کی تاویل یہی تھی جو قومِ نوح کی پرانی بات تھی کہ یہ تقریب کا ذریعہ ہیں، حالانکہ یہ محض لفظوں میں بات تھی، وہ ذریعہ نہیں رہے تھے بلکہ بتوں کی ہی پوجا ہو رہی تھی اور انہی کو اصل مان لیا تھا زبان سے یہ کہتے تھے کہ یہ مظاہر ہیں کمالاتِ الٰہیہ کے ظہور کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، اس لئے ہم ان کو پوجتے ہیں۔

مشرکین کی دلیل تسلیم کرنے سے عابد کا وجود ختم ہوجاتا ہے...... لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ حجت بہت ہی بودی اور بہت ہی کمزور قسم کی حجت تھی، اس لئے کہ دنیا میں وہ کون سی چیز ہے جو مظہر صفاتِ خداوندی نہیں ہے، ہر چیز میں کسی نہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی وصف ظاہر ہو رہا ہے، آسمانوں کو دیکھو تو ان سے رفعتِ خداوندی نمایاں ہے اللہ رفیع ہے بلند و برتر ہے، اس کی بلندی کی نمائش آسمانوں کے ذریعے سے ہو رہی ہے تو پھر آسمانوں کو بھی پوجنا چاہئے۔

اسی طرح سے ملائکہ علیہم السلام مظہر قدرت ہیں، حق تعالیٰ کی قدرت یہ ہے کہ پل بھر میں جو چاہیں فرمادیں، فرشتوں میں اس قدرت کا ظہور ہو رہا ہے کہ پل بھر میں آسمان سے زمین پر زمین سے آسمان پر، پلوں میں وہ لاکھوں میل کی مسافت طے کر لیتے ہیں، تو قدرت الٰہیہ کا ظہور ہو رہا ہے، وہ مظاہر قدرت ہیں پھر ملائکہ کی بھی پوجا ہونی چاہئے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ شانہ کی صفت ذی المعارج ہے یعنی وہ تمام چیزوں کو بتدریج چلاتے ہیں، نطفہ کو نو مہینوں میں تربیت دے کر وہ انسان بناتے ہیں، انسان کو چودہ برس میں تربیت دے کر عاقل بالغ بناتے ہیں، تو آہستہ آہستہ تدریجی طور پر کمالات کا ظہور ہے، یہ نشو ونما درختوں میں ظاہر ہوئی، غرض اللہ تعالیٰ کی تدریجی قدرت درختوں

کے ذریعے ظاہر ہورہی ہے پھر درختوں کی بھی پوجا ہونی چاہیئے۔

رحمت کو اگر دیکھا جائے تو اس کا مظہر پانی ہے کہ پانی کے ذریعہ سے حق تعالیٰ کی نرمی اور رحمت نمایاں ہے، تو پانی مظہر رحمت ہے، اس واسطے پانی کو بھی پوجنا چاہیئے، تو دنیا کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی جو معبود نہ بن جائے، اس لئے محققین یہی لکھتے ہیں کہ یہ سارا عالم مظہر صفات ہے کسی میں کوئی صفت ظاہر ہورہی ہے کسی میں کوئی صفت پھر تو ہر چیز قابل عبادت ہونی چاہیئے، اور سب سے زیادہ قابل عبادت انسان ہونا چاہئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے جامع کمالات انسان کے ذریعہ ظاہر ہوئے ہیں علم کو دیکھو تو انسان کے ذریعے ظاہر ہوا، تو انسان مظہر علم ہے، قدرت کو دیکھو تو انسان کے ذریعے قدرت بھی ظاہر ہوتی ہے، اس میں وہ قدرت نمایاں ہے کہ پتھروں اور جامد چیزوں کو اس نے مشینوں کے ذریعے سے چلتا اور پھرتا کردیا، اس طرح سے اعلیٰ درجہ کی قدرت نمایاں ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ مصوّری بھی ہے، تو انسان تصویر بناتا ہے، تو صفت تصویر کا مظہر ہوا، غرض انسان کمالات خداوندی کا جامع ہے، علم قدرت حیات ارادہ اور مشیت وغیرہ، یہ سب انسان کے ذریعے ظاہر ہورہا ہے اس لئے سب سے زیادہ معبود بننے کے لائق تو انسان ہی ہوا، اور جب انسان کی جنس معبود بن گئی تو عابد کون بنے گا؟ ظاہر ہے کہ درخت تو عبادت نہیں کرسکتے، پتھر عبادت نہیں کرسکتے، جنات میں اتنی عقل نہیں ہے تو معبود ہی معبود رہ گیا، دنیا میں عابد کوئی بھی نہ رہا غرض یہ ایسی غلط تاویل ہے کہ اس کے تسلیم کرنے سے عابد اتنے نہیں رہیں گے جتنے معبود بن جائیں گے اربوں کھربوں اور ہر مخلوق گویا معبود بنے گی، تو عقلی طور پر یہ انتہائی کمزور تاویل اور دلیل ہے جو وہ دیا کرتے تھے کہ ہم توحید کے تو قائل ہیں، مگر یہ بت مظاہر ہیں، اس لئے انہیں پوج رہے ہیں۔

مظہر صفات معبود بننے کے لائق نہیں...... دوسری بات یہ ہے کہ ظاہر تو کمال ہوتا ہے وہ تو کامل ہے، مگر مظہر ہمیشہ ناقص ہوتا ہے، جیسے انسان کی روح بدن کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے، مگر بدن ناقص ہے بدن کے اندر کمزوری بھی ہے، تغیرات بھی ہیں، تبدل بھی ہے، بیماری صحت مرض نجاست طہارت سب اس بدن میں واقع ہیں تو بدن مظہر ہے اور روح ظاہر ہے، تو روح پاکیزہ ہے مگر مظہر ناقص ہے، اس لئے اگر مظاہر کی عبادت کی گئی تو ناقص کو پکارا جائے گا جن میں عیب بھی ہوں گے، جن کے اندر برائیاں بھی ہوں گی، جو کھانے پینے کے محتاج ہوں گے اور طرح طرح کی حاجت مندیاں بدن کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، تو خدا تو وہ ہے جو ہر چیز سے غنی ہو، بدن والی چیز محتاج در محتاج ہوگی، اس واسطے وہ معبود بننے کے لائق نہیں، تو مظہر معبود بن ہی نہیں سکتا۔

مظہر محتاج ہے معبود نہیں...... عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پرستش کی، یہی کہہ کر کہ وہ مظہر کمالاتِ خداوندی ہیں، حق تعالیٰ نے ایسا لفظ کہہ کر رد فرمایا جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معبودیت کا رد ہوگیا فرمایا: ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ (۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ صاحبہ کھانا کھایا کرتی

(۱) پارہ: ۶، سورة: المائدة، الآية: ۷۵.

تھیں، ظاہر بات ہے کہ جو کھانا کھائے گا وہ اتنا محتاج ہوگا کہ وہ صرف کھانے کا نہیں بلکہ لاکھوں چیزوں کا محتاج ہوگا، اس لئے کہ دانا پانی پیدا نہیں، ہوسکتا جب تک زمین نہ ہوتو آدمی زمین کا محتاج ہوا، دانہ نہیں بن سکتا جب تک بادل بارش نہ برسائیں، تو بادلوں کا محتاج ہوا، کھیتی نہیں پک سکتی جب تک سورج اپنی گرمی نہ ڈالے تو جو کھانے کا محتاج وہ سورج کا بھی محتاج ہوا، اسی طرح سے کھانے میں رطوبت نہیں پیدا ہوسکتی جب تک ہوا نہ ہو، تو کھانے کا محتاج ہو، ہوا کا محتاج ہوا، تو آگ، مٹی، ہوا، پانی، سب کا وہ محتاج ہوگا جو کھانے کا محتاج ہوگا۔

پھر کھانے کے بعد بول و براز ہے، نجاست ہے، گندگی ہے، یہ سب چیزیں نکلیں گی، ان کا بھی محتاج ہوا، ظاہر بات ہے کہ جو اتنی چیزوں کا محتاج ہو وہ خدا بن سکتا ہے! خدا تو وہ ہے جو ہر چیز سے غنی ہو، ہر چیز سے بالاتر ہو، ہر چیز کا بنانے والا ہو، اور ظاہر بات ہے کہ انسان اپنا کھانا بھی بناتا ہے نہ اسے کسی چیز پر قدرت ہے، نہ اس کے اندر علم ہے یہ محتاج ہی محتاج ہے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے معبود بن سکتے ہیں جو کھانے پینے کے محتاج ہوں، جب کھانے کے محتاج ہوئے تو آسمان کے، زمین کے، پانی کے ان سب چیزوں کے محتاج ہوئے، غرض جو اتنا محتاج ہو وہ معبود بننے کے لائق ہے! تو ایک ہی دلیل پیش فرمائی تو مظاہر جنہیں کہا جاتا ہے وہ محتاج در محتاج ہیں، اس لئے کہ ظہور کسی بدن میں ہوگا، اور بدن کھانے کا محتاج اور جو کھانے کا محتاج وہ ہر چیز کا محتاج ہے، تو مطلب یہ کہ تمہاری یہ دلیل نہایت ناقص اور بودی دلیل ہے۔ یہ تم توحید کا نام لے کر شرک کے اوپر پردہ ڈالتے ہو، یہ شرک توحید بن ہی نہیں سکتا، اس لئے تمہاری یہ دلیل غلط ہے۔

روزِ حشر انکشافِ حقائق کا دن...... آج اگر تمہاری یہ دلیل کسی جاہل کے آگے چل بھی جائے، تو قیامت کا دن آنے والا ہے جس دن ساری حقیقتیں کھل جائیں گی، یہ سب پردے ہٹ جائیں گے، اس دن تم پھر میدان میں کھڑے رہ جاؤ گے اور واضح ہوجائے گا کہ جنہیں معبود سمجھا تھا، وہ معبودیت اور عبادت کے لائق نہ تھے وہ تو خود محتاج تھے۔ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ﴾ اس دن جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی، اس دن ساری حقیقتیں کھل کر سامنے آجائیں گی، قیامت کا دن وہ ہے کہ جس دن چھپی ہوئی حقیقتیں کھل جائیں گی، جو چھپے ہوئے بھید تھے اس روز وہ سامنے آجائیں گے، ہر ہر عمل نمایاں ہوجائے گا، جو سات پردوں میں چھپا کر بھی آئے وہ سامنے آجائے گا۔ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّـرَهٗ﴾ ① ذرہ برابر خیر بھی ہے وہ بھی کھل جائے گی، ذرہ برابر شر ہے کتنے ہی اچھے پردے ڈالے ہوں وہ کھل کر سامنے آجائے گا، تو قیامت کا دن وہ ہے کہ ساری چیزیں کھل جائیں گی، بہر حال اس آیت کریمہ میں ساق کا لفظ لایا گیا۔ ساق کا لفظ یا تو حق تعالیٰ کی کوئی اصطلاح ہے، گویا اس سے ارادہ کیا گیا ہے کہ قیامت کا دن حقائق کے کھلنے کا دن ہے، پنڈلی کھول دی جائے گی تو پنڈلی سے مراد حقائق کا کھلنا ہے، ایک ساق کے یہ معنی لئے گئے ہیں۔

① پارہ: ۳۰، سورۃ: الزلزال، الآیۃ: ۷، ۸.

مراتب تجلّی...... دوسرے معنی ساق کے یہ ہیں کہ اس کے معنی پنڈلی کے لئے جائیں، جیسے انسان کی پنڈلی ہواور وہ حق تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئی کہ جب وہ اپنی پنڈلی کھول دیں گے تو اس دن ساری حقیقتیں کھل جائیں گی، یہ واضح نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی تفسیر نہ بیان کی جائے کہ پنڈلی کھولنے کا کیا مطلب ہے۔

تو پنڈلی کھولنے کا یہ مطلب ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا کہ: آدمی جب نماز پڑھتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے تو اس کی نگاہ درحقیقت اللہ پر ہوتی ہے گو ظاہر میں چٹائی پر ہو، تو اس کی نگاہ حق تعالیٰ کی پنڈلی پر ہوتی ہے، گو ظاہر میں چٹائی پر پڑ رہی ہو، گویا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی جو تجلیات ہیں ان میں مراتب ہیں ایک اوپر کی تجلی اور ایک نیچے کی، تو سب سے نچلی تجلی کہلاتی ہے پنڈلی کی، تجلی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جب عبادت کرتا ہے تو ابتدائی تجلی اس کے سامنے کھلی ہوئی ہوتی ہے، آج وہ پنڈلی نمایاں نہیں، قیامت کے دن وہ واضح ہو جائے گی۔

روزِ امتیاز......اور قیامت کے دن وہ کس طرح سے واضح ہوگی، قیامت کا دن اصل میں ہر چیز میں امتیاز کردے گا، اچھائی برائی سب کھل کے الگ الگ ہو جائے گی، تو حدیث میں فرمایا گیا ہے اولین وآخرین جب میدانِ محشر میں جمع ہوں گے تو ایک فرشتہ ندا کرے گا: اے لوگو! دنیا میں جو جس کی عبادت کرتا تھا وہ اس کے پیچھے چلا جائے، یہ ایک اعلانِ عام کردیا جائے گا جو جس کی عبادت کرتا تھا اس کے پیچھے چلا جائے تو جو لوگ بتوں کی عبادت کرتے تھے تو بتوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں گے، تو وہ لوگ اپنی قلبی کشش سے ادھر متوجہ ہو جائیں گے، جو چاند اور سورج کی عبادت کرتے تھے تو حدیث میں ہے کہ چاند اور سورج سامنے ہوں گے ان کا نور تو چھین لیا جائے گا، لیکن ان کے اجسام سامنے ہوں گے چونکہ عمر بھر ان کی طرف جھکتے رہے ہیں اس لئے اپنے قلب کی کشش سے ادھر جھک جائیں گے۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ جو حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے وہ اپنی قلبی کشش سے ادھر چلے جائیں گے، اور کوئی حضرت عزیر علیہ السلام کی صورت میں فرشتہ نمایاں ہوگا کچھ اس کی طرف چلیں گے، اس طرح تمام لوگ اپنے اپنے معبودوں کی طرف چلے جائیں گے، صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو اللہ کو پوجتے تھے، نہ سورج کی پرستش کرتے تھے، نہ بتوں کی، نہ درختوں کی، نہ پانی کی، ایک خدائے واحد کی پوجا کرتے تھے اور اسی کے آگے جھکتے تھے وہ رہ جائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم کیوں اپنے معبود کے پیچھے نہیں جاتے،؟ وہ عرض کریں گے کہ جب ہمارا معبود سامنے آئے گا تو ہم اس کی طرف جائیں گے تو حق تعالیٰ نمایاں ہوں گے، تجلّی ڈالی جائے گی، ایک عکس نمایاں ہوگا، تو اللہ فرمائیں گے: اَنَا رَحْمٰنُ میں رحمان ہوں یہ سب کہیں گے "نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْکَ" عرض کریں گے تو ہمارا معبود کیوں ہو؟ ہم پناہ مانگتے ہیں۔ فرمائیں گے: تمہارے معبود کی کوئی علامت ہے؟ عرض کریں گے، ایک علامت ہے، وہ یہ کہ جب ہم سجدے کرتے تھے تو ہمارا سر اللہ تعالیٰ کے قدموں میں پڑتا تھا، اور پنڈلی سامنے ہوتی تھی، اس پنڈلی کی جب تجلی کھلے گی تب ہم سمجھیں گے کہ ہمارا معبود سامنے ہے کیونکہ عمر بھر سجدے کر کے اسی سے مناسبت پیدا کی تھی۔ وہی چیز اندر چھپی ہوئی تھی، جب وہ نمایاں ہوگی تو ہم اس کے

سامنے جھکیں گے، اس وقت حق تعالیٰ اس پنڈلی کی تجلی کو نمایاں فرمائیں گے، تو یہ سب کے سب لوگ ایک دم سجدے میں جا پڑیں گے کہ بے شک ہمارا معبود یہ ہے لیکن بہت سے وہ لوگ جو منافق تھے اور ان مسلمانوں میں شامل تھے کیونکہ وہ بھی ظاہر میں اللہ ہی کو پوجتے تھے اور سجدے کرتے تھے، لیکن چونکہ دلوں میں ایمان نہیں تھا اس لئے دنیا میں تو وہ جھک گئے لیکن وہاں ان کی کمریں تختے کی طرح سخت کر دی جائیں گی، تو وہ بجائے سجدے میں جانے کے پشت کی طرف الٹے جا پڑیں گے، تو ملائکہ علیہم السلام ان کو یہاں سے نکال دیں گے، تو مشرکین پہلے الگ ہو گئے تھے، منافقین شامل تھے، وہ اب جدا کر دیئے جائیں گے صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو واقعۃً حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے تھے، اسی کو سجدہ کرتے تھے، اب صورت یہ بنے گی کہ یہ پنڈلی والی تجلی آگے آگے ہے اور یہ اربوں کھربوں مخلوق اس کے پیچھے ہے، وہ آگے آگے جا رہی ہے اور یہ مخلوق پیچھے پیچھے جا رہی ہے ان کو ایسے میدان میں پہنچایا جائے گا جہاں اتنا اندھیرا ہوگا کہ وہاں چاندنی اور نورانیت کا نشان نہیں رہے گا اس وقت وہاں ایک پل قائم کیا جائے گا جس کو پل صراط کہتے ہیں، اور کہا جائے گا کہ تم جنت میں جاؤ، مگر اس پل کے اوپر سے گذرنا پڑے گا، یہ پل جہنم کے اوپر تانا ہوا ہے۔

نورِ ایمان کا ظہور...... اس وقت اندھیرے میں ایمانوں کا نور ظاہر ہوگا، جتنا جس درجے کا جس کا ایمان ہے وہ کھل کر سامنے آئے گا، اس کی روشنی میں لوگ راستہ طے کریں گے جس کو ایک موقع پر قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ① لوگ اپنے نورِ ایمان کی روشنی میں چلیں گے، گویا نورِ ایمان ظاہر ہوگا، دائیں بائیں آگے پیچھے وہ نور احاطہ کئے ہوئے ہوگا، اس کی روشنی میں وہ راستہ طے کریں گے، بعض کا نور اتنا شدید ہوگا جیسے عظیم پہاڑ ہوتا ہے وہ اس پل سے اس طرح گذریں گے جس طرح بجلی لمحہ بھر میں ادھر سے ادھر کوندتی ہے، یہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے، یعنی پل بھر میں اس پل کو طے کریں گے اور یہ پل چھوٹا موٹا نہیں ہے، حدیث میں ہے کہ اس پل کی مسافت پندرہ ہزار برس کی ہے، پانچ ہزار برس چڑھائی اور پانچ ہزار برس اتار اور پانچ ہزار برس برابری ہے، تو حضرات انبیاء علیہم السلام اس پل کو اس روشنی میں اتنی قوت سے طے کریں گے جیسے بجلی کوندتی ہے، اس لئے کہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مضبوط ایمان کس کا ہو سکتا ہے۔

اور بعض کا ایمان ایسا ہوگا جیسے عظیم الشان درخت ہوتا ہے کہ دور تک اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، یہ مخصوص اولیاء اللہ ہوں گے کہ انبیاء علیہم السلام کے طفیل میں ان کا نورِ ایمان اتنا وسیع اور پھیلا ہوا ہوگا کہ وہ اس پل کو اس طرح سے طے کریں گے جیسے ہوا کا جھونکا گذر جاتا ہے جہنم کا کوئی اثر ان تک نہیں پہنچ سکے گا۔ بعض کا اس سے کم، بعض کا اس سے کم، حتیٰ کہ بعض کا ایسا ہوگا جیسے ناخن کے اوپر جو ذرا سا ستارہ سفیدی آ جاتا ہے تو اس میں وہ

① پارہ: ۲۸، سورۃ: التحریم، الآیۃ: ۸.

ٹٹول ٹٹول کر چلیں گے، رستہ پورا دکھلائی نہیں دے گا۔

پُل صراط ،شریعت کی صورتِ مثالی......اور پل صراط ایسا ہوگا کہ بال سے باریک ہے اور نازک جگہ ہے اور اس کے نیچے ہوں گے کلالیب، یعنی لوہے کے آنکڑے، وہ اچھل اچھل کر پیروں میں ڈالنے کی کوشش کریں گے، جن کے پاس نور کم ہوگا تو کیلے شکنجے کی وجہ سے وہ زخمی ہوں گے اور بجائے چلنے کے وہ گھسٹتے ہوئے چلیں گے، اور سست چلیں گے، ہزار ہا ہزار برس میں جا کر راستہ طے ہوگا اور بعض کا نور اتنا کم ہوگا کہ وہ اتنے آنکڑوں کے ذریعے سے زخمی ہو جائیں گے اور راستہ طے نہیں کرسکیں گے، کٹ کر کے جہنم میں جا پڑیں گے جب تک حق تعالیٰ کو منظور ہوگا وہ اندر رہیں گے، یہ پل صراط حقیقت میں شریعت کی صورت مثالی ہوگی، شریعت کو ایک شکل دی جائے گی، جو یہاں شریعت پر تیز چلے ہیں وہ وہاں بھی پل صراط پر تیز چلیں گے جو یہاں سست چلے ہیں وہاں بھی سست چلیں گے اور یہ جو نیچے آنکڑے ہوں گے پیروں میں شکنجے ڈالیں گے یہ فتنوں اور خواہشات نفس کی صورتِ مثالی ہوگی، نفس کی راحت کے لئے جس پر چلتے رہے تھے کسی کی نماز نہیں ہے، کسی کا روزہ نہیں ہے، کوئی زکوٰۃ نہیں دے رہا، کوئی اعتقادی وساوس میں گرفتار ہے کوئی مال کی زیادتی اور اضافے کے مرض میں مبتلا ہے، کوئی زکوٰۃ وصدقات سے قاصر ہے کوئی نماز نہیں پڑھتا، کوئی حج نہیں کرتا اور زکوٰۃ نہیں دیتا ہے، قلبی وساوس سے جاہ کی کوشش مال کی خواہش کے فتنے آنکڑوں کی صورت میں نمایاں ہوں گے تو جو یہاں ان فتنوں میں گر گئے وہ وہاں ان فتنوں میں گر جائیں گے، جنہوں نے یہاں راستہ صحیح طے نہیں کیا وہاں بھی راستہ طے نہیں کرسکیں گے، یہ تو جہنم میں شریک تھے ادھر جھکا تو جہنم، ادھر جھکا تو جہنم، تو سامنے جنت کا راستہ ہے بہر حال اس طرح سے مشرک پہلے الگ کردیئے جائیں گے، منافق بعد میں الگ کردیئے جائیں گے، اب مومن رہ جائیں گے ان کے درجات الگ الگ ہو جائیں گے، کامل الایمان جو ہیں، وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے، جو ضعیف الایمان ہیں وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے، جو بالکل ناقص الایمان ہیں وہ بھی نمایاں ہو جائیں گے تو ہر ہر چیز الگ الگ ہو جائے گی، ہر ایک کا رتبہ و درجہ اس پر واضح کردیا جائے گا تو یہ آیت کی تفسیر ہے کہ میدان محشر میں لوگ درجہ بدرجہ کھل کر نمایاں ہوں گے۔

تو اس میں وہ پنڈلی والی تجلی نمایاں ہوگی کہ جس کی عمر بھر عبادت کرتے رہے یعنی جس کے سامنے جھکتے رہے ہیں، حدیث میں فرمایا گیا کہ: جب آدمی سجدہ کرتا ہے تو ظاہر میں اس کی پیشانی پڑتی ہے چٹائی پر حقیقت میں اللہ کے قدموں میں پڑی ہوئی ہے اور جب سجدہ گاہ کی طرف دیکھتا ہے تو پنڈلی سامنے ہوتی ہے، اور جب فاتحہ پڑھنے کے لئے اور سورت پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی نگاہ اللہ کے چہرے پر ہوتی ہے، تو درجہ بدرجہ تجلیات ربانی اس کے سامنے آتی ہیں، بحالتِ قیام اونچی تجلی سامنے ہوتی ہے، بحالت رکوع نچلی تجلی سامنے ہوتی ہے، اور سجدے میں جا کر سب سے نچلی تجلی قدموں کی نمایاں ہوتی ہے، تو تمام تجلیات ربانی سے وہ نماز اور عبادت کے اندر مستفیض ہوتا ہے، لیکن نمایاں جو تجلی ہے جس پر زیادہ نظر پڑے گی وہ پنڈلی والی تجلی ہے، جو نیچے کی تجلی ہے اس سے آدمی

مانوس ہوگا جب وہ کھل جائے گی تو اللہ کی محبوبیت نمایاں ہوجائے گی۔

عابدِ مظاہر نا آشنائے حقیقت رہے گا......تو فرمایا گیا کہ تم مظاہر کو پوجتے ہو تو جو موحد تھے مظاہر ان کے سامنے بھی تھے مگر وہ دھیان بھی کرتے تھے تو حق تعالیٰ شانہ کی طرف جاتے تھے، اور تم ان صورتوں میں ہی الجھ کر رہ گئے تو وہاں بھی تم صورت ہی میں الجھ کر رہ جاؤ گے حقیقت کا تمہیں وہاں بھی پتہ نہیں چل سکے گا، تو فرمایا کہ آج تم تاویل کرکے پردے ڈال لو، اپنی مشرکانہ عبادت کو تم موحدانہ کہہ لو، لیکن یہ حقیقت میں عبادت نہیں ہے، یہ دھوکہ ہے جس میں تمہیں شیطان نے ڈال رکھا ہے۔ اور وہاں جاکر کھلے گا کہ ایک مومن عبادت کرتا ہے اگرچہ نظر اس کی پنڈلی پر ہے مگر وہ حقیقت میں تجلی ربانی کے سامنے ہے، تو جیسی حقیقت یہاں اس پر واضح ہے قیامت کے دن بھی اس پر حقیقت واضح ہوگی، وہ یہاں بھی نور میں ہے وہاں بھی نور میں ہوگا، جو یہاں ظلمت میں ہے وہاں بھی ظلمت میں ہوگا، حقیقت ان پر منکشف نہیں ہوگی، تو: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ﴾ جب پنڈلی والی تجلی کھولی جائے گی اور دعوت دی جائے گی کہ سجدہ کرو تو سب سجدے میں جا پڑیں گے، لیکن یہ لوگ جو شرک میں مبتلا تھے یہ اتنی استطاعت نہیں رکھیں گے کہ وہاں جھک سکیں، اس لئے کہ یہاں بھی نہیں جھکے ہوں گے، جب یہاں نہیں جھکے تو وہاں بھی نہیں جھکیں گے۔

دُنیا کی ظلمت آخرت میں بھی حقیقت سے حجاب کا باعث ہوگی......﴿خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾ ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی ندامت اور ذلت کے سبب سے، ذلت اور رسوائی ان کے سروں پر منڈلا رہی ہوگی ان کے چہروں سے ظاہر ہوگا کہ یہ خائب وخاسر ہیں اور نامراد ہیں تو نامرادی کی سیاہی ان کے چہروں پر ہوگی ، اور ذلت ورسوائی چھائی ہوئی ہوگی ﴿فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ﴾ وہ جھکنے کی طاقت نہیں رکھیں گے۔

﴿وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سَالِمُوْنَ﴾ دنیا میں انہیں بلایا جارہا تھا سجدے کی طرف جبکہ ان کی فطرت بھی صحیح تھی، جبکہ ان کا ضمیر بھی صحیح تھا، لیکن انہوں نے لبیک نہیں کہا، یہاں تک کہ اپنی فطرت شرک اور بدعملی کی بدولت مسخ کردی۔

جب فطرت ہی خراب ہوگئی، استعداد ہی باقی نہ رہی ایمان کی، تو ظاہر ہے کہ پھر عمل کہاں سے ہوگا، پھر عبادت کہاں سے ہوگی، اور جب وہ نہ ہوئی اور وہاں اس پنڈلی کے آگے نہ جھکے تو آج یہاں اس پنڈلی کے آگے کیا جھکیں گے، تو حقیقت میں دنیا اس لئے ہے کہ آدمی مشق کرلے اپنی اطاعت وعبادت کی۔ آج غائب جو چیزیں ہیں کل کو وہی چیزیں اس کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گی اور کھل جائیں گی، تو اس وقت دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾ پنڈلی کھول دی جائے گی۔ تو پنڈلی سے مراد حقائق کا عالم ہے کہ حقیقتیں کھل جائیں گی، عاملِ شریعت اور تارکِ شریعت نمایاں ہوجائیں گے۔

ساق متشابہات میں سے ہے...... پنڈلی سے مراد متشابہات میں سے ایک صفت ہے کہ اللہ کی پنڈلی اسی

طرح فرمایا گیا، جیسے حق تعالیٰ کی طرف ہاتھ منسوب کیا گیا ہے ﴿یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ ① اللہ کا ہاتھ سب کے ہاتھوں کے اوپر ہے یا جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ ② لوگ ارادہ کر رہے ہیں اللہ کے چہرے کا۔ تو چہرہ بھی اللہ کی طرف منسوب ہوا، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: "اَلْقُلُوْبُ بَیْنَ اِصْبَعَیِ الرَّحْمٰنِ" ③ تمام دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، تو انگلیاں ثابت کی گئیں۔ حدیث میں فرمایا کہ: جب اللہ نے رحم اور امانت کو پیدا کیا تو رحم اور امانت اللہ کی کوکھ سے لپٹ گئے اور بولے کہ: "اَلَا مَنْ وَصَلَنَا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنَا قَطَعَهُ اللّٰهُ" ④ آپ یہ چیز واضح کر دیجئے کہ جو ہمیں ملائے یعنی صلہ رحمی کرے اور امانت داری کرے آپ کے لئے تو آپ اسے اپنے ساتھ کر دلیجیے اور اگر رحم قطع کر دیا، امانت قطع کر دی تو آپ بھی اسے اپنے سے قطع کر دیں، تو حق تعالیٰ نے یہ درخواست قبول فرمائی، تو اس سے کوکھ ثابت ہوئی۔

اسی طرح حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "رَأَیْتُ رَبِّیْ فِیْ اَحْسَنِ صُوْرَتِهٖ" میں نے خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا، بڑی پاکیزہ صورت تھی۔ حق تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ: "فِیْمَ یَخْتَصِمُ مَلَأُ الْاَعْلٰی" ملاء اعلیٰ کے لوگ یعنی ملائکہ مقربین کس چیز میں جھگڑتے ہیں؟ تو میں نے عرض کیا کہ میں نہیں جانتا، میں تو واقف نہیں ہوں اس چیز سے، پھر فرمایا حق تعالیٰ نے دوبارہ کہ "فِیْمَ یَخْتَصِمُ مَلَأُ الْاَعْلٰی" ملاء اعلیٰ کے ملائکہ کس چیز میں جھگڑتے ہیں؟ تو میں نے کہا کہ میں تو نہیں جانتا نہیں پہچانتا۔ تین دفعہ جب فرمایا اور میں نے اقرار کیا کہ میں نہیں جانتا تو حق تعالیٰ نے میری پشت پر ہاتھ رکھا حتّٰی بردت...... ⑤ میں نے اس کے پوروں کی ٹھنڈک اپنے قلب کے اندر محسوس کی اور اس طور پر شرح صدر ہوا کہ ساری چیزیں منکشف ہوگئیں جن کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا کہ کس بارے میں جھگڑتے ہیں، ملاء اعلیٰ والی ساری چیزیں مجھ پر کھل گئیں، تو پورے بھی ثابت کئے گئے، بہر حال یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئیں، ہاتھ بھی پورے بھی انگلیاں بھی، قدم بھی پنڈلی بھی، کوکھ بھی، لیکن اہل حق اس میں یہی لکھتے ہیں کہ ان تمام چیزوں پر ایمان لاؤ مگر ساتھ یہ کہو کہ ہم ان کی کیفیت نہیں جانتے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا وہ راز ہے کیا کیفیت ہے! ہم کیفیت نہیں جانتے، جیسے اللہ کی ذات بے چون بے چگون ہے، کوئی اس کی مثال نہیں، ایسے ہی اس کا ہاتھ ہے، مگر ہاتھ اس کیفیت کی بنی ہوئی شکل نہیں ہے، وہ شکل وصورت سے پاک ہے، حقیقت کو ہم نہیں جانتے تو اس طرح کے تمام متشابہات پر ایمان لانا ضروری ہے اور یہ کہ وہ اپنی حقیقت پر ہیں، لیکن کیفیت ہم نہیں جانتے جیسے ذات اس کی بے چون وبے چگون ہے ایسے ہی

---

① پارہ: ۲۶ سورۃ: الفتح، الآیۃ: ۱۰۔ ② پارہ: ۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۵۲۔ ③ الصحیح لمسلم، کتاب القدر، باب تصریف اللہ القلوب کیف شاء ج: ۱۳ ص: ۱۱۹۔ ④ الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتھا ج: ۱۲ ص: ۴۰۷ رقم: ۴۶۳۵۔

⑤ السنن للترمذی، کتاب تفسیر القرآن، ومن سورۃ ص ج: ۱۱ ص: ۲۷ رقم: ۳۱۵۷۔

اس کی صفات بھی بے چوں و بے چگوں ہیں، اس طرح سے پنڈلی بھی متشابہات میں سے ایک متشابہ ہے کہ ظاہر میں لفظ پنڈلی کا ہے، جیسے ہماری پنڈلی مگر کیفیت اس کی مجہول ہے ہم نہیں جانتے، حق تعالیٰ جسم سے بری ہیں حق تعالیٰ حدود سے بری ہیں، اس لئے اس کی پنڈلی ویسے ہوگی جیسے اس کی شان ہے جیسے اس کی ذات ہے اس کا ہاتھ ویسا ہوگا جیسی اس کی ذات ہے اس کی کوکھ ویسی ہوگی، جیسی اس کی ذات ہے ہم اپنی کوکھ پر اور ہاتھ پر قیاس نہیں کر سکتے، ہم محدود ہیں وہ لامحدود ہے، ہم جسمانی ہیں وہ جسم و روح سے بری و بالا ہے، اس لئے ہم کوئی کیفیت نہیں بیان کر سکتے تو مراد یہاں ساق سے اشارہ اس طرف ہے کہ آج تم چھپالو چیزوں کو آج پردے ڈال لو دلیلوں پر تاویلوں کے پردے ڈال لو، لیکن حقیقتیں کھلنے والی ہیں، اہل معرفت پر یہیں کھل جاتی ہیں عوام پر وہاں جا کر کھل جائیں گی، تو یہ محض بناوٹی دلیلیں تھیں، اور تمہارا ضمیر بھی شاہد ہوگا کہ ہم نے اپنے نفس کو دھوکہ ہی دیا تھا اور مخلوق کی حقیقت کچھ نہیں تو فرمایا کہ ان چیزوں میں مت پڑو، پیغمبر جس چیز کو لا کر پیش کر رہے ہیں اس پر ایمان لاؤ، جو راستہ دکھا رہے ہیں اس پر چلو، حقیقت اسی کے اندر رہے، بے جا تاویلات اور آبائی تقلید پر نیز رسم و رواج پر نہ چلو، یہ چیزیں نجات دلانے والی نہیں ہیں، انبیاء علیہم السلام کی سنتیں نجات دلائیں گی، جو طریقہ انبیاء علیہم السلام نے بتلایا ہے، وہ ہدایت ہے اسی سے نجات کا تعلق ہے، نہ رواج کا نام شریعت ہے نہ پچھلوں کی ریت پر جمے رہنے کا نام شریعت، شریعت تو نکھری ہوئی چیز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آئی اور صحیح سند سے آئی اور وراثت سے آئی واسطہ در واسطہ سندِ صحیح کے ساتھ پہنچ گئی، اسی کو مانیں اسی کے اندر نجات ہے، تو فرمایا: ﴿یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ﴾ وہاں اطاعت کی طرف بلائی گئی مخلوق جو ایمان والے تھے، وہ جھک گئے جو یہاں نہیں جھکے وہاں بھی نہیں جھکیں گے، جو یہاں جھکے ہیں وہاں بھی جھک جائیں گے، جن کی یہاں نجات ہوئی وہاں بھی نجات ہوگی، وہاں وہ استطاعت نہیں رکھیں گے جھکنے کی جو یہاں نہیں جھکے، اور ان کے چہروں پر ذلت اور پھٹکا رو رسوائی برستی ہوگی۔ ﴿وَقَدْ کَانُوْا یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَهُمْ سَالِمُوْنَ﴾ اس وقت انہیں دعوت دی گئی سجدوں کی جب ان کی فطرت صحیح سالم تھی، صحیح سالم تھے لیکن دعوت پر لبیک نہیں کہا تو فطرت کو مسخ کر دیا ان کے اندر استعداد و صلاحیت سب فوت ہوگئیں، تو اب کیا ہو سکتا ہے، آخرت تو دنیا کے کئے دھرے کا ثمرہ ہے، جب دنیا میں ہی کوئی چیز نہیں ہوئی تو ثمرہ بھی مرتب نہیں ہوگا۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: دنیا آخرت کی کھیتی ہے، آخرت میں آدمی پھل کاٹے گا، دنیا میں کھیتی بوئے گا محنت کرے گا تو جو یہیں نہیں بوتا، یہیں بیج نہیں ڈال رہا ہے، یہیں کھیتی کو پانی نہیں دے رہا ہے، تو وہ ثمرہ اسے کیسے ملے گا، وہاں جا کر محروم ہو جائے گا، اس واسطے ان کی محرومی فرمایا حق تعالیٰ نے: ﴿فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ﴾ اے پیغمبر! ان کی فکر میں آپ نہ پڑیں، آپ دعوت دیتے رہیں باقی ان کی ہدایت کی فکر نہ کریں انہیں مجھ پر چھوڑ دیں یہ تکذیب میری کر رہے ہیں، میں ان سے خود نمٹ لوں گا، اور ظاہر میں اس تکذیب پہ تاویلوں کے

پردے ڈال رکھے ہیں، یہ ہم نے ان کی دلوں کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے یہ اسی اندھیرے میں چلتے رہیں گے۔

خود وہ سمجھ رہے ہیں کہ بڑے اچھے راستے پر ہیں، جب نتیجہ نکلے گا تو معلوم ہوگا کہ گمراہی کے اوپر تھے، تو یہ ہماری ایک خفیہ تدبیر ہے جس سے ہم ہلاکت والوں کو ہلاکت کی طرف لے جارہے ہیں اور آنکھیں ان کی بند کر دی گئیں ہیں ظاہری بھی باطنی بھی، نہ وہ حق کو دیکھتے ہیں نہ وہ سمجھتے ہیں، جب فطرت ضائع کر دی تو اب سمجھنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ہم ڈھیل دے رہے ہیں انہیں اور یہ پہنچ گئے ہیں اس ہلاکت کی طرف گوان کو سمجھ میں نہ آئے۔

بلا دلیل اتباع میں نجات ہے...... تو اس میں عبرت دلائی گئی ہے ایمان والوں کو کہ صحیح راستہ وہی ہے جو کھلا ہوا راستہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے پیش کر دیا گیا ہے کہ یہ فرائض ہیں، یہ واجبات ہیں یہ عبادت کا طریقہ ہے، یہ توحید کا طرز ہے، یہ نبوت کے ماننے کا طرز ہے۔ اسی میں نجات کا تعلق ہے جہاں آدمی خود درائی کو اور عقل پسندی کو دخل دے گا وہیں دین کے اندر دخل پڑ جائے گا، دین کی بنیاد اتباع کے اوپر ہے کہ آدمی ہر چیز سے کٹ کر اتباعاً پیروی کی طرف جائے اسی کے اندر نجات ہے، صحابہ کرامؓ اس درجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے تھے کہ اس اتباع کے مقابلے میں اپنی عقل کو بھی جھٹلانے کے لئے تیار تھے، اپنے مشاہدے کو بھی رد کرنے کے لئے تیار تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مقابلے میں نہ اپنی آنکھ کا اعتبار کرتے تھے نہ اپنی عقل کا نہ اپنے مشاہدے کا حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا صحابہؓ سے کہ: اَیُّ یَوْمٍ هٰذَا یہ کون سا دن ہے؟ سب جانتے تھے کہ عرفہ کا دن ہے نویں تاریخ ہے یہ کہہ سکتے تھے کہ نویں تاریخ ہے مگر صحابہ کرامؓ نے کیا جواب دیا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ، اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سا دن ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَیُّ شَهْرٍ هٰذَا'' مہینہ کون سا ہے؟ سب جانتے تھے کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے، حج ہو رہا ہے مگر جواب دیتے ہیں۔ ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ.'' ① اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے کون سا مہینہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اَیُّ بَلَدٍ هٰذَا سب کو معلوم تھا کہ مکہ ہے وہیں سے آئے تھے مگر جواب میں کہتے ہیں کہ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ جواب دیا گیا تو ان صحابی سے ان کے شاگرد نے پوچھا کہ آپ تو جانتے تھے کہ مہینہ ذی الحج کا ہے، نویں تاریخ ہے، عرفہ کا دن ہے شہر مکہ کا ہے، تو سیدھا جواب یہ ہے کہ مکہ ہے ذی الحج کا مہینہ ہے نویں تاریخ ہے عرفہ کا دن ہے یہ آپ نے کیا جواب دیا ہے: ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ'' اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔

تو صحابہؓ کہتے ہیں اس کے جواب میں ہم نے یہ اس لئے کہا کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما دیا کہ نویں تاریخ نہیں بارہویں تاریخ ہے، تو ہم کہیں گے کہ ہمارا علم غلط تھا

① الصحیح للبخاری، کتاب الحج، باب الخطبة ایام منی ج: ٦ ص: ٢٢٨ رقم: ١٦٢٥.

حق یہی ہے جو اللہ کے رسول نے فرمایا ہے اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمادیں کہ مکہ نہیں مدینہ ہے تو ہم کہیں گے کہ بلاشبہ مدینہ ہے ہماری آنکھیں غلط دیکھ رہی تھیں کہ یہ مکہ ہے، اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ مہینہ ذوالحجہ کا نہیں محرم کا ہے، تو ہم کہیں گے کہ بے شک محرم کا ہے، ہمارا علم غلط ہے، تو یہ درجہ تھا اتباع کا کہ اپنی آنکھوں کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنے علم کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنی تاریخ کو غلط کرنے کے لئے تیار قولِ رسول کے مقابلے میں تو جب تک اتنا اتباع نہ ہو کہ آدمی اپنی عقل، مشاہدہ، نگاہ سب کو چھوڑ کر قولِ رسول کی طرف نہ جائے، حقیقت میں اس وقت تک ایمان کا کمال نصیب نہیں ہوسکتا۔

عظمتِ خداوندی کا عالم..... حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا ایک شخص کو کہ دن دیہاڑے چوری کر رہا ہے تو اس سے فرمایا کہ ارے کم بخت دن دیہاڑے چوری کرتا ہے؟ اس نے کہا: ”وَاللهِ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَا اَسْرِقُهٗ“ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے چوری نہیں کی۔ حالانکہ آنکھوں کے سامنے تو چوری کر رہا تھا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: ”صَدَّقْتُ رَبِّیْ وَ کَذَّبْتُ عَیْنِیْ“ اس نے اللہ کا نام لے کر قسم کھائی تو میں اللہ کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنی آنکھوں کو جھٹلاتا ہوں بے شک تو نے چوری نہیں کی اللہ کا نام سچا ہے۔

تو انبیاء علیہم السلام کی یہ شان ہے کہ اللہ کا نام جب آجائے تو اپنے مشاہدے کو جھٹلانے کے لئے تیار اپنی عقلوں کو جھٹلانے کو تیار خدا کے مقابلے میں، اسی عظمت کی وجہ سے تو حضرت آدم علیہ السلام مبتلا ہو گئے، حق تعالیٰ نے جب جنت میں بھیج دیا اور فرمایا کہ دیکھو اس درخت کو مت کھانا، ابلیس نے آکر دھوکہ دیا، جانتے تھے کہ ابلیس ہے مگر: ﴿وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ﴾ ① شیطان نے قسم کھائی خدا کی قسم! میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ آدم علیہ السلام کے دل میں فریب نہیں، سچا قلب ہے آدم علیہ السلام کا اور جنت مقامِ کریمہ ہے، وہاں ایک شخص قسم کھائے اللہ کا نام لے کر انہیں سمجھ میں نہیں آیا کہ خدا کا نام لے کر کوئی جھوٹی قسم کھا سکتا ہے، بھلا اللہ کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے گا اس درجہ عظمت تھی کہ ذہن میں نہیں آیا کہ یہ کم بخت شیطان ہے، جھوٹی قسم کھا رہا ہے، کیونکہ قلب اتنا سچا تھا کہ ان کے دل میں آیا ہی نہیں کہ خدا کا نام لے کے بھی کوئی جھوٹا حلف کرسکتا ہے، تو یقین آگیا اور اس عظمت کے سبب سے آدم علیہ السلام مبتلا ہو گئے، اس واسطے کہ جب آدمی خود پاک اور سچا ہوتا ہے تو دوسرا بھی ویسے ہی نظر آتا ہے، اس کے دل میں برائی بیٹھتی ہی نہیں سچے آدمی کے سامنے اگر آپ جا کے بات کریں تو وہ اپنے جیسا سمجھے گا کہ بھلا اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔

مولانا اصغر کے نانا حضرت شاہ صاحب کی مادہ لوحی...... ہمارے بزرگوں میں سے آپ نے حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ کو تو دیکھا ہی ہوگا سب جانتے ہیں، میاں صاحبؒ کے نانا تھے حضرت شاہ صاحبؒ بہت ہی بزرگ لوگوں میں سے تھے اور اس درجہ کے بزرگ کہ ان کی نسبت حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا مقولہ یہ تھا

① پارہ: ۸، سورة: الاعراف، الآیة: ۲۱.

کہ انہیں عمر بھر کبھی صغیرہ گناہ کا تو تصور بھی نہیں آیا، کرنا تو کجا؟ تصور بھی نہیں آیا بالکل سادہ سچی طبیعت اور معصوم صفت، تصور بھی کبھی گناہ کا نہیں آیا، کرنا تو کجا، ہر وقت حق تعالیٰ میں مستغرق رہتے تھے، انہیں اپنا نام تک یاد نہیں رہتا تھا، اولاد کے نام یاد نہیں رہتے تھے، بچوں کو قرآن شریف پڑھانے کا شغل رکھتے تھے۔ اس زمانے میں گھڑی گھنٹے تو تھے نہیں ایک کھونٹی ڈال رکھی تھی جب دھوپ وہاں تک پہنچ گئی تو بچوں نے کہہ دیا کہ حضرت وقت ہو گیا تو فرمادیتے بھئی چھٹی، تو بعض دفعہ لڑکوں نے شرارت کردی کہ کھونٹی آدھ گز دور گاڑ دی تو دھوپ جلدی پہنچ گئی اور بچوں نے کہہ دیا کہ اجی میاں صاحب وقت ہو گیا، اچھا بھائی جاؤ چھٹی ہو گئی۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ جھوٹ بول رہے ہیں انہوں نے شرارت کی ہے، کھونٹی آگے ڈال دی ہے، فرماتے ہیں مسلمان کا بچہ جھوٹ نہیں بول سکتا اس درجہ معصوم صفت تھے، بالکل سیدھی اور سچی طبیعت کہ بچے جھوٹ نہیں بول سکتے کیونکہ سوائے سچائی کے ان کے قلب میں اس کا تصور ہی نہیں تھا، کہ کوئی جھوٹ بول سکتا ہے، شاہ صاحب کا دوسرا واقعہ ایک دفعہ بیمار ہوئے آنکھوں میں بیماری ہوئی اور پڑ گئے تو کسی نے آکر کہہ دیا کہ اس مرض میں آنکھ جاتی رہتی ہے، نگاہ باقی نہیں رہتی تو یقین آگیا کہ اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے تو آنکھ باندھ کے بیٹھ گئے، جو آیا پوچھنے کہ میاں صاحب کیسی طبیعت ہے کہ جی میری آنکھیں جاتی رہیں کہ فلاں صاحب آئے تھے وہ کہہ گئے تھے کہ اس مرض میں بینائی رہا نہیں کرتی تو اس کا یقین آگیا ایک مہینہ گزر گیا اور بیٹھے ہوئے ہیں آنکھ باندھ کے کہ میری آنکھ جاتی رہی۔

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مدرس تھے، فقط عالم نہیں بلکہ عارف باللہ اور صاحب کشف و کرامت بزرگوں میں سے تھے، تو مولانا کے علم میں آیا سمجھ گئے کہ کسی نے جا کر کہہ دیا اور یقین آگیا ہے، کہ آنکھوں میں بینائی نہیں رہی تو مولانا خود پہنچے اور جا کر پوچھا، میاں جی صاحب کیا حال ہے؟ فرمایا حضرت جی میری آنکھیں جاتی رہیں، وہ فلاں صاحب آئے تھے، وہ کہہ گئے تھے کہ اس مرض میں آنکھیں رہا نہیں کرتیں تو میری بینائی جاتی رہی، مولانا نے فرمایا کہ میاں صاحب میں پانی پڑھ کے دیتا ہوں اس کی خاصیت یہ ہے کہ جب آنکھ کو چھینٹا دیا جائے تو بینائی فوراً آجاتی ہے کہا اللہ آپ کو جزائے خیر دے، مجھے ضرور پانی پڑھ کے دیجئے، مولانا نے وہیں الحمد وغیرہ کچھ پڑھ کے چھینٹا دیا کہ میاں صاحب بینائی آگئی ہے آنکھ کھول دیں انہوں نے آنکھ کھول دی، بینائی تو تھی ہی، کوئی گئی تھوڑا ہی تھی؟ سینکڑوں دعائیں دیں اللہ آپ کو جزائے خیر دے، دیکھو میری بینائی آگئی ہے۔

اور اس سے بڑا لطیفہ یہ ہوا کہ اگلے دن مولانا جو کہ چھتے کی مسجد میں رہتے تھے، بہت سے اندھے مسجد میں دوڑتے دوڑتے چلے آرہے ہیں، گاڑیوں میں بیٹھ کر آرہے ہیں کہ مولانا ایسا پانی پڑھتے ہیں کہ بینائی آجاتی ہے، تب مولانا نے کہا بھائی میرے پاس نہ کوئی پانی پڑھ کے دینا آتا ہے اور نہ اور کچھ، وہ تو میاں صاحب سے کسی نے کہہ دیا تھا کہ بینائی جاتی رہی ہے انہیں اس کا یقین ہو گیا تو میں نے بھی یقین دلا دیا، یہ نہیں میں کہہ سکتا تھا کہ

اس نے جھوٹ بولا یہ ان کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی جھوٹا ہو سکتا ہے اس لئے میں نے یہ تدبیر اختیار کی میں جانتا تھا کہ بینائی تو موجود ہے، ایک حیلے کی ضرورت ہے آنکھ کھلوانے کے لئے تو میں نے یہ حیلہ کیا، مجھے کوئی پانی وانی پڑھنا نہیں آتا، تو وہ بیچارے اندھے رخصت ہوئے، ورنہ سینکڑوں اندھے موجود جو ٹھیلوں میں گاڑیوں میں چلے آ رہے ہیں، تو نہایت معصوم صفت بزرگ تھے۔

محبوب اختر کا میاں جی کی خدمت میں گندستی کی شکایت کرنا ...... ہمارے عزیزوں میں سے ایک صاحب تھے، محبوب اختر ان کا نام تھا، بیچارے بہت غریب تھے، اوران پر فاقے ہونے لگے تو وہ میاں جی کی خدمت میں آئے کہ حضرت جی دعاء کردو میرے واسطے کہ فاقوں کی نوبت آ گئی ہے، کچھ بھی گھر میں باقی نہیں رہا، میاں صاحب نے فرمایا گھر بیٹھ کر روٹی؟ سفر کرو، کہا کہ کہاں کا سفر کروں؟ کہا جہاں کا جی چاہے کرلو ملے گا سفر ہی میں، اب وہ بیچارے حیران ہوئے اعتقاد پختہ تھا وہ میاں صاحب کے ہاں سے اٹھے تو سیدھے اسٹیشن روانہ ہو گئے، اب کچھ خبر نہیں کہ کہاں جا رہا ہوں کون سی منزل ہے، وہ اسٹیشن پہنچ گئے، مظفرنگر کی ریل تیار تھی، دو آنے کا ٹکٹ ملتا تھا، تو دو آنے کا ٹکٹ لیا اور ریل میں بیٹھ گئے، اب ریل میں بیٹھ کے سوچ رہے ہیں کہ کل چار آنے میرے پاس تھے، دو آنے کا تو ٹکٹ لے لیا اور وہاں کوئی میری جان پہچان نہیں، کس کے ہاں اتروں گا؟ کہاں کھانا کھاؤں گا؟ اور اگر دو آنے کا کھانا کھا لیا تو پھر واپسی کا ٹکٹ نہیں گھر کیسے آؤں گا؟ اب بیچارے پریشان ادھر میاں صاحب نے کہہ دیا تھا اعتقاد پورا تھا صبر وشکر کر کے بیٹھ گئے کہ اللہ مالک ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا اسٹیشن پر جا کر اترے تو ابھی باہر نہیں نکلے تھے کہ ایک سپاہی نے آ کے ہاتھ پکڑا کہ چلو صاحب بلا رہا ہے، پولیس کا انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا، وہ تمہیں بلا رہے ہیں، اب یہ بیچارے بہت گھبرائے کہ جیل تیار ہے، خیر وہ سپاہی لایا تو اسٹیشن پر وہ انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا، میز لگی ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا، یہ جا کے پیش کئے گئے اس نے کہا کہ بھائی تو ملازمت کرے گا؟ جی ہاں کروں گا، انہوں نے کہ میں تو سمجھا تھا کہ جیل بھجوائے گا مگر یہاں تو معاملہ دوسرا ہو رہا ہے۔ اسے ضرورت تھی کہ سپاہیوں میں بھرتی کرے تو اس نے کہا مسافروں میں جس کو طلب دیکھو بلا کر اسے لے آؤ، تا کہ ہم بھرتی کریں انگریزوں کا نیا نیا زمانہ تھا، بھرتی ہو رہی تھی تو ان کو کہا گیا ملازمت کرو گے؟ کہا جی ہاں کروں گا، اس نے سینہ ناپا جو اس زمانے کا دستور تھا اور کہا کہ آج سے تم ملازم ہو گئے اور تمہاری تنخواہ اٹھارہ روپے ہوگی اس زمانے کے ۱۸ روپے ایسے تھے جس طرح آج کے ہزار روپے ہیں۔

اس کے بعد ان سے کہا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے کہا میں دیوبند کا رہنے والا ہوں اور میں تو گھر سے آیا ہوں گھر والوں کو ملازمت کی اطلاع نہیں ہے، اس نے حکم دیا کہ آدھی تنخواہ نو روپے انہیں دے دو، اور کہا تم گھر والوں کو اطلاع کر کے پرسوں یہاں آ کر حاضری دو یہ نو روپے لے کر اب دوسری ریل پر واپس ہوئے، پھر نو روپے اس زمانے میں ایسے تھے جیسے ۹۰۰ روپے ہاتھ آ گئے اس قدر ہشاش بشاش اور منفرح اور خوش کہ انہوں نے

برسہابرس ۹ روپے نہیں دیکھے تھے فاقوں کی نوبت تھی، دیوبند پہنچے تو چار آنے کی جلیبیاں خریدیں، اور میاں صاحب کے پاس ہدیہ کے طور پر لے گئے اور کہا، اجی میاں صاحب! ملازم ہوگیا، ۱۸ روپے مہینے پر! فرمانے لگے میاں دیکھو ہم کہتے نہیں تھے کہ گھر بیٹھ کے نہیں روٹی ملتی، باہر جاکے ملے گی تو ایسے معصوم صفت بزرگ تھے۔

دارالعلوم دیوبند کی پہلی اینٹ رکھنے والے میاں جی اور ان کے داماد کا حال...... دارالعلوم دیوبند کی جب بنیاد رکھی گئی ہے تو سب سے پہلی اینٹ انہی سے رکھوائی ہے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اور یہ فرمایا کہ ایسے شخص سے اینٹ رکھوار ہا ہوں کہ جسے عمر بھر صغیرہ گناہ کا تصور تک کبھی نہیں آیا کبیرہ گناہ تو دور کی بات ہے، تو ایسے لوگوں نے بنیاد رکھی جو بالکل معصوم صفت ہیں، تو ان کی سچائی کی کیفیت ان کی پاکیزگی قلب یہ تھی کہ ہروقت مستغرق رہتے تھے۔

چنانچہ ان کے داماد تھے ان کا نام تھا''اللہ بندہ'' جب داماد آتے فرماتے کون ہوتم؟ فوری پہچانتے نہیں تھے، اس درجہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ تھی کہ ادھر کی طرف دھیان نہیں تھا پوچھتے کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ جی میں ہوں اللہ بندہ فرماتے ارے بھائی نام بتاؤ، اللہ بندے تو سارے ہی ہیں، ہم بھی تو اللہ بندے ہیں، اجی اس نے کہا کہ میرا نام یہی ہے، فرماتے بھلے یہ کیا نام ہوا؟ ہم بھی تو اللہ بندے ہیں، انہوں نے کہا جی میں ہوں آپ کا داماد، اچھا اچھا اب سمجھے، بات چیت کر کے واپس چلے گئے۔

اگر دس منٹ کے بعد آ گئے پھر وہی سوال بھائی کون ہوتم؟ اب پھر اللہ بندے پہ بحث ہورہی ہے تو نہ اپنا نام یاد رہتا تھا نہ اولاد کا نام یاد رہتا تھا، ہروقت استغرق کی کیفیت طاری رہتی تھی، تو اس درجہ معصوم صفت تھے تو ان کے سامنے جاکر کوئی بات کہتا تو ان کے دھیان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے، جیسے سچے خود ہیں ایسے ہی دوسرے کو سچا سمجھتے تھے، اور اگر کوئی قسم کھا کے کہتا تب تو یقین کرنے میں کوئی مانع نہ تھا، تو جب انبیاء علیہم السلام کے امتیوں میں ایسے سچے ہیں جو نبی نہیں ہیں، مگر قلوب میں سچائی ہے تو انبیاء کے قلوب کی سچائی کا کیا عالم ہوگا؟

تو آدم علیہ السلام سچوں سے بڑھ کر سچے پیغمبر اور ہیں جنت میں، ابھی دنیا کی ہوا بھی نہیں کھائی، تو جہاں فریب کا تصور تک نہیں وہاں کم بخت شیطان نے قسم کھائی جاکے کہ میں آپ کا خیر خواہ ہوں، اور اس درخت کے کھالینے میں آپ کے لئے بڑی برکات اور فوائد ہیں تو یقین آ گیا کہ بھلا اللہ کا نام لے کر کون جھوٹ بول سکتا ہے، تو عظمتِ خداوندی مبتلا ہونے کا باعث ہوئی، تو میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ قلوب کے اندر جب سچائی ہوتی ہے تو دوسرے کے جھوٹ کو بھی آدمی نہیں سمجھتا، اور مبتلا ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات بھلے لوگ زیادہ اسی میں مارے جاتے ہیں کہ دوسرے نے قسم کھائی چپڑی چپڑی باتیں کیں مبتلا ہو گئے لیکن اکثر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ نیک لوگ اگر مبتلا بھی ہو جائیں عظمت الٰہی کے سبب سے کسی کو جھوٹا نہ سمجھیں اور وہ جھوٹا آدمی پھانس لے تو آخیر میں پھر نتیجہ اسی کے حق میں برا نکلتا ہے یہ بری کر دیئے جاتے ہیں، اللہ کے ہاں سے ان کی مضرت نہیں پہنچتی نیت کی سچائی کی وجہ سے تو نبی علیہ السلام کے سامنے صحابہ کرامؓ کی یہ حالت تھی

کہ اتباع اور پیروی میں اس درجہ آگے تھے کہ اپنے مشاہدے کو جھٹلانے کے لئے تیار اور آنکھوں دیکھی چیزیں جھٹلانے کو تیار مگر پیغمبر کا قول جھٹلانے کو تیار نہیں تو اصل حقیقت یہی ہے۔

معیارِ اتباع...... حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جمعہ پڑھنے کے لئے تشریف لے جا رہے تھے اور کچھ دیر ہوگئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر پہنچ گئے خطبہ شروع ہوگیا اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ جب خطیب ممبر پر پہنچ جائے ''اِذَا خَــرَجَ الْاِمَـامُ فَلَا صَـلٰوةَ وَلَا كَلَامَ'' جب امام اٹھ کر چلنے لگے ممبر کی طرف تو اب نہ نماز پڑھنی جائز ہے، اور نہ بات چیت کرنی جائز ہے بلکہ سکوت کے ساتھ خطبہ سننے کے لئے تیار ہو جائے، اگر کسی نے پہلے سے نماز شروع کر دی تھی اور امام کھڑا ہوگیا تو فرمایا گیا کہ اگر چار رکعت کی نیت کی تو دو پر سلام پھیر دے، لمبی نہ کرے، نماز جلد مکمل کرے بعد میں پھر قضا کر لے، مگر اس وقت سلام پھیر دے، اس وقت کی بڑی عبادت یہی ہے کہ خطبہ سنا جائے، تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے اور خطبہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف لا چکے تھے، جب یہ دروازے میں داخل ہوئے تو ارادہ کر رہے تھے کہ نماز کے لئے کھڑے ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممبر پر فرمایا اِجْلِسُ بیٹھ جاؤ، مطلب یہ تھا کہ جا کر نماز نہ پڑھو خطبہ شروع ہوگیا ہے بیٹھ جاؤ تو مسجد میں نہیں پہنچے مسجد کے دروازے سے باہر تھے، آواز کانوں میں پڑی وہیں (سڑک) کے اوپر بیٹھ گئے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم آگیا تو اب تاخیر اطاعت میں جائز نہیں، حالانکہ ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ مسجد میں آکر نماز نہ پڑھو خطبہ سنو مگر لفظ تھا اِجْلِسُ کا کہ بیٹھ جاؤ تو جہاں کان میں آواز پڑی وہیں بیٹھ گئے، سڑک کے اوپر بیٹھ گئے کہ اب اطاعت میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

اطاعت کا اخروی فائدہ...... جب تک یہ درجہ اطاعت کا نہ آجائے کلامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور کلام خداوندی کے بارے میں کہ ہر چیز سے قطع نظر کر کے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھ کے جھک جائے، اس وقت تک آدمی کی نجات کی صورت نہیں ہوتی، تو کہاں وہ صحابہ کرامؓ کہ اپنے مشاہدے کو اطاعت نبوی میں جھٹلانے کے لئے تیار اور کہاں مشرکین کہ خدا اور رسول کے کلام کو اپنے وسوسوں کے مقابلے میں جھٹلانے کے لئے تیار ہیں، وہاں نجات کا کیا کام تھا، تو یہی تقابل دکھلایا گیا ہے کہ آج وہ لوگ اطاعت نہیں کرتے اور فرضی چیزوں میں پڑے ہوئے ہیں، وہ قیامت کے دن بھی اطاعت نہیں کریں گے انہیں چیزوں کے اندر مبتلا ہوں گے اور ہلاکت کی طرف جائیں گے، اور جو یہاں مان گئے ہیں وہ وہاں بھی مانیں گے جو یہاں پنڈلی کے آگے جھک گئے وہ وہاں بھی سجدے میں گریں گے، اور ان کے لئے وہاں نجات ہوگی۔

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَاھَادِیَ لَہٗ . وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَ نَـاوَسَـنَدَ نَـا وَمَوْلَا نَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ،اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ، وَدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّا بَعْدُ!فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴿اَمْ تَسْئَلُھُمْ اَجْرًا فَھُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ o اَمْ عِنْدَھُمُ الْغَیْبُ فَھُمْ یَکْتُبُوْنَ o فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰی وَھُوَ مَکْظُوْمٌ o لَوْ لَآ اَنْ تَدٰرَکَہٗ نِعْمَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَھُوَ مَذْمُوْمٌ o فَاجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَجَعَلَہٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ o وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِھِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّکْرَ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّہٗ لَمَجْنُوْنٌ o وَمَا ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾

بزرگانِ محترم! کفارِ مکہ کو دعوت دینے کے سلسلے میں کیونکہ ان کی طرف سے انکار اور غفلت کا اظہار ہوتا تھا تو اندیشہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بمقتضی بشریت غم وغصہ پیدا ہو، اور اس میں ممکن ہے کہ آپ کوئی بد دعا کر دیں کہ دعوت وارشاد تو اس قوم کو پہنچ گئی ہے اس واسطے تسلی دینے کے لئے آپ کے قلب مبارک کو ثابت رکھنے کے لئے یہاں سے کچھ چیزیں ارشاد فرمائیں۔

ارشاداتِ نبوت کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں...... حاصل ارشاد کا یہ ہے کہ ایک سچی بات کو جب ایک سچے انسان کے کہنے پر نہ مانا جائے، تو اس کی عالم اسباب میں دو وجہیں ہوسکتی ہیں یا تو یہ کہ سچ بات کہنے والے پر خود غرضی کا شبہ ہو کہ اس کی اپنی کوئی غرض پوشیدہ ہے تو خود غرض آدمی اگر کوئی سچی بات بھی کہتا ہے تو اس کا اثر نہیں ہوتا نہ ماننے کو جی چاہتا ہے، جیسے عموماً کوئی پیشہ ور واعظ ہو باتیں سچی کہے اور اخیر میں پیسے مانگنے شروع کردے، تو لوگ سمجھ جائیں گے کہ ساری سچی باتیں اس پیسے کے لئے کہی جارہی تھیں، اس سے لوگوں کی طبیعت ہٹ جائے گی اور کہیں گے کہ ایسی باتیں پیسے مانگنے کے لئے ہیں خدا کے لئے نہیں۔ بات صحیح تھی واقعات بھی صحیح بیان کئے مگر چونکہ اپنی غرض آگئی اس واسطے بات بھی بے اثر بن گئی، جیسے عارف رومیؒ نے کہا کہ:

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد

جب غرض آجاتی ہے تو ہنر چھپ جاتا ہے! سب کمال بے کمالی ہو کر رہ جاتی ہے، کبھی تو اس وجہ سے آدمی سچی بات نہیں مانتا کہ کہنے والے میں خود غرضی کا شبہ ہوتا ہے، اور کبھی اس لئے نہیں مانتا کہ بات گو سچی ہو مگر اس کے خلاف قطعی علم سے آدمی جانتا ہے کہ اصل تو وہ ہے یہ خوامخواہ کہہ رہا ہے، اور اس پہلی بات پر مطمئن ہے کہ وہ واقعی من جانب اللہ ہے اور صحیح ہے اور معقول دلائل پر مبنی ہے، جب میرے پاس دلیل وحجت ایک چیز کی موجود ہے تو کیا ضرورت ہے کہ دوسرے کی بات مان لوں میرے پاس خود بات موجود ہے مدلل، مثبت، برہان، حجتیں تو یہی دو وجہیں ہوتی ہیں کہ یا آدمی مطمئن ہو کسی دلیل سے، یا یہ کہ اپنی بات صحیح نہیں دوسرے کی صحیح ہے، مگر معاذ اللہ وہ خود غرض ہے تو اثر نہیں ہوگا، اس لئے فرمایا کہ: جب یہ دو وجہیں نہیں ہوں گی تو نہ تو کہنے والا خود غرض ہے نہ اس کے پاس کوئی حجت ہے اب جو انکار ہے وہ محض عناد اور دشمنی سے ہے، اس واسطے اس عناد کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے کہ ہٹ دھرمی ہے۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہئے۔ تو اس کو فرمایا گیا کہ آپ جو نصیحت فرما رہے ہیں اور رات دن دعوت دے رہے ہیں اور پھر بھی نہیں مانتے تو: ﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ کیا آپ کوئی اجرت چاہتے ہیں ان سے یا آپ کی کوئی وابستہ ہے کہ آپ اسکی وجہ سے یہ ڈر رہے ہیں کہ اگر بات سن لی تو پھر آپ کی غرض پوری کرنی پڑے گی اور ان کو خواہ مخواہ ڈنڈ بھرنا پڑ جائے گا بوجھل ہو جائینگے۔

اس واسطے نہیں سنتے کہ اخیر میں ان کی غرض سامنے آئے گی ہم اس کے اندر بوجھل پڑ جائیں گے۔ آپ کوئی ان سے اجرت چاہتے ہیں کہ جس کے تاوان میں یہ دبے جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بات ہی نہ سنو اگر بات مان لی تو پھر یہ سوال کریں گے وہ پورا کرنا پڑیگا پیسے کا دولت کا اس واسطے اچھا ہے کہ مانو ہی نہ سنو ہی نہ تو کیا یہ بات ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے آپ سے زیادہ سچا کون ، اللہ سے زیادہ سچا کون، اللہ کے رسول سے زیادہ سچا کون، رسول کا معنی ہی یہی ہے کہ جو کہے وہ سچ کہے وہاں غلط بول کا نشان ہی نہیں ہے۔

رسول سچا ہی ہوا کرتا ہے...... حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہٗ نے اپنے مرید کو جو حد کمال کو پہنچ گیا تھا اجازت اور خلافت عطا کی، جاتے ہوئے خلیفہ نے عرض کیا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمائیے! فرمایا: دو باتوں کا خیال رکھنا ایک تو خدائی کا دعویٰ مت کرنا، ایک نبی ہونے کا دعویٰ مت کرنا، بے چارے کو بڑی حیرت ہوئی اس نے کہا حضرت آپ کو مجھ سے یہ خطرہ تھا کیا میں خدائی کا دعویٰ کرونگا؟...... صلاح وتقویٰ بھی ثابت ہے فرمایا: ایسا ہو جاتا کہ خدائی کا دعویٰ کرونگا اور اس سے بڑھ کر نبوت کا دعویٰ کرونگا یہ تو کسی مسلمان کا بھی کام نہیں چہ جائیکہ ایک صالح مرشد راشد کا کام ہو..... فرمایا پہلے اس کے معنی سمجھ لو کہ خدائی کے دعویٰ کرنے کے معنی کیا ہیں اور نبوت کے دعویٰ کرنے کے معنی کیا ہیں؟

اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ جو میں چاہوں وہی ہو، یہ درحقیقت خدائی کا مدعی ہے، اس لئے کہ خدا ہی وہ ذات ہے جو وہ چاہے وہی ہو کر رہے گا، اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، اگر کوئی انسان اس درجہ میں آجائے کہ جو میں کہوں وہی

پورا ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ در پردہ خدائی کا دعویٰ کر رہا ہے، وہ بشریت اور انسانیت کی حد سے نکل گیا ہے۔ بشر کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو چاہے کبھی پورا ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا، وہ تو محتاج ہے عاجز اور بے چارہ ہے۔ اگر ہر چیز ہماری مرضی کی پوری ہونے لگے کبھی خلاف نہ ہو تو بشر میں اور خدا میں فرق کیا رہے گا؟ خدا کے یہ معنی کہ جو وہ چاہے وہ اٹل ہو، بشر کے معنی کہ جو چاہے اگر اللہ چاہے تو پورا کر دے نہ چاہے تو نہ پورا کرے، اس کے قبضے میں کچھ نہیں، تو جو بشر بشر ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرے کہ جو میں چاہوں وہ ہو وہ لفظوں میں نہیں کہہ رہا مگر دعویٰ خدائی کا کر رہا ہے۔ تو مطلب یہ تھا حضرت سید جیلانی قدس اللہ سرہٗ کا کہ کبھی اپنی بات پر اتنی ضد اور اصرار مت کرنا کہ جو میری مرضی ہے وہی ہو، جب چار آدمی بیٹھے ہوئے ہیں تو تم بھی اپنی کہہ دو دوسرے بھی کہیں کہ جو صورت بھی ہو گی اسے مان لینا، کسی کا یہ کہنا کہ جو میں چاہوں وہی ہو یہ اصرار اور دعویٰ خدائی ہے، چاہے لفظ نہ ہو اس میں، اور فرمایا کہ جو شخص یوں کہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اسکے سوا سب باطل، وہ در پردہ نبی ہونے کا مدعی ہے، کیونکہ نبی کی ذات ہوتی ہے جو کہہ دے وہ حق ہو، وہ کبھی غلط نہیں کہہ سکتا۔ تو نبی کے معنی ہی یہی ہیں کہ جو وہ فرمائیں زبان سے وہ عین سچ ہو اور حق ہو، اس میں غلطی کا شائبہ بھی نہ ہو، کذب اور جھوٹ کا خطرہ ہی نہ ہو، اس کے اندر وہی معنی نبوت کے ہیں کہ نبی صادق اور مصدوق ہوتے ہیں کہ خود بھی سچے اور ان کے سچے ہونے کی تصدیق اللہ سچے کی طرف سے کی جاتی ہے۔ تو بہر حال جب اس میں استفہام انکاری ہے: ﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ کیا آپ ان سے کوئی اجرت مانگتے ہیں؟ نہیں اجرت نہیں مانگتے، جب آپ نہیں مانگتے اور پھر بات سچی فرما رہے ہیں اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے تو یہ معلوم ہوتا ہے ان میں ہٹ دھرمی ہے ضد پر اڑے ہوئے ہیں، کوئی حجت نہیں ہے ان کے پاس، اچھا دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی انکار کی کہ کہنے والا بیشک سچائی سے کہہ رہا ہے، اخلاص سے کہہ رہا ہے، مگر اس کے خلاف حجت ہمارے پاس موجود ہے خدا کی طرف سے کوئی دلیل آ گئی ہمارے ہاتھ میں، غرض اس کو کیوں مانیں؟ گو کہنے والا سچا ہے، بے غرض ہے، مخلص ہے، مگر ہماری ایک حجت سامنے ہے اسے کیوں مانیں؟ ظاہر بات ہے کہ حجت تو کوئی تھی نہیں ان کے پاس اس واسطے کہ حجت میں جو چیز ہوتی ہے وہ تو وہ ہے جو نبی کے ذریعے آئی ہو، وہ حجت ہی ہوتی ہے تو وہاں دین ابراہیمی علیہ السلام کو ختم کر چکے تھے مشرکین مکہ، وہ دین آسمانی ہی پر باقی نہیں تھے، یہودیت، نصرانیت کی طرف وہ بھی مائل تھے، اور ان میں بھی تحریف ہو چکی تھی، اور دین ابراہیمی باقی نہیں رہا تھا تو سوائے اوہام اور خیالات کے اور تھا کیا ان کے پاس؟ حجت دلیل کہاں تھی؟ کیا حجت ، دلیل انھیں بتلاتی تھی کہ پتھر کی مورتیوں کے آگے جھکا کرو؟ کیا حجت اور دلیل کا کام تھا کہ وہ ننگے اور برہنہ ہو کر طواف کرتے تھے، یہ کس دلیل سے سمجھا تھا انھوں نے، کیا یہ حجت اور دلیل کی بات تھی کہ نکاحوں کی چار قسمیں بنا رکھی تھیں، ایک تو اصلی نکاح جو:- یہ کہ اگر کسی کے ہاں اولاد بدصورت ہوتی ہو تو کسی خوبصورت آدمی کے ہاں بیوی بھیج دیتا وہاں سے اولاد حاصل کرے وہ میری اولاد کہلائے گی، یہ ان کے ہاں جائز تھا۔ وہ

عقد نکاح کر لیتے تھوڑی دیر کے لئے اس کو کر لیا اور پھر اس کو الگ کر دیا، یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک نے نکاح کر لیا اور کئی بھائیوں کے لئے ایک بیوی ہی کافی ہوگئی یہ حجت اور دلیل کی بات تھی؟

اس کا نہ عقل ساتھ دے اور نہ نقل ساتھ دے، تو مطلب یہ کہ اللہ کے رسول نے جو حکم دیا ہے اگر اس لئے نہیں مانتے کہ ہمارے پاس پہلے سے کوئی سچی بات موجود ہے تو وہ کیا ہے لاؤ؟ وہ سچائی پیغمبر سے آئی ہوتی تو تمہارے ہاں دین ابراہیمی ختم ہو چکا، پیغمبر کا واسطہ ہی نہیں رہا، وہ ہے کہاں سچی بات؟ تو جب نہ کہنے والے میں خود غرضی کا شائبہ ہے اور نہ تمہارے پاس کوئی حجت ہے، اور پھر بھی نہیں مانتے سچی بات کو، تو سوائے ہٹ دھرمی عناد اور ضد کے علاوہ کیا چیز ہے؟ اور جب ثابت ہوگیا کہ یہ محض عناد سے انکار کر رہے ہیں، تو دل میں غیض پیدا ہوتا ہے یا تو ان کم بختوں کے لئے بد دعا کر دو یا یہ کہ ان سے بات کرنی چھوڑ دو ممکن تھا کہ قلب مبارک میں خیال آ جاتا کہ میاں چھوڑ دو انھیں، یا یہ کہ بد دعا کر دیتے کہ نہیں مانتے کم بخت یہ آپ کے بلند مرتبے سے مناسب نہیں تھا، اس لئے تسلی کا مضمون ارشاد فرماتے ہوئے حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔

ثبات قلب کی ترغیب...... اس مقام پر آ کر آپ مچھلی والے کی طرح نہ ہو جایئے گا، یہ ارشاد ہے حضرت یونس بن متی علیہ السلام کی طرف جن کو مچھلی کے پیٹ میں قید کیا گیا تھا کہ انھوں نے قوم کے حق میں غصہ میں آ کر بد دعا کر دی اور عذاب کا وعدہ دے دیا تھا آپ ایسا نہ کیجئے گا۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی بڑی اعلیٰ بستیاں جو تھیں وہ اردن اور فلسطین میں آباد تھیں زرخیز خطہ تھا، آج بھی ہے، اس زمانے میں شام کا ملک عام تھا، اس میں فلسطین، اردن یہ سب شامل تھے، آج وہ حصے (بخرے) ہوگئے، اردن الگ ہوگیا، شام کا حصہ الگ ہوگیا، سینا کا حصہ کٹ گیا، لیکن اصل جغرافیے میں شام کا ملک عام تھا، جس میں اردن، فلسطین صحرائے سینا شامل تھے، یہی بنی اسرائیل کا مسکن تھا، تو بنی اسرائیل آباد تھے، اس زمانے میں اولوالعزم پیغمبر حضرت یوشع علیہ السلام تھے بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے، اور اس زمانے کا بادشاہ تھا حزقیہ اور وہ تابع تھا حضرت یوشع علیہ السلام کے، ان کا نام حضرت یوشع یا یاشع بن نون بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہم السلام۔

بنی اسرائیل میں نبوت وملوکیت کی ترتیب...... بنی اسرائیل میں حق تعالیٰ کی سنت کریمہ یہ تھی کہ ایک خاندان میں نبوت چل رہی تھی اور ایک خاندان میں بادشاہت چل رہی تھی، نبی احکام بھیجتے تھے، اور بادشاہ ان احکام کو نافذ کرتا تھا، بادشاہ اپنی طرف سے حکم نہیں بھیجتا تھا بس قوت نافذہ اس کے ہاتھ میں تھی اور قوت آمرہ پیغمبروں کے ہاتھ میں تھی، انھوں نے کہا کہ اللہ کا یہ حکم ہے انھوں نے ملک میں قوت سے نافذ کر دیا، یا کوئی مشکل پیش آئی تو انبیاء کے آگے شکایت کر دی، انھوں نے تدبیر بتلائی بادشاہوں نے نافذ کر دی، تو شرافت کا یہ طریق تھا بنی اسرائیل میں کہ ایک سلسلہ نبوت کا تھا اور ایک سلسلہ بادشاہت کا تھا، جیسا کہ قرآن کریم میں ایک جگہ احسان جتایا گیا بنی اسرائیل پر: ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ

﴿وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا﴾ ① موسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کو کہا کہ اے قوم احسان مانو اللہ کا اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ ﴿إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ﴾ تم میں نبی بھی پیدا کئے، ملوک اور سلاطین بھی پیدا کیے، ایک مستقل خاندان کے بعد دیگرے انبیاء علیہم السلام آرہے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل میں پیغمبر آئے ہیں، اور ایک شاخ بادشاہت کی طرف چل رہی ہے اور پے در پے سلاطین اور بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ آرہے ہیں تو بادشاہ تابع ہوتے تھے انبیاء کے، انبیاء احکام شریعت دیتے تھے، وہ اس کو نافذ کرتے تھے۔

یوشع علیہ السلام اور حذقیہ بادشاہ کا واقعہ...... تو اس زمانے کے اولوالامر پیغمبر حضرت یوشع علیہ السلام تھے، اور حذقیہ بادشاہ تھا، اس طرح سے سلطنت چل رہی تھی، اور نبوت بھی تھی تو شام اور عراق کے درمیان میں چند بستیاں تھیں موصل اور نینوا، اس میں کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی آباد تھے اور ان کی اپنی حکومت تھی، وہ موقع پا کر چڑھ دوڑے بنی اسرائیل کے اوپر اور اردن کے اوپر انھوں نے حملہ کیا سرحدیں ملی ہوئی تھیں اس حملے میں بنی اسرائیل کا نقصان ہوا، وہ بہت زیادہ مال، اسباب لے گئے، ہزاروں آدمیوں کو گرفتار کر کے لے گئے، عورتوں اور بچوں کو بھی اور شکست دے دی حذقیہ جو بادشاہ تھے وہ پریشان ہوئے اس لئے کہ ملک ویران ہو گیا، ہزاروں آدمی قیدی بن کر چلے گئے، بنی اسرائیل میں انھوں نے آ کر شکایت کی حضرت یوشع علیہ السلام سے کہ یہ صورت حال پیش آئی، ہم یہ کر سکتے ہیں کہ اس قوم پر حملہ کریں اور چھڑا لائیں اپنی قوم اور بستی کو، مگر ایک ڈر یہ ہے کہ ہمارے ہزاروں آدمی قید ہیں، جب ہم حملہ کریں گے وہ ان سب کو ذبح کر دیں گے، تو کسی کا باپ مارا جائیگا کسی کا بیٹا، کسی کا بھتیجا، ہزاروں کے رشتہ دار ختم ہو جائینگے، یہ مصیبت ہمیں پیش آرہی ہے ورنہ ہم حملہ کر دیں، اس کی کیا صورت ہو۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قوم کی آزادی کے لئے انتخاب...... حضرت یوشع علیہ السلام نے فرمایا کہ: ایک دم حملہ مت کرو، حجت تمام کر دو اور وہ یہ ہے کہ اپنے میں سے کسی پیغمبر کو بھیجو کہ وہ جا کر ہدایت کرے اور نصیحت کرے، اور یہ کہے کہ بنی اسرائیل کو چھوڑ دو کہ تم نے ظلماً ان کو قیدی کیا اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو تم پر عذاب خداوندی آئے گا، اگر وہ مان گئے اور بنی اسرائیل کو حوالے کر دیا تب تو ہمارا مقصد حاصل، پھر لڑنے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ مانے تو حجت تمام ہو گئی، اس کے بعد اگر جنگ ہو گی تو برمحل ہو گی، انھیں کوئی الزام دینے کا موقع نہیں رہے گا تو بادشاہ کی سمجھ میں آ گیا عرض کیا کہ کسے بھیجیں فرمایا کہ اس وقت پانچ پیغمبر ہیں اور پیغمبر کے معنی یہ ہیں کہ وہ سچے ہیں صادق اور کامل الاخلاص ہیں ان میں سے ایک کو مامور کر دو کہا کہ حضرت آپ ہی کسی کا انتخاب فرما دیں، محض بادشاہ کا حکم پیغمبروں میں چلے یہ بے ادبی کی بات ہے کہ جرأت کروں کہ میں پیغمبروں سے کہوں کہ آپ جائیے، آپ اولی الامر پیغمبر ہیں اسلئے آپ فرما دیں، تو انھوں نے انتخاب کر لیا کہ میری رائے میں مناسب یہ ہے کہ یونس بن متی علیہ السلام کو بھیجیں وہ بہت بڑے امانت دار قوی الحوصلہ اور صاحب عزم ہیں وہ صاحب عزم

① پارہ: ٦، سورہ: المائدہ، الآیۃ: ١٩۔

ہیں وہ جا کر نصیحت کریں گے، اور یہ بھی ان میں قوت ہے کہ اگر نصیحت نہ مانے تو وہ کوئی معجزہ دکھائیں کوئی کرامت دکھلائیں، اس سے متاثر کریں، پھر بھی نہ مانے تو تمھیں حق ہوگا کہ فوج کشی کریں۔

میرے نزدیک یہی بہتر ہے کہ یونس بن متی کو بھیجو، تو حزقیہ نے گھر کا آدمی بھیجا حضرت یونس علیہ السلام تشریف لائے، حزقیہ بادشاہ نے کہا کہ حضرت اس طرح آپ کا انتخاب ہوا ہے اور حضرت یوشع نے انتخاب کیا ہے میں تو واسطہ ہوں، میری عرض یہ ہے کہ آپ تشریف لے جائیں اور جا کے نصیحت کریں، اس قوم کو جو ہمارے بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے لے گئی ہے، فرمایا کہ یہ وحی کے ذریعے ہے؟ فرمایا انھوں نے امر خداوندی ہے، فرمایا اگر یہ امر الٰہی ہے تب تو ہر صورت میں جاؤنگا، تعمیل مجھ پر فرض ہے، اور اگر محض رائے کی بات ہے تو میرے اوقات میں خلل پڑے گا، معمولات بگڑ جائیں گے، صبح شام عبادت کے میرے معمولات ہیں تو میرا سارا نظام بگڑ جائے گا، اس لئے کسی اور کا انتخاب کیا جائے، حزقیہ نے کہا کہ یہ وحی سے تو نہیں کیا مشورہ ہے (یونس علیہ السلام) نے کہا پھر مجھے چھوڑ دو، اس نے کہا کہ آپ کے سوا کسی اور کا انتخاب نہیں ہوا، جانا آپ کو پڑے گا۔

حضرت یونس علیہ السلام کی بنی اسرائیل کی آزادی کے لئے روانگی...... جب مجبور کیا تو رنجیدہ ہوئے مگر کہا کہ بہت اچھا میں تعمیل حکم کرتا ہوں، اس لئے کہ تم بادشاہت میں امر کر رہے ہو پیغمبر کی طرف سے وہ اولوالامر پیغمبر ہیں، للہذا مجھ پر اطاعت واجب ہے چاہے وہ رائے و مشورہ ہی ہو حکم اور وحی نہ ہو لیکن بہر حال عظمت تو ہے ہی انبیاء کرام کی مشورہ بھی دیں تو وہ سو حکم سے بڑھ کر ہے ہمارے لئے، اس لئے بہر حال میں جا رہا ہوں۔ بادل نخواستہ سفر کی تیاری کی اور چونکہ عرصہ لگتا طویل اس لئے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا اور روانہ ہو گئے، اس قوم کا جو دارالسلطنت تھا وہاں پہنچے اور وہاں جا کر دربارشاہی سے اجازت چاہی تو اجازت مل گئی، جا کر حضرت یونس علیہ السلام نے نصیحت کی اور کہا کہ: ''بے وجہ تم نے ہماری قوم پر حملہ کیا، چلو حملہ ہو گیا تھا، مگر قیدی بنا کر لائے، یہ پیغمبرزادے ہیں واجب الاحترام ہیں تم نے انھیں قیدی بنالیا تو کچھ تو شرم کرنی چاہئے، اول تو مجرم بنایا، بے وجہ جرم عائد کیا اور بے وجہ جو صاحب احترام تھے انھیں گرفتار کیا، یہ ہرگز مناسب نہیں چھوڑ دو بنی اسرائیل کو' بادشاہ نے اور درباروالوں نے مذاق اڑایا کہ ایک بزرگ سفید پوش آ گیا، اس نے مجنونانہ آ کر کہہ دیا کہ ان کو چھوڑ دو اتنی محنت سے ہم نے جنگ کی اتنے آدمی ہمارے مارے گئے لاکھوں روپیہ خرچ ہوا اور جب قیدی بنا کر لائے گئے تو ان کے کہنے سے چھوڑ دیں یہ حکومت ہے کھیل تھوڑا ہی ہے کہ کسی نے آ کر کہہ دیا: چھوڑ دو اور چھوڑ دیا۔ تو مذاق اڑایا اور تمسخر کیا، اگلے دن آپ پھر تشریف لے گئے یونس بن متی علیہ السلام، پھر نصیحت کی، انھوں نے پھر تمسخر کیا، استہزا کیا بات نہیں مانتے تھے، تیسرے دن پھر نصیحت کے لئے گئے اور پھر جا کر کہا انھوں نے نہیں مانا فرمایا: کہ نہیں مانتے تو اب میں کہتا ہوں کہ تمہارے اوپر عذاب خداوندی آئے گا۔

بادشاہ کا آزادی دینے سے انکار اور حضرت یونس علیہ السلام کی تنبیہ..... فرمایا: تم میں سے ایک بھی

زندہ نہیں بچے گا سب ہلاک ہو جائیں گے، یہ ملک بھی ویران ہو جائیگا، اس دن یہ کہہ کر چلے گئے، وہاں لوگوں میں جو ذمہ دار تھے حکومت کے، انھوں نے کہا کہ صاحب اس عذاب کی کوئی میعاد ہے؟ فرمایا: ہاں! چالیس دن کے اندر اندر آ جائیگا...... یہ کہہ دیا، انھوں نے مذاق اڑایا، تمسخر کیا اب حضرت یونس علیہ السلام نے دعاء کی کہ: اے اللہ! میں چالیس دن کہہ چکا ہوں میری لاج رکھ لیجئے، ورنہ میں ذلیل ہو جاؤنگا، اور اگر چالیس دن میں عذاب نہ آیا تو اس قوم کا قاعدہ یہ ہے کہ جھوٹے کو قتل کر دیتے ہیں، تو میں جان سے بھی جاؤنگا، آبرو بھی جائیگی اس واسطے چالیس دن کے اندر اندر عذاب بھیج دیجئے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ کس نے کہا تم سے چالیس دن کی میعاد دے دو، تم نے محض اپنی رائے سے (مدت) رکھی گویا لازم کر دی، یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے، تم نے غلط حرکت کی اب نادم اور شرمندہ مگر دعا یہ مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! عذاب بھیجئے اس قوم پر ورنہ میں رسوا ہو جاؤنگا جب پچیس دن گزر گئے اور عذاب کے آثار نہ نمایاں ہوئے تو مایوس ہو کر بستی سے کافی دور جا کر ٹھہرے کہ عذاب تو آ نہیں رہا اور میں جھوٹا بنوں گا اور میری خفت ہوگی۔ ممکن ہے میری جان بھی جاتی رہے اور پھر یہی درخواست کہ یا اللہ عذاب بھیجئے، فرمایا: کہ کیسے بھیج دوں کیوں تم نے کہا ہم چالیس دن کے اندر اندر عذاب بھیج دیں جب ہم نے تم پر منکشف نہیں کیا وحی نہیں بھیجی از خود تم نے کیسے چالیس دن کا وعدہ دے دیا؟ اب بہت پریشان ہوئے لیکن بہر حال پیغمبر کا قول تھا سچوں کی بات اللہ سچی بھی کرتا ہے۔

آثارِ عذاب اور قوم کی توبہ...... اس کے بعد جب ۳۵ دن گزرے ادھر تو حضرت یونس علیہ السلام مایوس ہو گئے کہ عذاب نہیں آئے گا اور میں جھوٹا بنوں گا، تو اس ملک کو چھوڑ کر روانہ ہو گئے اور ادھر حق تعالیٰ نے عذاب کے آثار بھیجے اور قوم نے دیکھا کہ آسمان سے سیاہ قسم کے بادل تہہ در تہہ ہو کر آ رہے ہیں اور اس میں سے دھواں نکل رہا ہے اور وہ دھواں قریب ہوتا جا رہا ہے اب لوگوں کو یقین ہوا کہ بیشک پیغمبر تھے جو بات کہی وہ سچی کہی یہ تو عذاب آیا اور یہ کہ آ گیا تو ایک نہیں بچے گا اب فکر پڑی بادشاہ کو بھی وزراء کو بھی امرائے دولت کو بھی اور قوم کو بھی، تو بادشاہ کی طرف سے اعلان ہوا کہ نکل کر میدان میں جائیں اور اپنے گریبان کھول کر کے اللہ کے سامنے فریاد کرنی شروع کر دو اور روؤ پیٹو حق تعالیٰ کے سامنے کہ یہ تو آ گیا عذاب۔ چنانچہ ساری قوم شہر سے باہر نکلی ننگے سر، ننگے پیر، بادشاہ بھی ساتھ، وزراء بھی ساتھ، ننگے سر، ننگے پیر، گریبان کھلے ہوئے، بال بکھرے ہوئے، روتے ہوئے آ کے سجدے میں گرے، اور کہا کہ: اے اللہ! ہم سے غلطی ہو گئی، تیرے نبی نے جو وعدہ دیا تھا، وہ سچا تھا، اور آپ اس عذاب کو اٹھا دیں تو ہم بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے، اور جو علاقہ لیا وہ بھی چھوڑ دیں گے، دو تین دن تک مسلسل اسی طرح شہر سے باہر آ کے روتے رہے، حق تعالیٰ کو یہ عجز و انکسار پسند آیا اور وہاں تو عجز و انکسار ہی پسند ہے کبر و نخوت پسند نہیں ہے، کبر اور کبریائی یہ اسی کا خاصہ ہے کسی بندے کو حق نہیں ہے تکبر کرنے کا، بندے کا حق یہی ہے کہ وہ عجز اور فروتنی اور خاکساری اور جھکنا ہی اختیار کرے، حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور تین دن رہ گئے تھے

چالیس دن ہونے میں کہ وہ دھواں اوپر اٹھنا شروع ہوا اور چند گھنٹے میں پورا آسمان صاف ہوگیا، جو کئی دن سے سیاہی پھیلی ہوئی تھی آسمان پہ اور دھواں پھیل رہا تھا وہ سب صاف ہوگیا۔

حضرت یونس علیہ السلام کی تلاش......اب یہ مطمئن ہوئے تو بادشاہ نے آدمی دوڑائے کہ اس گدڑی پوش فقیر کو پکڑ کر لاؤ کہ اس کے آگے بھی ہاتھ جوڑیں اور ان سے کہیں کہ تم بھی دعاء کرو اور بنی اسرائیل کو ان کے حوالے کریں اور جو جو انھوں نے کہا تھا اس کی تعمیل کریں، اور ان پر ایمان لائیں انہی کے مطابق سب چلیں۔ یونس علیہ السلام ملک چھوڑ کر جاچکے تھے کہ جب عذاب نہیں آرہا تو میری خفت ہوگی، تو میں اس ملک میں نہیں رہ سکتا، ادھر بادشاہ نے اعلان کیا کہ ڈھونڈو اس فقیر کو جہاں بھی ہو، حتی کہ یہ اعلان کیا کہ جو لے آئیگا انھیں تو ایک دن کے لئے پوری سلطنت کا مالک بنادوں گا، اس ایک دن میں وہ جو چاہے خرچ کرے، جو چاہے اپنے لئے لے لے اس کارخانے میں سے جو چاہے لے، جاگیریں، املاک ایک دن کے لئے ملک اس کا۔ تو سینکڑوں آدمی نکل گئے ڈھونڈنے مگر پورے ملک میں ڈھونڈلیا لیکن یونس علیہ السلام کا پتہ نہ چلا، یونس علیہ السلام نے سوچا اور کچھ دیہاتیوں سے معلوم ہوا کہ کچھ آثار عذاب کے آئے تھے اور وہ رفع ہوگیا، اور آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں یہ یوں سمجھے کہ عذاب نہیں آیا تو میرے قتل کرنے کے لئے مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام پر آثارِ عتاب کا آغاز......تو میں وہاں جا کر جان خواہ مخواہ جوکھوں میں ڈالوں، میری بات تو ہوئی نہیں اور سخت مغموم اور رنجیدہ کہ میری بات تو رہی نہیں، اللہ نے مجھے وہاں ذلیل کر دیا حالانکہ وہاں تو ان کی انتہائی عزت ہورہی ہے اور انھیں پتہ نہیں، اور یہ سوچ رہے ہیں کہ میں وہاں گیا تو اور ذلت ہوگی میری، اور ادھر شام کی طرف بھی نہیں لوٹے کہ اپنوں میں جب جاؤں گا تو وہ الگ مجھے ذلیل سمجھیں گے کہ تجھے بھیجا تھا اصلاح کے لئے وہ تو نہ ہوسکی وعدے دیئے وہ پورے نہ ہوئے اور اللہ کے ہاں بھی تم ملزم قرار پاگئے، تو تمھاری کوئی وقعت نہیں تو نہ وہاں وقعت ہوگی اور نہ یہاں تو میں کسی تیسری جگہ جاؤں اور یہ کہہ کے قدم بڑھایا اور دل میں آگیا کہ میں حق تعالیٰ کی نظر سے گر گیا ہوں اور میرے سے غلطی ہوئی اور میں نے بلا مرضی حق چالیس دن کا وعدہ دے دیا جو مجھے حق نہیں تھا، غلطی کا احساس ہوا اور وہ وجہ عتاب بنی، جب روانہ ہوئے تو صورت حال یہ ہوئی کہ تشریف لے جارہے تھے بیوی بچے پیدل ساتھ، ایک درخت کے نیچے بیوی کو بھی بٹھلا دیا اور بچوں کو بھی، اور خود کھانا تلاش کرنے گئے وہاں کوئی شہزادہ نکل رہا تھا، اس نے دیکھا کہ ایک نہایت حسین وجمیل عورت دو بچوں کو لئے بیٹھی ہے اس نے حکم دیا کہ اس عورت کو گرفتار کر کے ہمارے محل میں داخل کردو اس کی طبیعت مائل ہوگئی، عورت بیوی حضرت یونس علیہ السلام کی وہ تو گرفتار ہوکر شہزادے کے ساتھ چلی گئی، اب جو آئے تو دیکھا کہ بیوی نہیں ہے تو دیہات والوں نے بیان کیا کہ اس طرح ایک بادشاہ زادہ آیا اور وہ آپ کی بیوی کو لے گیا، سمجھ گئے کہ یہ عتاب کے آثار شروع ہوگئے صبر وشکر کیا دو بچوں میں سے ایک کو کندھے پہ لیا اور ایک کا ہاتھ پکڑا اور دریا کے

پار ہونا چاہا دریا ایسا تھا کہ کشتی کی ضرورت نہیں تھی، دریا میں اترے تو ایک بچے کو چھوڑ دیا کنارے پہ کہ ایک کو اس کنارے چھوڑ کر پھر اس کو لے جاؤں گا جب بیچ منجدھار پہنچے تو بھیڑیا آ کر اس بچے کو اٹھا لے گیا اس کی پریشانی میں جب دوڑے بچانے کو تو جو کندھے پر تھا وہ پانی میں گر پڑا وہ بہہ گیا بیوی بھی گئی، بچے بھی گئے اب سمجھ گئے کہ میں اس وقت زیر عتاب ہوں اور حق تعالیٰ کی طرف سے یہ چیزیں بطور عتاب کے بطور سزا کے مجھ پر مسلط ہیں استغفار کر رہے ہیں رو رہے ہیں اسی طرح روانہ ہوئے۔

کشتی میں سواری......اب بالآخر ایک بڑا دریا آ گیا تو کشتی میں بیٹھے اور اس سے کہا کہ بھائی کرایہ تو میرے پاس ہے نہیں میں مفلس ہوں، تم لوجہ اللہ مجھے بٹھالو، تو کشتی والے نے کہا کہ آپ کو ضرور بٹھلائیں گے آپ کے چہرے کا نور بتلا رہا ہے کہ آپ کوئی بہت بڑے صالح اور نہایت ہی عابد اور زاہد لوگوں میں ہیں، تو ہماری کشتی میں برکت ہو جائے گی، میں آپ سے کرایہ نہیں لوں گا، آپ تشریف رکھیں بڑے احترام سے بٹھلایا، جب بیچ منجدھار کے کشتی پہنچی تو ایک دم طوفان نے آ کر کشتی کو گھیرا اور کشتی کا ملاح پریشان ہوا کہ کیا صورت ہو گی، تو اس زمانے میں چونکہ لوگ نیک دل ہوتے تھے، اور محض پیسے کے پجاری نہیں تھے، بلکہ کچھ تعلق مع اللہ بھی ہوتا تھا، تو کپتان نے آ کر کہا کہ صاحب! تجربہ یہ ہے کہ جس قسم کا طوفان ہے یہ جب آتا ہے کہ جب میری کشتی میں کوئی ایسا شخص ہو کہ جو اپنے مالک کا نافرمان اور آقا سے بھاگا ہوا غلام ہو، یہ اس قسم کا طوفان آ رہا ہے تو اس وقت کشتی میں کوئی ایسا شخص معلوم ہوتا ہے جو آقا کا نافرمان ہے اور اپنے مالک کا نافرمان غلام ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں کہ یہ خاص نوعیت کا طوفان ہے اور یہ جبھی آتا ہے جب کوئی عبد آبق بھاگا ہوا غلام آ جائے جس سے آقا راضی نہ ہو، تو اس نے کہا کہ جو ہو دیانۃً وہ اپنے کو ہمارے حوالے کر دے ہم اسے دریا میں ڈبو دیں گے ایک کی جان چلی جائے آسان ہے بنسبت اس کے کہ ایک کی وجہ سے ساری کشتی تباہ ہو جائے اور کئی آدمی ضائع ہوں تو ایک اپنے کو حوالے کر دے، اس کے بغیر یہ طوفان ٹلنے والا نہیں، میرا تجربہ یہ ہے۔ یونس علیہ السلام اٹھے اور کہا کہ میں وہ غلام ہوں جو آقا سے بھاگ گیا ہے اور نافرمانی کی ہے میں اپنے کو حوالے کرتا ہوں بھائی مجھے غرق کر دو تا کہ سب کشتی والوں کی جان بچ جائے وہ عبد آبق میں ہوں بھاگا ہوا غلام، لوگوں نے کہا کہ معاذ اللہ آپ ایسے نہیں ہو سکتے آپ کے چہرے پر بزرگی کے آثار ہیں اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں تو اضعاً کہہ رہے ہیں آپ جیسا نافرمان ہو گا تو پھر فرماں بردار کہاں رہے گا دنیا میں؟ آپ تو اضعاً کہہ رہے ہیں۔

کشتی میں قرعہ اندازی......ہم قرعہ ڈالتے ہیں پوری کشتی میں جو نکل آئے تو قرعہ ڈالا تو قرعہ میں جب دانہ اٹھایا تو نام یونس علیہ السلام کا نکلا، اب کشتی والے حیران ہوئے سمجھے کہ ہمارا قرعہ غلط ہو گیا، یونس علیہ السلام ایسی مقدس صورت والا آدمی عبد آبق بھاگا ہوا غلام کیسے ہو سکتا ہے، دوبارہ قرعہ ڈالا پھر انہی کا نام آیا، پھر یقین نہ آیا کشتی والوں کو، تیسری دفعہ پھر قرعہ ڈالا پھر انہی کا نام نکلا تب عاجز ہو کر بیٹھ گئے یونس علیہ السلام نے فرمایا: کہ میں

حقیقتاً اپنے مالک کا بھاگا ہوا غلام ہوں میں زیرِ عتاب ہوں۔

مچھلی کے پیٹ میں...... میں اپنی وجہ سے تمہاری جانیں ختم کرنا نہیں چاہتا میں اپنے کو حوالے کرتا ہوں، تم مجھے ڈبو دو، تاکہ کشتی والوں کی جان بچ جائے، مجبور ہو کر ڈبو دیا اور ڈال دیا دریا میں، ایک دم طوفان ہٹ گیا اور کشتی آگے روانہ ہوگئی، وہاں ایک مچھلی منہ کھولے ہوئے کھڑی تھی، ایک بڑی مچھلی وہ بھوکی تھی، اسے غذا کی ضرورت تھی، اس نے لپک کے یونس علیہ السلام کو پکڑا اور اپنے پیٹ میں لے لیا، حق تعالیٰ نے اس کے قلب میں القاء فرمایا کہ یہ ہمارے پیغمبر ہیں ان کو کوئی اذیت نہ پہنچے، ہم نے تیرے پیٹ کو جیل خانہ بنایا ہے ان کے لئے یہ غذا کے لئے اور غذا کے طور پر نہیں ڈال رہے تیرے پیٹ میں، بلکہ اس لئے ڈال رہے ہیں کہ کچھ سزا دینی ہے، بس پیٹ کو جیل خانہ بنایا ہے ان کو اسی میں رکھ، بیچاری نے بے چبائے نگل لیا اسے من جانب اللہ حکم تھا، اور اس کی ساخت اس وقت اللہ نے ایسی کردی کہ وہ جیل بن گئی، وہ انتڑیاں ونتڑیاں جو تھیں وہ فراخ ہوگئیں، اور یہ بہت بڑی مچھلی تھی باطمینان یونس علیہ السلام اس کے پیٹ میں گئے، اب بہرحال وہاں بند ہیں حق تعالیٰ نے سانس کا سامان سب کچھ کیا مگر نہ غذا، نہ روٹی۔

القاء دعاء...... چالیس دن گزر گئے مچھلی کے پیٹ میں اخیر میں حضرت یونس علیہ السلام کے قلب میں حق تعالیٰ نے وہ دعاء القاء فرمائی جو نجات کا ذریعہ بنی، وہ دعاء یہ تھی: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ① جسکو ہم آیت کریمہ کہتے ہیں یہ دعاء ہے یونس علیہ السلام کی، یہ پڑھی یونس علیہ السلام نے اس کی برکت سے اس مچھلی کو ایک امتلاء اور غثیان پیدا ہوا، جیسے متلی ہوتی ہے اور اس نے ایک کنارے پر آ کر قے کی تو یونس علیہ السلام باہر نکل آئے اور وہ روانہ ہوگئی۔

مچھلی کے پیٹ سے نجات، لباس اور غذا کا سامان...... یونس علیہ السلام چونکہ چالیس دن مچھلی کے پیٹ میں رہے ہو، ابھی بند تھی، غذا ابھی نہیں تھی، اس لئے کمزور بھی ہوگئے تھے اور بدن اتنا نرما گیا تھا کہ اگر چیونٹی بھی بیٹھتی تھی تو یوں معلوم ہوتا جیسے تیر لگا ہو، مکھی بھی بیٹھتی تو یہ معلوم ہوتا جیسے برچھا لگ گیا، بہت اذیت ہوتی تھی، حق تعالیٰ نے وہیں ایک کدو کی بیل لگائی چوڑے چوڑے پتے اتنے ان کے اردگرد پھیل گئے کہ وہ بمنزلہ لباس کے بن گئے، اور اس کے قریب نہ مکھی آتی تھی نہ مچھر آتا تھا اس نے مثل لباس کے پورے بدن کو ڈھانپ لیا تو بدن کی حفاظت حق تعالیٰ نے اس طرح سے فرمائی کہ یقطین کدو کی بیل اگادی، اب بھوک کی وجہ سے بے تاب تھے، چالیس دن کچھ بھی نہ ملا تھا، اور خود ہلنے کی سکت نہ تھی اور کچھ کرتے بھی تو وہ بیل کدو کی لپٹ گئی چاروں طرف سے حفاظت کے لئے حق تعالیٰ نے ایک ہرنی کے قلب میں القاء کیا، اس نے آ کر ان کے منہ کے قریب اس طرح اپنے تھن کئے کہ تھن منہ میں پہنچ گئے، چوسا تو دودھ آنا شروع ہوگیا، وہ روز آتی اور روز آ کر کے دودھ پلا جاتی، تو بیس پچیس دن جتنے اللہ کے علم میں ہیں وہ ہرنی دودھ پلا جاتی اور کدو کے پتے سے بدن بچا گیا۔ پچیس، تیس دن

---

① پارہ: ۱۷، سورۃ: الانبیاء، الآیۃ: ۸۷.

میں اب اس قابل ہو گئے کہ اٹھ سکیں اس وقت حق تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کے دعا کی کہ اے اللہ! بیشک مجھ سے غلطی ہوئی مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ وعدہ دوں چالیس دن کا، بغیر آپ کی منشا اور فرمان کے مجھ سے غلطی سرزد ہوئی آپ ہی معاف فرمانے والے ہیں اور بہت روئے اور استغفار کیا حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور معاف فرمایا۔

منصبِ رسالت کا اعزاز......اور اب تک نبوت تھی اب رسالت اور اصلاح کا عہدہ بھی دیا کہ تمہیں ہی مبعوث کیا جا رہا ہے اس قوم کی طرف کہ جس کی طرف تم گئے تھے اور تم جاؤ اس کی طرف، اب اطمینان سے انشراح کے ساتھ چلے تو ایک درخت کے نیچے جب پہنچے تو دیکھا کہ کچھ دیہاتی کھڑے ہیں ایک عورت کو لئے ہوئے، یونس علیہ السلام نے دیکھ کر پوچھا کہ بھائی یہ کون ہے تو دیہاتیوں نے کہا کہ یہ ایک عورت ہے جس کو شہزادہ لے گیا تھا پکڑ کے یہ کسی بزرگ کی بیوی تھی لیکن لے جاتے ہی جب اس نے بری نیت کا اظہار کیا تو وہ اس دن سے آج تک اتنا مریض ہے کہ چارپائی سے اٹھنے کے قابل نہیں پیٹ میں اس کے درد ہے، اس وجہ سے اس نے باحترام اس عورت کو رکھا اور اس کا احترام کیا عزت کی وہ اپنی عبادت میں لگی رہی۔

آثارِ رضا......اب وہ شہزادہ اس ٹوہ میں ہے کہ وہ بزرگ کہیں سے مل جائیں جن کی بیوی کو میں لے گیا تھا، میں ان سے دعا کراؤں گا، یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ بھائی یہ میری ہی بیوی ہے اور میں وہی شخص ہوں کہ جس کی بیوی کو لے گیا تھا انہوں نے کہا حضور وہ شہزادہ مر رہا ہے وہ تو آپ کی تلاش میں ہے، یونس علیہ السلام گئے اور اس کے لئے دعاء کی اس کو اللہ نے اچھا کیا تو بیوی مل گئی، اس کے بعد کشتی میں بیٹھے ایک کنارے پر پہنچے تو کچھ لوگ ایک بچے کو لئے ہوئے کھڑے ہیں، اور انہوں نے کہا کہ صاحب یہ ایک بچہ تھا جس کو ایک بھیڑیا لے گیا تھا، ہم نے بمشکل بھیڑیے کو مار مار کے بچے کو حاصل کیا، یہ زخمی ہو گیا تھا تو ہم نے علاج کیا دوا کی اب یہ بالکل تندرست ہے، یہ یوں کہتا ہے کہ میرا ایک بوڑھا باپ میرے ساتھ تھا، یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ باپ میں ہی ہوں یہ بچہ میرا ہے، بچہ حق تعالیٰ نے دے دیا کچھ آگے چلے تو چند دیہاتی اور ملے کہ جی یہ بچہ دریا میں بہتا ہوا جا رہا تھا موجوں میں، ہم نے اسے پکڑا، پکڑ کے اس کا پیٹ ویٹ صاف کیا، پانی نکالا یہ کسی لاوارث کا بچہ معلوم ہوتا ہے لاوارث ہے، فرمایا کہ نہیں یہ بچہ میرا ہے تو انہوں نے کہا کہ آپ کو مبارک ہو بچہ بھی مل گیا۔ اب اس کے بعد یونس علیہ السلام آگے بڑھے اور حق تعالیٰ کی رضا کے آثار آنا شروع ہوئے تو آزمائش بھی بہت ہوئی ہے کہ جب کوئی عہد دیتے ہیں تو پھر جانچ بھی خوب کی جاتی ہے، دوستی کو بھی پرکھا جاتا ہے جب جا کر فتوحات کا دروازہ کھلتا ہے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھو یہ سامنے گاؤں آ رہا ہے، فلاں کمہار ہے جو برتن پکاتا ہے، اس نے آج ہی اپنا آوا نکالا ہے، سینکڑوں قسم قسم کے برتن رکھے ہیں اس سے جا کے یوں کہو کہ لاٹھی لے کر سارے برتنوں کو پھوڑ دو یہ اس سے کہو، اگر وہ پھوڑ دے تب تو ٹھیک اور نہ پھوڑے تو جو جواب دے وہ آ کر ہماری جناب میں عرض کرو یونس علیہ السلام گئے اور وہ آوا کھول کر کے اس نے برتن نکالے، گھڑے اور مٹکے، طرح طرح کی صراحیاں پیالے ٹکا کر

رکھے ہوئے تھے، اسے امید بندھ گئی تھی کہ اب یہ بکیں گے تو گزر چلے گا، یونس علیہ السلام پہنچے کہ لاٹھی لے کر پھوڑ کیوں نہیں دیتے انہیں، اس نے کہا کہ تو دیوانہ ہے اتنی محنت سے میں نے بنائے چالیس دن تک آگ میں رہے پکا کے اب امیدیں برلانے کا وقت آیا تو کہتا ہے کہ پھوڑ دے، دنیا میں کہیں ایسا ہوا، واپس آئے نماز پڑھی سجدے میں عرض کیا یا اللہ یہ جواب دیا، فرمایا کہ ایک کمہار چالیس دن میں چند برتن بناتا ہے، اس کا دل اتنا اٹکا ہوا ہے کہ پھوڑنا گوارا نہیں تم نے جو ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کے حق میں چالیس دن کا وعدہ دے دیا کہ ہم عذاب نازل کر دیں تو کیا ہمیں تم نے یہ سمجھا تھا کہ بیکار بنایا ہے ہم نے اس مخلوق کو اور ہم اپنے ہاتھ سے پھوڑ دیں، جبکہ ہمارے علم میں تھا کہ ایمان لاسکتی ہے وہ قوم اور اس کے دل میں نرمی آنے والی ہے، ہم کیسے ڈیڑھ لاکھ کو ضائع کر دیں۔

پھر توبہ اور استغفار کی کہ بے شک اے اللہ مجھ سے غلطی ہوئی اس کے بعد آگے چلے تو ایک شہر میں گزرے تو بڑی بھاری بلڈنگ بنائی تھی کسی تاجر نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے بڑا عالیشان محل بنایا، کہا کہ اس سے جا کے یوں کہو کہ سارے محل کو کدال لے کر ڈھا دے، اور جو جواب دے وہ ہمیں آ کر کہنا تو جا کر اس تاجر سے کہا کہ کتنے میں بنایا تو اس نے کہا کہ اتنے لاکھ روپے لگے ہیں اتنے ہزار کا فرنیچر ہے، یہ سامان ہے، بولے: دیا سلائی لگا کر جلا کیوں نہیں دیتا اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا، کہا کہ تو پاگل آدمی ہے اتنے برسوں میں میں نے محل بنایا لاکھوں روپیہ خرچ کیا محنت کی مزدوری کر کے بنایا اور میں اپنے ہاتھ سے ضائع کر دوں، آ کر پھر نماز پڑھی اور کہا کہ یا اللہ یہ جواب دیا فرمایا کہ اینٹ گارے کا ایک محل ایک مالک اپنے ہاتھ سے برباد کرنا نہیں چاہتا اور ہم نے یہ اشرف المخلوقات ڈیڑھ لاکھ بنائی تم نے کیسے وعدہ دے دیا کہ ہم اپنے ہاتھ سے ضائع کر دیں پھر شرمندہ ہوئے پھر دعا پھر استغفار پھر توبہ کی۔

پھر ایک باغ سے گزر ہوا تو بڑا عالی شان ہرا بھرا، فرمایا اس کے مالک سے یوں کہو کہ ابھی دیا سلائی لگا کے سارے باغ کو پھونک دے جتنے مویشی ہیں سب ختم کر دے، اور جو وہ جواب دے ہمیں آ کر سناؤ پھر گئے اور مالک باغ کو جا کر کہا، اس نے کہا کہ تو دیوانہ ہے، برسہا برس محنت کرنے سے میرا باغ پلا درخت پھل دینے کے قابل ہوئے اور اب میں تیرے کہنے سے دیا سلائی دکھا دوں کوئی دیوانہ معلوم ہوتا ہے آ کر پھر نماز پڑھی اور کہا کہ یا اللہ یہ جواب دیا فرمایا کہ باغ والا تو چار تنکے ضائع نہیں کر سکتا، اور تم نے چالیس دن یہ دعا مانگی کہ میں ان ڈیڑھ لاکھ کو ضائع کر دوں جب کہ ان کے اندر استعداد تھی ایمان قبول کرنے کی وہ عذاب کے قابل بھی نہیں تھے، غرض پھر توبہ اور استغفار کی۔

اسی طرح جا رہے تھے ادھر سے وہ لوگ ملے موصل اور نینوا کے اور وہ دیکھ کر لپکے یونس علیہ السلام کی طرف تو پہلے تو ڈرے کہ مجھے قتل کرنے تو نہیں آ رہے اس لئے کہ میں نے وعدہ دیا تھا عذاب کا وہ تو آیا نہیں عذاب مجھے جھوٹا سمجھنے لگے مگر معلوم ہوا کہ وہ تو اعزاز و اکرام کے ساتھ، مروت کے ساتھ آ رہے ہیں، غرض انہوں نے آ کر یونس علیہ السلام کو پہچانا تعظیم و تکریم کی، کہا کہ آپ نے جو وعدہ دیا تھا تو چالیس دن کے اندر اندر عذاب کے آثار نمایاں

ہوگئے تھے، لیکن ہم نے توبہ کی استغفار کی اللہ نے وہ عذاب رفع کیا، اس دن سے آج تک آپ کی فکر میں ہیں کہ آپ کہاں ملیں آج آپ ملے تو پھر بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو وہ پورے اہتمام کے ساتھ استقبال کے لئے لے گیا اور ساری قوم نے ایمان قبول کیا، یونس بن متّی علیہ السلام کے ہاتھ پر اور یقین دلایا اطاعت کا حق تعالیٰ نے نبوت کے ساتھ منصب رسالت بخشا کہ اب اس قوم کی اصلاح کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقصودِ تمثیل ...... تو اس کو فرمایا جارہا ہے کہ: ﴿وَلَاتَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ اے پیغمبر! مچھلی والے کی طرح مت ہوجانا کہ انہوں نے غصہ میں آکر تین دن کے بعد عذاب کی دھمکی دی، اور ساتھ میں وعدہ دے دیا چالیس دن کی میعاد مقرر کردی، اور یہ سب غصہ ہوکر کہا جذبات میں آکر جس سے کتنے معتوب ہوئے، کتنی ان کی آزمائش ہوئی، کتنی تکلیفیں اٹھائیں لیکن وہ آزمائش میں پورے اترے پھر ہم نے انہیں رتبہ دیا، منصبِ رسالت سے نوازا مگر بہرحال ابتداً وہ جذبات دکھا گئے غصہ سے مغلوب ہوگئے بددعا کی، قوم کے لئے عذاب مانگا، آپ کو ہم نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے آپ بددعا کرنے والوں میں سے نہیں ہیں، اگر یہ نہیں مانتے باوجود یہ کہ جانتے ہیں کہ آپ خودغرض نہیں کوئی غرض متعلق نہیں، کوئی اجرت نہیں چاہتے، کمال اخلاص سے انہی کی خیرخواہی کے لئے آپ ہدایت فرمارہے ہیں، اور ساتھ ہی ان کے پاس کوئی حجت بھی نہیں تو ممکن تھا کہ آپ کی طبیعت میں ضیق پیدا ہو، مگر آپ کا مقام بہت بلند ہے، آپ قطعاً اس کی پرواہ نہ کریں آپ تو ہدایت کئے جائیں، اور مچھلی والے کی طرح غصہ میں آکر کبھی بددعا نہ کریں آپ کا رتبہ بہت بلند ہے۔

تو اپنے نبی کے دین کو تھاما دلائل کی رو سے بھی اصول کی رو سے بھی اور تاریخ کی وجہ سے بھی تاریخ کی رو سے واقعہ سنایا یونس بن متّی علیہ السلام کا اور دلائل کی رو سے دو چیزیں پیش کیں کہ سچی بات سے انکار کی وجہ دو ہوسکتی ہیں یا کہنے والے کی خودغرضی محسوس ہو یا اپنے پاس حجت ہو تو فرمایا کہ ان کے پاس کوئی حجت نہیں کہ ﴿اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ﴾ کیا آپ ان سے سوال کریں گے اجرت کا کہ اس میں یہ دبے جارہے ہیں کہ اجرت ادا نہ کرنی پڑے۔ ﴿اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ﴾ یا کوئی غیب سے خبر آگئی ہے ان کے پاس یا کوئی حجت آئی ہے جسے لکھ رکھا ہے اس لئے آپ کی بات نہیں مانتے، جب یہ بات (کھل گئی) تو محض ہٹ دھرمی اور عناد ہے اس میں ممکن ہے کہ آپ کے دل میں جوش اور جذبہ آجائے تو فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ اپنے رب کے حکم پر آپ جمے رہیے صبر کیجئے اور مچھلی والے کی طرح سے نہ ہوجائیے کہ غصہ میں آکر بددعا کردیں آپ کی شان بہت بالا ہے۔ ﴿اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ﴾ جبکہ انہوں نے نداء کی تھی کہ اے اللہ! عذاب بھیج دے اور غصہ میں وہ مغلوب ہوگئے تھے۔ جوش آرہا تھا قوم کے اوپر کہ یہ کم بخت مان نہیں رہے تھے۔ اور تین دن میں یا تین مہینے میں یا تین برس میں آپ ان کی باتیں ہٹ دھرمی میں سن سن کر (گھبرا گئے) گویا کہ آپ کی یہی شان تھی کہ دوسروں نے فرمائش کی غزوۂ احد کے موقع پہ کہ یارسول اللہ بددعاء

کیجئے فرمایا کہ: "اِنِّیْ بُعِثْتُ رَحْمَۃً وَّلَمْ اُبْعَثْ لَعَّانًا" ① میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں عذاب بنا کے نہیں بھیجا گیا، بد دعائیں کرنے والا بنا کے نہیں بھیجا گیا۔

آگے فرمایا: ﴿لَوْ لَآ اَنْ تَدٰرَکَهٗ نِعْمَۃٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ﴾ اگر اللہ کی نعمت اور اس کا لطف وکرم تدارک نہ کرتا یونس علیہ السلام پر تو وہ ضائع ہو چکے ہوتے مچھلی کے پیٹ میں یا ریگستان میں یا دریا میں سینکڑوں آفتیں آئیں ہمارے ہی لطف وکرم نے تو نکالا مصیبتوں سے تو تدارک کیا اگر حق تعالیٰ تدارک نہ فرماتے تو غضب میں مغلوب ہو کر وہ اپنے کو ضائع کر چکے ہوتے مگر ہم نے تھام لیا، ادھر ان کی بات قوم میں بھی رکھی کہ عذاب کے آثار بھی نمایاں کر دیئے کہ اس کے دل میں جو سچائی رہی اور انجام کتنا ہم نے بہتر کیا ﴿فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ پھر اللہ نے انہیں منتخب کیا اور صالحین میں سے بنایا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گویا تسلی دی گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو ثبات واستقلال دینے کے لئے اصول اور تاریخ دونوں چیزیں پیش کر دی گئیں۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ علم نافع عمل صالح اخلاق فاضلہ اور انجام صحیح عطا فرمائے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

---

① الصحیح لمسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب النهی عن لعن الدواب وغیرها ج: ۱۲ ص: ۴۹۴ رقم: ۴۷۰۴.

مقاصد شریعت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ صدق الله العظيم ①

تمہید...... بزرگانِ محترم! یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہے اس وقت مجھے اس آیت کی تفسیر کرنا یا اس آیت کے مضامین پر گفتگو کرنا مقصود نہیں بلکہ اس آیت سے تین مقاصد مستنبط کرنے ہیں جو دین کے مقاصد ہیں انہیں کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے، یہ مقاصد الگ الگ بھی آیات میں بیان کئے گئے ہیں اور واضح طریقے پر بیان کئے گئے ہیں، لیکن عربیّت کا ایک قاعدہ ہے: الکنایة ابلغ من التصریح جو چیز کنایہ یا اشارہ سے ادا ہوتی ہے بہ نسبت صراحت وہ زیادہ بلیغ ہوتی ہے، اس واسطے خیال ہوا کہ ان تینوں مقاصد کو اس آیت کی روشنی میں عرض کیا جائے اور ساتھ ہی اس بناء پر کہ ان تینوں مقاصد کی طرف اس آیت میں اشارہ بھی ہو رہا ہے اس طرح ایک جگہ مجتمع ہو کر وہ تینوں مقاصد آجاتے ہیں، تو بجائے تین آیتیں الگ الگ پڑھنے کے اسی ایک آیت کی تلاوت کو کافی سمجھا گیا کہ وہ تینوں مقصد اس آیت میں آجائیں گے۔

تعیینِ مقاصد...... وہ شریعت کے تین مقاصد کیا ہیں! تو اصل یہ ہے کہ شریعت اسلام تین تعلقات کو درست کرنے کے لئے آئی ہے، وہ تین تعلقات اگر درست ہو جائیں تو وہی آدمی شریعت کی اتباع میں کامل سمجھا جائے گا، ایک تعلق میں بھی اگر کمی رہ گئی تو اتنا ہی اس کے دین میں اور اس کے اسلام میں کمی رہ جائے گی تو وہ تین تعلقات جن کی تکمیل کے لئے جن کی اصلاح کے لئے شریعتِ اسلام دنیا میں بھیجی گئی، کیا ہیں؟

---

① پارہ: ۱، سورة: البقرة، الآية: ۲۱، ۲۲.

ایک تعلق مع اللہ کہ بندہ کا اپنے خدا سے کیا تعلق ہے؟ اس کی کیا نوعیت ہے، دوسرا تعلق مع الخلق کہ بندوں کا اپنے بھائیوں سے اور مخلوق سے کیا تعلق ہے، تیسرا تعلق مع النفس کہ خود اپنے نفس سے اس کا کیا تعلق ہے؟

یہ تین تعلقات ہیں جن کو صحیح کرنا مقصود ہے اور اسی پر شریعت کے تمام احکام پھیلے ہوئے ہیں، بندہ خدا تعالیٰ سے کس طرح سے رابطہ پیدا کرے، بندہ بندوں سے کس طرح معاملہ کرے؟ اور بندے کو اپنے نفس سے کیا معاملہ کرنا چاہئے، اگر یہ تین معاملے درست ہو گئے تو وہ کامل انسان سمجھا جاتا ہے، ان میں اگر خلل رہ گیا تو اُتنا ہی خلل اس کے دین و دیانت میں رہ جائے گا اور کہا جائیگا کہ مسلمان ہے مگر ناقص مسلمان، اس لئے کہ تینوں تعلقات اس کے صحیح ہونے چاہئیں تھے۔

تعلق مع اللہ کی بنیاد "عبدیت" ...... تعلق مع اللہ کی بنیاد عبدیت پر ہے کہ بندہ اپنی عبدیت کو پہچان لے اور اللہ کی معبودیت کو پہچان لے، یہ نسبت درست ہو جائے کہ وہ معبود ہے، میں عابد اور عبدیت کی شان اس میں آجائے، اس وقت کہا جائے گا کہ اللہ سے تعلق صحیح ہو گیا، عبدیت ہو یعنی جتنی بھی بڑائی اور عظمت ہے وہ اللہ کے لئے مخصوص سمجھے۔ ﴿وله الكبرياء في السموات والارض وهو العزيز الحكيم﴾ ساری بڑائیاں آسمانوں میں اور زمینوں میں اللہ ہی کے لئے ہیں، وہی ہے عزیز و حکیم، عزت والا بھی وہی ہے حکمت والا بھی وہی ہے، تو عزت کا کوئی شائبہ بمقابلہ حق اپنے اندر نہ ہونا چاہئے، بلکہ عزت کے مقابلہ میں پوری ذلت اپنے نفس کی ہونی چاہئے اور کمالِ عزت حق تعالیٰ کی ذہن میں ہو، تب وہ نسبتِ عبدیت درست ہوگی، اگر کبر ذرا سا بھی باقی رہ گیا تو نسبت عبدیت میں فرق آجائے گا۔

اسی واسطے حدیث میں ارشاد ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ: "لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ" ① جنت میں وہ داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی تکبر باقی رہ گیا ہے۔ اس لئے کہ اس نے حق تعالیٰ کی کبریائی کو نہیں سمجھا اور جب اس کی کبریائی اور عظمت کو نہ جانا تو اپنی ذلت کو نہ سمجھا اور اپنے اندر تکبر کیا تو کبریائی اور عظمت یہ ذات بابرکات کے ساتھ مخصوص ہے، دنیا میں بندہ بندگی کرنے کے لئے آیا ہے خدائی کرنے کے لئے نہیں آیا، تو اس کی چال میں ڈھال میں قال میں، حال میں ہر چیز میں عبدیت ہونی چاہئے، جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ ② چال میں اپنی میانہ روی اور نرمی پیدا کرو، اکڑ کر چلو گے تو چال میں کبر آجائے گا جو بندگی کی شان کے خلاف ہے، یعنی ایسی چال سے چلو جس میں تواضع بھی ہو، کبر نہ ہو اور ساتھ میں ضعف بھی نہ ہو، یعنی نہ تو بیماروں کی چال چلو، کہ آدمی بالکل جھک کے چلے جیسے معلوم ہو کہ مریض ہے یہ بھی چال پسند نہیں کی گئی، حدیث

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب تحريم الكبر وبيانه ج: ١ ص: ٢٤٧ رقم: ١٣١ . ② سورة لقمان: ١٩ .

میں فرمایا گیا: ''اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَّاَحَبُّ اِلَى اللهِ مِنَ الضَّعِيْفِ'' ① قوی مسلمان بہتر ہے ضعیف مسلمان سے، تو چال میں قوت ہونی چاہئے، ضعف نہ ہونا چاہئے، تو نہ تو اس طرح سے چلے، جیسے کوئی بیمار اور مَرْ یَل قسم کا آدمی آرہا ہو اور نہ اکڑ کر چلے کہ جس سے معلوم ہو کہ کوئی متکبر آرہا ہے، تو چال کے اندر فرمایا کہ قصد واقتصاد اور میانہ روی اختیار کرو کہ چال میں کبر بھی نہ ہو چال میں ضعف بھی نہ ہو۔

آثارِ عبدیت...... حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان فرمائی گئی کہ ''كَانَ يَمْشِيْ تَقَلُّعًا'' آپ زمین پر اس طرح قوت سے چلتے تھے جیسے زمین کو کھود ڈالیں گے۔ اس قوت سے پیر پڑتا تھا، اور ساتھ میں تواضع اور انتہائی خاکستاری اور نرمی بھی چال میں ہوتی تھی، تو قوت بھی ملی ہوئی ہو اور قوت کے ساتھ تواضع بھی ملی ہوئی ہو، قوت میں اگر کبر آ گیا تو تکبر کی چال ہے اور اگر کمزوری آ گئی تو ضعیفوں کی چال ہے اور دونوں چالوں سے روکا گیا۔ ﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ﴾ ② تو چال کے اندر بھی میانہ روی بتلائی گئی۔ اسی طرح سے قال کے اندر، بولے آدمی تو تحکمانہ لب ولہجہ نہ ہو، جیسے کوئی حاکم بول رہا ہے، بلکہ مصالحانہ رویہ برادرانہ رویہ، بھائی بندی اور ملنساری کی آواز نکلنی چاہئے، اس میں حاکمانہ، متکبرانہ شان نہ ہونی چاہئے تو جیسے حال میں تکبر برا سمجھا گیا ہے قال میں اور بولنے میں بھی تکبر برا سمجھا گیا ہے، اسی طرح سے آدمی کے حال میں اور تمام چیزوں میں کبر نہ ہونا چاہئے، تبھی آدمی کی بندگی صحیح ہوگی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ...... یہاں ایک طالب علمانہ شبہ ممکن ہے کسی کو پیدا ہوا کہ قرآن کریم سے اور احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی صفات اختیار کرو اور اس کے کمالات کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کرو، چنانچہ فرمایا گیا: ''تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللهِ'' اللہ کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو رحمت اور کرم دوسرے کے اوپر عطا اور جود واحسان اور علم یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی صفات ہیں، یہ اپنے اندر پیدا کرو، اسی طرح اللہ کی صفت تکبر بھی ہے، قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ تو یہ تکبر بھی اختیار کرنا چاہئے اس لئے کہ جب اللہ کے اخلاق اختیار کرو گے رحم اور کرم اور کریمی تو پھر متکبر بننے میں کیا حرج ہے، بلکہ متکبر بننا چاہئے تو یہاں جو فرمایا جارہا ہے کہ تکبرہ ذرہ برابر ہوگا تو وہ شخص جنتی نہیں، اور یہاں ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی متکبر بنے، تکبر اللہ کی شان ہے بڑا بول بولنا اس ہی کا مقام ہے تو ہم بھی خوب بڑے بول بولیں اور خوب تحکمانہ کلام کیا کریں، اس حدیث کی رو سے یہ ایک شبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تکبر بری چیز نہیں ہے، تکبر تو اعلیٰ ترین صفت ہے، جو اللہ کی شان ہے، کون تکبر کو برا کہہ سکتا ہے،؟ پھر تکبر سے کیوں روکا گیا ہے؟ اس لئے نہیں روکا گیا کہ تکبر بری چیز ہے، تکبر بہترین چیز ہے مگر

---

① الصحیح لمسلم، کتاب القدر، باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز والاستعانۃ باللہ ج:۱۳ ص:۱۴۲ رقم:۴۸۱۶. ② پارہ: ۲۱، سورۃ: لقمان، الآیۃ: ۱۹.

جھوٹ بولنا بری چیز ہے، جھوٹ سے روکا گیا ہے اس لئے کہ اللہ کے سوا جو یوں کہے گا کہ میں بڑا ہوں وہ جھوٹا ہے، سچا اللہ ہی ہے جو کہے کہ میں بڑا ہوں، مجھ سے بڑا کوئی نہیں، جو انسان یہ کہے گا کہ میں بڑا ہوں وہ جھوٹ بول رہا ہے تو جھوٹ بولنا بری بات ہے، تکبر کرنا تو بری بات نہیں خدا کے سوا جو متکبر بنے گا جھوٹا ہوگا۔

تو جھوٹ بولنا انسان کی شان کے خلاف ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ تکبر مت اختیار کرو، جھوٹے مت بنو، تکبر اسی کے لئے زیبا ہے، اور بڑائی اسی کے واسطے ہے۔ ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ①

تو عبدیت اختیار کرو، اب ہر چیز میں عبدیت آئے گی، جب دل میں ایک چیز بیٹھ گئی تو دل تو سلطان الاعضاء ہے، تو تمام اعضاء کا بادشاہ ہے تو ساری رعایا اسی کی پیروی کرے گی، جب دل میں تواضع، انکساری اور خاکساری بیٹھ گئی تو انکساری پیروں میں بھی آئے گی، ہاتھ میں بھی آئے گی، زبان میں بھی آئے گی، ہر چیز میں وہی کسر وانکسار تواضع وخاکساری پیدا ہو جائے گی، صحت میں بھی انکساری، بیماری میں بھی انکساری۔

عبدیت کے رنگ ...... مجھے واقعہ یاد آیا، میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عادت یہ تھی کہ تھوڑا بھی بیمار ہوں تو بہت زیادہ کھولتے کراہتے اور ہائے ہائے کرتے جیسے کوئی بڑی چیز آ گئی، مکان کو سر پر اٹھا لیا، چھوٹی سی بیماری بالکل معمولی اور ہائے ہائے زیادہ تو میں نے ایک دن ڈرتے ڈرتے ان سے عرض کیا، رُعب ان کا غالب تھا کہ آپ جو یوں زیادہ ہائے ہائے کرتے ہیں، یہ تو رضا اور توکل کے خلاف ہے بندہ ہو کر ذرا سی بیماری آئی اور زیادہ کھولنا اور کراہنا یہ تو رضا کے خلاف ہے بندہ پر جو کیفیت آئے اسے راضی ہونا چاہیئے، زیادہ ہائے ہائے کرنے کا کیا مطلب؟ جیسے بیماری ٹالنا چاہتے ہیں، یہ تو رضا کے خلاف ہے توکل کے خلاف ہے، ہنس کے فرمایا کہ نالائق! ہمیں نصیحت کرنے کے لئے آیا ہے اور اس کے بعد فرمایا بیٹھ جا میں بیٹھ گیا۔ فرمایا میں نے اپنے تین بزرگوں کی زیارت کی ہے اور زیارت ہی نہیں کی بلکہ ان کو برتا ہے اور ان کی پوری زندگی پائی ہے۔ سب سے پہلے اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ ان سے خلافت بھی حاصل کی تھی، فرمایا میں نے ان کی زندگی دیکھی ہی نہیں بلکہ برتی ہے اور ان کی صحبت اٹھائی ہے۔ دوسرے فرمایا حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وہ میرے استاذِ حدیث ہیں، تو ان کی خدمت میں بھی حاضر رہا ہوں۔ اور تیسرے فرمایا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، وہ تو میرے والد ہیں، ان کی زندگی بھی میں نے دیکھی اور ان کی صحبت اٹھائی، ان تینوں بزرگوں کے میں نے تین رنگ پائے۔ فرمایا حاجی صاحبؒ پیر و مرشد کا تو یہ عالم تھا کہ ذرا سی بیماری آتی تو ہائے ہائے کرتے مکان کو سر پر اٹھا لیتے۔ ایک صاحب نے عرض کیا حضرت! یہ تو بندگی، رضا اور توکل کے خلاف ہے، ذرا سی بیماری آئی اور ہائے ہائے شروع کی۔ فرمایا کیا میں اپنے اللہ کے مقابلے میں بہادر بنوں اور یہ دعویٰ کروں زبانِ حال سے کہ آپ جو کچھ بھیجیں گے میرے اندر طاقت ہے میں اُسے برداشت کروں گا، میں

① پارہ: ۲۵، سورۃ: الجاثیۃ، الآیۃ: ۳۷۔

تھوڑی سی بیماری میں ہائے ہائے کر کے عرض کر دیتا ہوں کہ میں اتنا کمزور ہوں مجھے آزمائیے نہیں، فضل سے بخش دیجئے، میں تو اس قابل بھی نہیں ہوں کہ بخار کا تحمل کروں، بندہ ہوں اور ضعیف ہوں تو میں ہائے ہائے کر کے اپنے ضعف کو ظاہر کر دیتا ہوں، اپنے عجز کو ظاہر کرتا ہوں، فرمایا یہی ہے عبدیت اور بندگی کی شان کہ اپنا عجز اور اپنی بے طاقتی، عاجزی ہر طرح سے ظاہر کر دو۔

فرمایا حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہائے وائے تو نہیں کرتے تھے مگر علاج کا اہتمام (بہت کرتے تھے) ذرا بیماری آئی طبیب کو بلاؤ اور ڈاکٹر کو بلاؤ اور دوا دارو اور پرہیز، تو بعض نے عرض کیا حضرت اسباب میں اتنا غلو کرنا تو بندگی کے خلاف ہے، اس کے معنی ہیں کہ مسبب الاسباب پہ نظر نہیں، بس دواؤں پہ نظر ہے ڈاکٹر پہ نظر ہے، علاج پہ نظر ہے۔

فرمایا علاج کرنا مسنون ہے اور اتباع سنت ہی سب سے بڑی عبدیت ہے، ان کے یہاں بھی عبدیت تھی، مگر عبدیت کا یہ روپ تھا ہر چیز میں سنت کی پیروی کی جائے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ ہم کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی علاج فرمایا، تو علاج مطلوب ہو گیا تو سنت کی پیروی کرنی ضروری ہے۔ تو صحت کی سنتیں اور ہیں بیماری کی سنتیں اور ہیں، بیماری میں یہی سنت ہے آدمی معالجہ کی طرف متوجہ ہو اپنی حیثیت کے مطابق کوئی بڑا آدمی ہے وہ علاج کرانے بھی جرمنی جائے گا اور چھوٹا ہے وہ مقامی ڈاکٹر کو دکھلا دے۔

مگر بہر حال علاج کی طرف توجہ کرنا یہ سنت کی پیروی ہے اس لئے کہ یہ ہمارا بدن یہ سرکاری ملک ہے اور اللہ کی ملک ہے، ہم اس کے امین بنائے گئے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کریں، بیمار ہوں تو دوا کریں، ایسے موقعوں پر نہ جائیں جہاں ہلاکت یقینی ہو، یہ سواری ضائع نہ ہو جائے۔ اسی سواری پر سوار ہو کر روح مقامات طے کرتی ہے اور عرشِ عظیم تک پہنچتی ہے، جب سواری نکمی ہو جائے گی تو سفر کیسے طے ہو گا؟

اس واسطے اس کو گھاس دانہ بھی دینا چاہئے، اسے غذا بھی دینی چاہئے یہ بیمار ہو تو اس کا علاج بھی کرنا چاہئے، تو فرمایا بیماری میں علاج کرنا سنت کی پیروی ہے اور سنت کی پیروی کی یہی عبدیت ہے اسی کو بندگی کہتے ہیں تو حضرت (حاجی صاحبؒ) کے یہاں بھی بندگی تھی اور ان کے یہاں بھی عبدیت تھی اس کا روپ اور تھا اِس کا رنگ اور۔ فرمایا میرے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی کیفیت یہ تھی، بڑی سے بڑی بیماری آ جائے تو اُف نہیں کہتے تھے، کسی پہ ظاہر نہیں ہوتا تھا بیمار ہیں، مہینوں، برسوں کے بعد اتفاق سے زبان سے نکل گیا تو پتہ چلتا تھا کہ اتنی بڑی بیماری آئی ہے، اور بالکل دم بخود لوگوں نے عرض کیا حضرت بیماری آئی ہے آپ کسی سے فرماتے بھی نہیں، کچھ ظاہر بھی نہیں کرتے کہ کوئی دوا دارو یا علاج کرتے فرمایا:

''ہر چیز از دوست می رسد نیکوست''

مالک کی طرف سے جو آئے گردن جھکانی چاہئے تو وہی میرے لئے خیر ہے وہی میرے لئے برکت

ہے، اگر وہ بیماری دے تو میں کون ہوں یہ کہنے والا کہ مجھے تندرست ہونا چاہئے، اور اگر وہ تندرستی دے تو میں کون ہوں یہ کہنے والا کہ مجھے بیمار ہونا چاہئے۔

''ہر چیز از دوست می رسد نیکوست''

دوست اور محبوب کی طرف سے جو آئے سر جھکا دینا چاہئے۔ فرمایا یہی عبدیت ہے اور یہی بندگی کی شان ہے کہ دوست کی ہر منشاء کے اوپر آدمی راضی برضا ہو جائے۔

عبدیت کا تقاضا...... جیسے حدیث میں ارشاد ہے کہ ''عَجَبًا لِّاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءٌ شَكَرَ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءٌ صَبَرَ'' ① مؤمن کی کوئی کل بری نہیں، ایمان کے ساتھ کوئی حالت بری نہیں اگر بیماری آتی ہے تو صبر کرتا ہے، صبر کے راستے سے اللہ تک پہنچ جاتا ہے اور اگر نعمت آتی ہے تو شکر کرتا ہے اور شکر کے راستے سے اللہ تک پہنچ جاتا ہے، تو بیماری بھی اس کے لئے خیر ہے اور تندرستی بھی اس کے لئے خیر ہے، تندرستی کے اور لوازم ہیں، بیماری کے اور لوازم ہیں سب پر ایمان کا قانون لاگو ہے، اسی راستے سے آدمی اللہ تک جا پہنچتا ہے۔ تو فرمایا حق تعالیٰ شانہ جو بھی کیفیت بھیجیں نعمت کی ہو یا مصیبت کی، تنگی کی ہو یا راحت کی، تموّل کی ہو یا تنگ دستی اور محتاجگی کی، جس حالت میں ہو بندہ راضی اور شاکر رہے کہ میرے لئے یہی خیر ہے جو میرے مالک نے تجویز کیا ہے میں کون ہوں اس کے خلاف کرنے والا یا خلاف بولنے والا! کسی بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ وہ اسی مقام کے تھے یعنی راضی برضا کے مقام کے، کہا کیا حال پوچھتے ہو اس شخص کا جس کی مرضی پر دو جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ اس درجہ کے ہیں کہ آپ کی مرضی پر زمین و آسمان کے سارے کارخانے جاری ہیں؟ کہا الحمد للہ میں اسی درجہ کا ہوں۔ کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہا، یہ اس طرح سے ہو سکتا ہے کہ دونوں جہاں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں، اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فناء کر دیا ہے، جو اس کی مرضی وہ میری مرضی، اس لئے جو بھی عالم میں پیش آتا ہے میں اس پر راضی ہوں کہ ٹھیک ہے، کوئی پیدا ہوتا ہے میں کہتا ہوں الحمد للہ یہی ہونا چاہئے تھا کوئی مرتا ہے میں کہتا ہوں الحمد للہ یہی ہونا چاہیئے تھا، مجھے کیا حق ہے کہ بیٹھ کر ماتم کروں اور بیٹھ کر واویلا کروں، اس کے معنی ہیں کہ اللہ کے حکم میں میں مداخلت کر رہا ہوں اور مین میخ نکال رہا ہوں کہ آپ نے کیوں موت بھیج دی فلاں کے لئے، تو کیا میں اس لئے آیا ہوں کہ اللہ سے لڑوں اور مقابلہ کروں؟ وہ موت دے دے میں کہتا ہوں الحمد للہ یہی مناسب وہ زندگی دے میں کہتا ہوں الحمد للہ یہی مناسب ہے وہ بیماری دے، میں کہتا ہوں بے شک یہی مناسب ہے، اس لئے جہاں میں کوئی چیز بھی میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتی، یہ سب میری مرضی پر چل رہے ہیں۔

عبدیت کا اعلیٰ مقام ''تفویض''...... تو حقیقت میں رضا بہ قضاء کے یہی معنی ہیں کہ اس مقام پر آ جائے کہ جو

① الصحیح لمسلم، کتاب الزھد والرقائق، باب المؤمن امرہ کلہ خیر ج: ۱۴ ص: ۲۸۰ رقم: ۵۳۱۸۔

بھی ہو آدمی اس پر راضی ہو، اور ظاہر ہے کہ جب اس مقام پر آ جائے گا تشویشات ساری ختم ہو جائیں گی، یہ جو تشویش اور الجھن پیدا ہوتی ہے، یہ اپنی تجویز سے پیدا ہوتی ہے ہم نے یہ تجویز کر لیا کہ ہمیں مالدار بننا چاہئے، اب اگر مالدار نہ بنے یا مال چھن گیا تو اب بیٹھ کے رو رہے ہیں۔

یہ کیوں رو رہے ہیں؟ پریشانی کیوں ہوئی کہ خود ہم نے تجویز کیا تھا کہ مالدار ہونا چاہیئے یا بننا چاہیئے، بیماری آئی تو پریشانی میں گھٹ رہے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ تجویز یہ تھی کہ ہونا چاہئے ہمیں تندرست تو کیوں بیمار بنے۔

ان ساری مصیبتوں کی جڑ اپنی تجویز ہے، لیکن اگر تفویض ہو جائے کہ میں نے اپنے آپ کو سونپ دیا اللہ کے جو بھی کیفیت پیش آئے وہ خیر ہے، اب ظاہر ہے کہ نفس کے خلاف کوئی چیز ہو گی نہیں تشویش اسی کو کہتے ہیں کہ طبیعت کے خلاف ہو، جب ہر چیز کو طبیعت کے موافق بنا لے تو اب پریشانی باقی نہیں رہے گی، تو تشویشات بھی ختم، ساری پراگندگیاں بھی ختم، پریشانیاں بھی ختم، تو اہل اللہ درحقیقت تفویض کے مقام پر ہوتے ہیں، اس لئے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی، کسی حالت میں ہوں مطمئن اور مگن اور اہل دنیا جو خود مجوِّز ہیں اپنے لئے کہ ہمیں یوں ہونا چاہیئے وہ ہر وقت پریشان رہیں گے، اس لئے کہ نفس کا ہر منصوبہ پورا ہونا ضروری نہیں اور جب کسی تجویز کے خلاف ہوگا تو روئیں گے بیٹھ کے بھکیں گے، تو ہر وقت پریشانی میں اس لئے اعلیٰ ترین مقام کہ جس میں سکونِ کامل ہو، پریشانی رفع ہو، وہ یہ نہیں ہے کہ آدمی دنیا کو بدلنے کی کوشش کرے، اپنے کو بدل دے جو پیش آئے کہے یہی میرے حال کے مناسب تھا۔

اسی پر راضی ہو جائے تشویش ختم ہو جائے گی، ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دنیاداری بہترین چیز ہے اور اسی میں سکون ہے، یا سمجھتے ہیں کہ مصیبت سب سے بڑی چیز ہے یا نعمت سب سے بڑی چیز ہے، حالانکہ بیماری ہو یا تندرستی، مالداری ہو یا دست نگری وہی سکون کا ذریعہ ہے تو اللہ کی تجویزوں پر، اس کی تقدیرات پر راضی ہو جانا یہ سکون کا ذریعہ ہے۔ ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ① اللہ کے ذکر ہی سے دل چین پاتے ہیں۔ تو ذکر کا فقط یہ مطلب نہیں کہ مسجد میں بیٹھ کر اللہ، اللہ کر لے، ذکر اور یادداشت کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی من جانب اللہ پیش آئے اس پر رضا کا اظہار کرے، بیمار ہے تب راضی، تندرست ہے جب راضی، مالدار ہے جب راضی، اور نادار ہے تب راضی۔

موسیٰ علیہ السلام اور افلاطون کا واقعہ...... یہ معنی ہیں ملکہ یادداشت کے کہ ہر تقدیر پر آدمی راضی ہو جائے، مجھے اس پر افلاطون کا ایک واقعہ یاد آ گیا، ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ افلاطون یونان کے حکماء میں سے ایک حکیم اور فلسفی ہے، لیکن شیخ عبدالحکیم بہت بڑے عالم اور بہت بڑے محقق گزرے ہیں، انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے "اَلْاِنْسَانُ الْكَامِلُ" کہ انسانِ کامل کسے کہتے ہیں، اس میں اصول و قواعد شرعی بیان کئے ہیں۔

اس میں لکھتے ہیں کہ میں افلاطون کی قبر پر گیا تو انوار و برکات سے میں نے اس کی قبر کو ڈھکا ہوا پایا، اس سے

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ: الرعد، الآیۃ: ۲۸.

ہم یہ سمجھے کہ یہ مقبولانِ الٰہی میں سے تھا محض فلسفی اور بندگان عقل میں سے نہیں تھا جیسا کہ شہرت ہے بلکہ مقبول خدا وندی شخص ہے محض فلسفی اور بندگان عقل میں سے نہیں انہوں نے لکھا ہے یا کسی دوسرے نے یہ یاد نہیں رہا بس اتنا ضرور لکھا ہے کہ افلاطون مقبولان الٰہی میں سے ہے، افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے، تعارف نہیں تھا، ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں تھے نام سنا تھا، افلاطون بھی جانتا تھا کہ ایک اسرائیلی اولوالعزم پیغمبر ہیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی جانتے تھے کہ افلاطون ایک شخصیت ہے، لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا تھا، کبھی تعارف نہیں ہوا تھا، اتفاق سے ایک سڑک پر آمنا سامنا ہوا، پہچان تو تھی نہیں، لیکن افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام کے چہرے پر انوار و برکات اور جلالتِ نبوت کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ یہ کوئی بہت بڑی شخصیت ہیں اور کوئی بہت بڑے عالم اور عارف باللہ ہیں ۔

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

وہ جو قلب کے اندر اشراق اور چمک ہوتی ہے، اس کے اثرات چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں تو چہرہ چغلی کھالیتا ہے کہ اندر کیا کیفیت موجود ہیں، تو موسیٰ علیہ السلام کے چہرۂ مبارک پر جلال اور جمالِ نبوت چمک رہا تھا، تو اس نے سمجھا کہ کوئی بڑی عظیم شخصیت ہیں، آ کے مصافحہ کیا اور یہ کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کوئی بہت بڑے حکیم ہیں اور کوئی بہت بڑے عالم ربانی اور عارف باللہ ہیں، ایک میرا سوال ہے جس کو اب تک کوئی حل نہیں کرسکا، بڑے بڑے عقلاء کے سامنے پیش کیا مگر کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا، گمان یہ ہے کہ آپ وہ سوال حل کردیں گے، آپ کا چہرہ بتلا رہا ہے کہ نورانیت آپ کے قلب میں ہے۔

فرمایا: کیا سوال ہے؟ کہا، سوال یہ ہے کہ ''اگر آسمان کو کمان فرض کرلیا جائے اور جو یہ مصیبتیں برس رہی ہیں انہیں تیر فرض کیا جائے اور اللہ میاں کو تیر چلانے والا فرض کیا جائے اور صورت ایسی بنے کہ اللہ میاں آسمان کی کمان سے مصیبتوں کے تیر برسا رہے ہیں تو بچاؤ کی کیا صورت ہے؟

''ظاہر بات ہے کہ بچاؤ کی صورت عقل میں نہیں آتی اس لئے کہ اس زمین کو چھوڑ کر آدمی کہیں نہیں جاسکتا اور اگر فرض کیجئے: چلا بھی جائے تو یہ جو آسمان کا گھیرا پڑا ہوا ہے اس کے دائرے سے نکل کر باہر نہیں جاسکتا اور مان لو کہ اس سے بھی نکل جائے تو اللہ میاں جب تیر مارنا چاہیں تو ان کی گرفت سے نکل کر کہاں جائے گا، وہ تو زمینوں اور آسمانوں سے ماوراء بھی ان کی حکومت ہے، تو عقل اس کو سمجھتی نہیں۔''

عقل یہی کہے گی کہ کوئی صورت بچنے کی نہیں، اسی واسطے کوئی عالم جواب نہیں دے سکا کہ زمین چھوڑ کر جانا مشکل کُروں کے محاذات سے نکلنا مشکل، آسمان کے نیچے سے نکل جانا مشکل اور مالک الملک کی گرفت سے نکلنا مشکل اور ناممکن، تو کوئی صورت بچاؤ کی نہیں، جب مصیبتوں کے تیر برسیں گے تو وہ بھگتنا پڑیں گے، مصیبت اٹھانی ہی پڑے گی، تو یہ سوال کیا جو واقعی مشکل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بہت آسان بات ہے، اس میں کوئی اشکال ہی نہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا، معمولی بات ہے اب یہ بھی متوجہ ہوا کہ جس کو کوئی حل نہیں کرسکا یہ کہہ رہے ہیں معمولی بات ہے، فرمایا کہ بچاؤ کی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ تیر مارنے والا جب تیر مارنے کا ارادہ کرے اس کی محاذات سے ہٹ کر اس کے پہلو میں آ کھڑا ہو تو تیر لگے گا ہی نہیں، بس یہ اس کا طریقہ ہے کہ تیر پھینکنے والے کے بغل میں آجائے گا، وہ کتنی زور سے تیر مارے گا، تیر نہیں لگے گا، کوئی اثر نہیں ہوگا۔

اس نے ہاتھ چومے، کہا معلوم ہوتا ہے آپ پیغمبر ہیں، اس کو صاحب معرفت کے سوا دوسرا نہیں بتا سکتا تھا، محض عالم کا کام نہیں ہے کہ اس کا جواب دے یہ تو عاشق کا کام ہے، عارف باللہ کا کام ہے جو اپنے دل میں معرفت رکھتا ہو۔

عبدیت ہی عشق و معرفت کی راہیں دکھلاتی ہے...... اس لئے کہ عشق جو راہیں کھولتا ہے علم نہیں کھول سکتا اور وہ راہیں، وہ کہتا ہے ناں ایک شاعر کہ ؎

عقل گوید شش جہت راہے، حدے بیش نیست

عقل کہتی ہے کہ چھ ہی جہتیں ہیں، اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، سامنے پیچھے، اور کوئی جہت نہیں، تو

عقل گوید شش جہت راہے حد بیش نیست

اس کے سوا کوئی جہت نہیں

عشق گوید ہست راہے بارہا من رفتہ ام

عشق نے کہا کہ نہیں اور بھی رستہ ہے میں بارہا گیا ہوں۔ عشق چھ جہات میں محدود تھوڑا ہی ہے، یہ تو عقل کی حد بندی ہے عشق اس سے بالاتر ہے وہ دور دور پہنچتا ہے تو عشق جب مالک سے ملا دیتا ہے اور سرچشمہ کمالات سے ملا دیتا ہے تو عقل تو ایک اس بارگاہ کی باندی ہے، عقل بے چاری کیا کرے گی، عقل کا دائرہ محسوسات کے اندر محدود ہے، اور عشق ماورائے محسوسات کی باتیں پاتا ہے، وہ عرش کی باتیں لاتا ہے، تو اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسرائیلی پیغمبر ہیں، اس وقت بات کھلی کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں تو ہاتھ چومے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی جانا کہ یہ کوئی حکیم معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ: **اَلسُّؤَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ** گہرا سوال کرنا بھی علم کے بغیر نہیں، جاہل محض سوال بھی نہیں کرسکتا، مطلق جاہل ہو وہ سوال کر نہیں سکتا، کرے گا تو بے ڈھنگا کرے گا، جواب دینے والے کو بھی الجھا دے گا، اس لئے سوال کرنا بھی علم والے کا کام ہے، جاہل کا کام نہیں ہے جو ڈھنگ کا سوال کرے۔ **اَلسُّؤَالُ نِصْفُ الْعِلْمِ** حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سوال کرنے والا بھی آدھا عالم ہوتا ہے، بغیر اس کے سوال نہیں کرسکتا، تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بھی حکیم معلوم ہوتے ہو، سوال ایسا گہرا کیا کہ وہ بے علم کے سوال نہیں ہوسکتا۔ بہرحال اس وقت تعارف ہوا افلاطون کو اور موسیٰ

علیہ السلام نے جواب دیا کہ جب اللہ کو فرض کیا جائے کہ وہ تیر چلا رہے ہیں اور آسمان کی کمان سے تیر برسا رہے ہیں تو بچنے کی کیا صورت ہے؟ تو بچنے کی صورت یہ ہے کہ تیر چلانے والے کے پہلو میں آ کھڑا ہو، تیر نہیں لگے گا۔

قضائے الٰہی پر راضی رہنے سے تشویش ختم ہو جاتی ہے......اللہ کا پہلو کیا ہے؟ وہ تو جسم سے بری ہے، وہاں کوئی پہلو نہیں کوئی آگا پیچھا نہیں وہ تو ہر جہت سے اونچے اور بالاتر ہیں، پہلوئے خداوندی درحقیقت ذکر اللہ ہے کہ یادِ خداوندی قلب کے اندر آ جائے، حق تعالیٰ کا پہلو یہ ہے کہ اس کی یاد بغل میں موجود ہو، جب اس کی یاد موجود ہے تو گویا آدمی ان کے پہلو میں ہے اس لئے کہ پہلو کے معنی یہی تو ہوتے ہیں کہ بچاؤ کر لے، کوئی حملہ کرے تو آپ بچے کو پہلو میں لے لیتے ہیں کہ حملہ آور حملہ نہ کر سکے، عورت جارہی ہو اس کو پہلو میں لے لیتے ہیں تا کہ اس پر کوئی حملہ آور نہ ہو، تو پہلو کے معنی بچاؤ کے اور ذریعے کے لینے کے ہیں۔

حرز میں آ جائے تحفظ میں آ جائے، تو اللہ کے تحفظ میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد قلب کے اندر آ جائے وہی ذکر اللہ ذریعہ حرز بنتا ہے تو پہلوئے خداوندی ذکر ہے، تو حاصل یہ نکلا کہ اگر قلب کے اندر ذکر الٰہی موجود ہے تو تیر بے شک آئیں گے، لیکن اثر نہیں کریں گے، اس لئے کہ اطمینان ہے اپنے مالک کے اوپر مگن اور مطمئن ہے، نہ بیماری کی پرواہ ہے نہ تندرستی کی جو وہ دے رہے ہیں حکمت سے دے رہے ہیں، اور میرے لئے مصلحت اور مناسب ہے جب یہ رضا پیدا ہو گئی تو تشویش کہاں رہی۔

تو یہ مطلب نہیں ہے کہ ذکر کرنے والا کبھی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوگا، ذکر کرنے والے بلکہ اہل اللہ پر زیادہ مصیبتیں آتی ہیں، فساق و فجار پر کم آتی ہیں، کفار پر ان سے بھی کم آتی ہیں، مومن اور جتنا مخلص ہوگا زیادہ مصیبت آئے گی، جانچ اسی کی کی جائے گی۔ تو یہ مطلب نہیں کہ مصیبت نہ آئے گی۔ حدیث میں فرمایا گیا: ”اَشَدُّ بَلَآءٍ اَلْاَنْبِیَآءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ“ ① سب سے زیادہ شدید بلاؤں میں انبیاء گرفتار کئے جاتے ہیں، حد سے زیادہ مصیبتیں پڑتی ہیں پھر جو ان سے زیادہ قریب یا مشابہ ہے وہ اتنا ہی زیادہ مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے، یہ نہیں ہے کہ اہل اللہ پر مصیبتیں نہیں آتیں، فقر و فاقہ نہیں ہوتا، وہ نادار نہیں بنتے، گھر میں کوئی آگ نہیں لگ جاتی، بیمار نہیں پڑتے، ساری مصیبتیں آتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہہ رہے ہو؟ عرض کیا کہ محبت ہے، فرمایا دیکھو سمجھ کر کہو کیا کہہ رہے ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ! واقعی مجھے محبت ہے، آپ نے فرمایا: اگر محبت ہے تو فقر و فاقہ کے لئے تیار ہو جاؤ، مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار ہو جاؤ، تو اللہ والوں پر زیادہ مصیبتیں آتی ہیں۔

رضاء بر قضاء ذریعہ سکون ہے......مگر فرق کیا ہے؟ کہ مصیبتیں آتی ہیں مگر اعضاء رفتہ و بے کار نہیں ہوتے، ان کے دل میں پریشانی نہیں ہوتی، دل مگن اور مطمئن رہتا ہے کہ یہ مصیبت مالک الملک نے بھیجی ہے

① السنن للترمذی، کتاب الزہد باب ماجاء فی الصبر علی البلاء ج: ۸ ص: ۴۱۷ رقم: ۲۳۲۲.

ہمارے لئے یہی مصلحت ہے تو ہم اس میں راضی ہیں۔ تو مصیبت درحقیقت آدمی کے قلب کی صفت کا نام ہوا، کہ وہ تشویش میں مبتلا ہو یہ مصیبت ہے، اور تشویش دل سے نکل جائے تو وہ مصیبت ختم ہے تو مصیبت نام بیماری کا نہیں ،مصیبت نام تنگدستی کا نہیں یہ تو اسبابِ مصیبت ہیں خود مصیبت نہیں۔ مصیبت قلب کی صفت ہے کہ تنگدستی سے پریشان ہو جائے اور اگر کوئی تنگدستی پر راضی اور مطمئن ہو جائے تو اس پر کیا مصیبت آئے۔ بہت سے اہل اللہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ جتنی چیزیں ہمارے پاس ہیں یہ چلی جائیں تو اچھا ہے تاکہ ہم یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوں تو ساری چیزیں چھین لو اور زیادہ ان کا اطمینان بڑھ جاتا ہے، حالانکہ نادار ہو گئے تو ناداری مصیبت نہیں بلکہ ناداری سے پریشانی کا اثر لینا یہ قلب کی صفت ہے، تو مصیبت قلب کی شان نہیں بیماری مصیبت نہیں، یہ تو سبب مصیبت ہے، ناداری مصیبت نہیں یہ سبب مصیبت ہے۔ تو راحت اور مصیبت قلب کی صفت ہے، اگر قلب کو آدمی درست کر لے اور قلب کو اپنے مرکز سے وابستہ کر دے تو پھر مصیبت کا کوئی اثر نہیں، چاہے بیمار ہو، چاہے نادار ہو چاہے تنگدست ہو، تو اصل چیز ہے قلب کی توجہ اور راضی بہ رضا ہو جانا کہ اسی میں ساری راحتیں ہیں۔

یہی شریعت اسلام کہتی ہے کہ اگر تم مصیبت سے بچنا چاہتے ہو، اگر تم سکون حاصل کرنا چاہتے ہو تو سکون نہ تمہیں کوٹھیوں میں ملے گا، نہ تجوریوں میں ملے گا، سکون تمہیں ملے گا تعلق مع اللہ میں، جب اس کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ گے، سکون تام حاصل ہو جائے گا، پریشانی ختم، جز ختم ہو جائے گی، یہ چیزیں سکون کا ذریعہ نہیں ہیں یہ ہے بنیادی چیز۔ ذکر اللہ ہی سے قلوب چین پاتے ہیں، اس میں اگر بادشاہ بھی بن جائے تب بھی راضی اور فقیر بن جائے جب بھی راضی۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ثبات قدمی کا واقعہ...... ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ مکہ معظمہ میں ہجرت فرما گئے، تو انہوں نے خود یہ واقعہ میرے والد مرحوم کو سنایا، انہیں پیار میں بیٹا کہا کرتے تھے، عزیز داری اور رشتہ داری بھی تھی اور بیٹا فرماتے تھے۔ تو اپنا واقعہ خود سنایا کہ: بیٹا! جب میں مکہ مکرمہ میں ہجرت کر کے چلا ہوں ۱۸۵۷ء میں اور جب ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا اور حضرت حاجی صاحبؒ اور مولانا نانوتویؒ سب کے وارنٹ جاری ہوئے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے مکہ مکرمہ ہجرت فرمائی۔ فرمایا جب میں نے کراچی کی بندرگاہ سے جہاز میں قدم رکھا تو میں نے اللہ سے ایک عہد کر لیا کہ آپ کے گھر جا رہا ہوں میں کسی کے دروازے پر نہیں جاؤں گا، کسی سے مانگوں گا نہیں، آپ کھلائیں گے کھالوں گا ماریں گے مر جاؤں گا، جان میری نہیں ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تو اگر آپ جان لیں گے تو وہ میری جان کب ہے، وہ بھی آپ کی ہے میں کسی گھر کو نہیں دیکھوں گا، میں تو آپ کے گھر جا رہا ہوں، یہ ایک عہد کیا (والد صاحب) فرماتے تھے جب حاجی صاحب مکہ معظمہ حاضر ہوئے تو ان کے پاس کوئی رقم نہیں تھی، کوئی سرمایہ نہیں تھا معمولی کچھ پیسے اور ناشتہ واشتہ تھا، وہ دو تین دن میں ختم

ہوگئے، اب فاقے شروع ہوئے اور یہ عہد باندھ لیا تھا کہ نہ مانگوں گا نہ کسی کے در پہ جاؤں گا بیٹھ گئے، ایک وقت کا فاقہ دو وقت کا فاقہ، تین وقت کا فاقہ۔

فاقوں پہ فاقہ ہورہا اور کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں، اور کسی سے تعارف نہیں ہے، فرماتے تھے کہ جب چار پانچ وقت کا فاقہ ہوا تو کچھ ضعف بڑھنا شروع ہوا، اب حرم شریف میں حاضری ذرا مشکل ہوگئی، بہت آہستہ چل کر آنا پڑتا تھا، فرماتے ہیں: مگر میں ہمت کر کے حرم شریف میں حاضر ہوتا تھا، طواف بھی کرتا تھا، نماز بھی پڑھتا تھا، پھر فرماتے ہیں کہ جب پانچ چھ وقت کا فاقہ ہوگیا اور ضعف زیادہ طاری ہوا تو ایک مزید چیز اور پیش آگئی کہ میں طواف کر رہا تھا، اتفاق سے کسی بدوی کی لنگی پر میرا پیر پڑ گیا اور وہ کھلتے کھلتے رہ گئی اس نے جذبہ میں آکر ایک دھول مارا۔ تو حضرت حاجی صاحبؒ کی بڑھاپے کی کمزوری، اور چھ وقت کا فاقہ، تو گر پڑے اور بے ہوش ہوگئے، اسی میں فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا گویا نیم بیداری ہے۔ کشف کی سی کیفیت کہ بیت اللہ کے ایک طرف حضرت جبرئیل علیہ السلام کھڑے ہوئے ہیں اور ایک طرف حضرت میکائیل علیہ السلام جبرئیل کہتے ہیں میکائیل سے کہ: بندہ تو بڑا صابر نکلا، میکائیل کہتے ہیں ابھی تھوڑی سی کسر اور ہے۔ جب آنکھ کھلی تو میں سمجھا کہ مجھے تسلی دی گئی ہے، میں نے پھر عہد کی تجدید کی یا اللہ! کچھ بھی گزر جائے میں کسی غیر سے مانگنے والا نہیں ہوں، آپ زیادہ سے زیادہ جان لے لیں گے تو جان تو آپ ہی کی ہے میری کب ہے۔

اب یہ کہتے تھے کہ جب دس وقت کا اور گیارہ وقت کا فاقہ ہوگیا، اب چلنا پھرنا دشوار ہوگیا حتیٰ کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنی دشوار ہوگئی بیٹھ کر نماز پڑھنے لگا، مگر ہر نماز کے بعد عہد کی تجدید کر دیتا تھا کہ پکا ہوں اس سے ہٹوں گا نہیں، آپ دیں گے کھالوں گا نہیں دیں گے نہیں کھاؤں گا۔

فرماتے تھے، جب گیارہ وقت کا فاقہ ہوگیا تو کسی نے دروازے پر دستک دی، میں نے کہا کہ بھائی آجاؤ! وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں چینی کا ایک قاب تھا، وہ میرے سامنے رکھ دیا میں نے کھولا تو مرغ کا پلاؤ اس میں پکا ہوا تھا، دل میں یہ خیال گزرا کہ میں نے تو عہد کیا تھا کہ غیر اللہ سے نہیں مانگوں گا اور یہ غیر اللہ ہی تو لے کر آیا ہے، اللہ نے تو بھیجا نہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے عہد میں اس غیر سے لے کر فرق آجائے۔

یہ دل میں خطرہ گزرا تھا تو وہ لانے والا کہتا ہے جو چیز بلا طلب آتی ہے وہ من جانب اللہ آتی ہے، کھایئے شوق سے میں نے کھانا شروع کر دیا خوب شکم سیر ہو کر کھایا، نصف کے قریب باقی رہ گیا تو خطرہ یہ گزرا کہ رات کے لئے رکھ لوں، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ جس نے گیارہ وقت میں مجھے فراموش نہیں کیا، کیا وہ رات کو بھول جائے گا، یہ بھی ایک قسم کی اللہ پر بے اعتمادی ہے کہ رات کے لئے رکھوں، قاب ڈھک دی۔

وہ شخص اٹھا اور قاب اٹھاتے ہوئے بولا کہ بہت اچھا ہوا جو رات کے لئے نہیں رکھا، اگر رات کے لئے رکھتے تو ساری عمر فاقے میں مارے جاتے، فرماتے ہیں کہ مجھے خبر نہیں کہ وہ کون تھا، کوئی آدمی تھا، کوئی جن تھا، کوئی

فرشتہ تھا مگر پھر میں نے اسے نہیں دیکھا وہ چلا گیا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ بیٹا! وہ دن ہے اور آج کا دن ہے دنیا کثرت سے میرے گھر میں آ رہی ہے کہ بانٹتے بانٹتے تنگ آ گیا ہوں لیکن دنیا ہے کہ آ رہی ہے، نقد میں نقد، کپڑے میں کپڑا، کھانے میں کھانا، اور فرمایا کہ یہ گھر ہے اس میں ہزار درہم اور دینار تو پڑے ہوئے ہیں صندوقچی کے اندر اور اتنے تھان کپڑوں کے رکھے ہوئے ہیں، اتنے برتن ہیں بانٹتا بانٹتا تنگ آ گیا ہوں، پھر آ جاتے ہیں۔ یہ حضرت کی کیفیت تھی، خیر تو مجھے سنانا یہ تھا کہ بہر حال حضرت کا پھر سلسلہ چلا، ہزاروں بیعت ہوئے اور گھر میں بہت کچھ اللہ نے دیا۔

حاجی امداد اللہؒ کے گھر چور...... چنانچہ چوروں نے دیکھ لیا کہ بھئی ایک مولانا حاجی صاحبؒ ہیں ان کے گھر میں بہت کچھ ہے، یہاں اگر چوری کی تو بہت کچھ ملے گا، رات چور آ گئے اور حضرت حاجی صاحبؒ تہجد پڑھ رہے تھے، چوروں کو پتہ نہیں تھا کہ نماز میں مصروف ہیں، حاجی صاحبؒ نے دیکھ لیا انہوں نے سارے گھر کا سامان بٹورا، کپڑے اور برتن وغیرہ ان کی گٹھڑیاں باندھیں جب لے جانے لگے تو حضرت نے فرمایا: احمقو! بے وقوفو! تمہیں چوری بھی کرنی نہیں آئی، جو چرانے کی چیز ہے وہ تو نہیں لی، نقد تو وہاں کئی ہزار روپیہ رکھا ہوا ہے، وہ چور بھی شرمندہ اور نادم کہ کس کے گھر میں چوری کرنے آ گئے، خود ہی دینے کو تیار ہے وہاں جا کر اس کوٹھڑی کو دیکھا تو کئی ہزار روپیہ نقد ملا، بہر حال وہ روپیہ اور نقد چیزیں لے کر چور چل دیئے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے کیا کیا جب سارا گھر خالی کر کے وہ چلے گئے تو مصلے پر دو رکعت نمازِ نفل پڑھی اور کہا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ اس وبال کو تو نے ہٹا دیا اب میں تیرے لئے فارغ ہوں، رات دن عبادت میں مصروف رہوں گا، بڑا شکر ادا کیا کہ مال چلا گیا۔

چونکہ حضرت کا تعارف حکومت میں بھی ہو چکا تھا، پبلک میں بھی ہو چکا تھا لہٰذا یہ شہرت ہوئی کہ چوری ہو گئی! تو چوروں نے جب مال نیلام گاہ پر لے جا کر رکھا تو سینکڑوں مریدین نے پہچان لیا کہ یہ تو حضرت کا مال ہے وہ سارے چور پکڑے گئے اور گرفتار ہوئے اور ایک ایک پائی حکومت نے چوروں سے وصول کر لی، اور پھر سارا مال لا کر حضرت کو دیا، وہی تھان، وہی کپڑے، وہی نقدی، جب وہ ساری آ گئی تو مصلی بچھا کر دو رکعت نفل پڑھی کہا "یا اللہ! تیرا شکر ہے میری چیز میرے پاس آ گئی۔"

یہ ان حضرات کا مقام ہے کہ چیز چلی جائے جب شکر گزار اور آ جائے جب شکر گزار، یہ علامت اس کی ہے کہ ان کی نگاہ نعمت اور مصیبت پر نہیں ہوتی، مصیبت بھیجنے والے پہ ہوتی ہے نعمت دینے والے پہ ہوتی ہے کہ دینے والا کون ہے؟ وہ وہ ہے جو ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہے تو اس نے اگر مصیبت بھیجی تو یقیناً ہماری خیر خواہی کے لئے بھیجی ہے، نعمت بھیجی ہے، یقیناً ہماری مصلحت کے لئے بھیجی ہے، تو ان لوگوں کی نگاہ نہ نعمت پر ہے نہ مصیبت پر ہے، نعمت دینے والے پر ہے، منعم پر ہے مصیبت بھیجنے والے پر ہے مصیبت پر نہیں۔

منعم سے نگاہ ہٹنا ہی مصیبت ہے۔...... اس سے اندازہ ہوا کہ ساری مصیبتوں کی جڑ نعمت اور مصیبت کے

اوپر نگاہ ہے، اہل اللہ اسے چھوڑ کر مصیبت بھیجنے والے پر نگاہ رکھتے ہیں، اس لئے ان کے قلب میں نہ کوئی پریشانی ہے، نہ کوئی پراگندگی ہے، وہ منعم سے تعلق قائم کرتے ہیں، نعمت سے نہیں، نعمت چلی جائے جب بھی نماز پڑھیں گے، شکرادا کریں گے کہ الحمدللہ فارغ ہوگئے، آ جائے پھر نماز پڑھیں گے شکر ادا کریں گے کہ اللہ نے پھر ہمارا گھر بھر دیا، وہ ہر حالت میں راضی یہی ہے وہ چیز جسے میں نے عرض کیا تھا، حدیث میں ہے کہ: ''عَجَبًا لِاَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ'' مومن کی کوئی کل بری نہیں، عجیب شان ہے کہ نعمت آتی ہے تو شکر گزار ہے اور شکر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچتا ہے، مصیبت آتی ہے تو صبر کر رہا ہے اور صبر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچتا ہے۔

غرض اس کے یہاں روکنے والی چیز نعمت ہے نہ مصیبت، جس پر اس کی نگاہ ہے وہ نعمت کے راستے سے بھی پہنچ جاتا ہے اور مصیبت کے راستے سے بھی وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔

علامہ اصمعیؒ اور ان کی حسین بیوی ...... ہمارے علماء سلف میں ایک عالم گزرے ہیں اصمعی یہ فن نحو کے امام تھے، نحو اور صرف ایک فن ہے جس سے عربی کے قواعد سمجھے جاتے ہیں اسکے بہت بڑے عالم اور امام تھے، تو وہ اس قدر بدصورت تھے کہ جتنی بدصورتی کی علامتیں تھیں ساری ان کے بدن میں موجود، رنگ بھی انتہائی کالا، ہونٹ بھی موٹے، آنکھیں بھی کرنجی، دانتوں پہ زردی۔

غرض یہ بدصورتی کی ساری چیزیں جمع تھیں، بس علم اللہ نے دے دیا تھا، اور بیوی جو ملی تو صوبوں میں اس کی مثال نہیں تھی، حسن و جمال میں وہ اس قدر حسین وجمیل، جب دونوں آمنے سامنے بیٹھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے دھوپ اور چھاؤں آمنے سامنے ہے ایک طرف دھوپ کھل رہی ہے اور ایک طرف ظلمانی سایہ۔ تو اپنی بیوی سے کہا کرتے کہ ''میں یقیناً جنتی تو بھی یقیناً جنتی'' اس نے کہا آپ یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟ فرماتے: اس لئے کہتا ہوں کہ مجھے تو تجھ جیسی بیوی ملی اس کی مثال صوبوں میں موجود نہیں، تو میں شکر کرتا ہوں اور شکر کے راستے سے اللہ تک جا پہنچوں گا اور تجھے مجھ جیسا خاوند ملا کہ جس سے زیادہ بدصورت کوئی نہیں تو تو صبر کرتی ہے کہ میری قسمت میں یہی تھا، تو صابر ہے تو صبر کے راستے سے جنت میں پہنچ جائے گی، تو میں بھی جنتی، تو بھی جنتی۔ تو خیر وہ تو حسّی طور پر جنتی ہے، مگر اہل اللہ معنوی طور پر جنتی بنتے ہیں، نہ نعمت پہ ان کی نظر ہے نہ مصیبت پہ، بھیجنے والے پر نظر ہے تو نعمت آ جائے جب بھی مطمئن، چلی جائے تب بھی مطمئن، یہی وجہ ہے کہ کفار سے اگر ان کا سامان چھین لیا جائے تو مرنے سے پہلے مر جاتے ہیں، اس لئے کہ جن چیزوں سے ان کا سکون متعلق تھا جب وہ چھن گئیں تو وہ پریشان ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سلب ہوگئی، بے آرام ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے سکون قائم کیا تھا سامانوں سے اور اللہ والوں کے پاس سے سارا سامان نکل جائے ان کے سکون میں فرق نہیں پڑتا، اس لئے کہ ان کے سکون کا تعلق ان چیزوں سے تھا ہی نہیں، وہ تو بھیجنے والے سے تعلق تھا اور وہ بدستور موجود ہے۔

حالت رضا کا غلبہ..... جیسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہؓ پریشان تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی، مغلوب الحال ہوگئے اور تلوار لے کر کھڑے ہوگئے کہ اگر کسی نے یوں کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا، یہ غلبہ حال میں ایک کیفیت پیدا ہوئی گویا غم کا اتنا غلبہ ہوگیا کہ ہر چیز فراموش ہوگئی۔ اور یہ ہوتا ہے کہ جب کسی حال کا غلبہ ہوتا ہے، تو قطعی اور یقینی چیزیں بھی دل میں رہتی تو ہیں مگر دب جاتی ہیں اوپر نہیں آتیں حالانکہ ان پر یقین ہے یقین ہے فاروق اعظم رضی اللہ کو کہ انبیاء علیہم السلام بھی وفات پانے والے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات بھی ہوگی۔ قرآن کریم میں صراحۃً فرمایا گیا کہ: ﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ ① دب کر رہ گیا یقین تو غلبہ حال جب ہوتا ہے تو بہت سی یقینی چیزیں مغلوب ہو کر رہ جاتی ہیں، دب جاتی ہیں۔

تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر ایک حال طاری ہوا اور وہ حال تھا شدتِ تعلق کا کہ انبیاء علیہم السلام بھلا کہاں مرتے ہیں، اتنا قدیم اور مضبوط تعلق تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے انہیں شک ہوگیا کہ وفات ہوئی یا نہیں، یہ غلبہ حال تھا یہ نہیں کہ معاذ اللہ۔ ﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ﴾ پر یقین نہیں تھا۔ اس وقت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا، اور فرمایا کہ بھلے مانس بیٹھ جائیں، وہ (فاروق اعظمؓ) تو جوش میں تلوار لئے کھڑے تھے اور لوگ ڈر رہے تھے کہ اگر ذرا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر کیا تو یہ گردن اڑا دیں گے، صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ بھلے مانس! میرے پاس بیٹھ جا، بیٹھ گئے، اب صدیق اکبرؓ نے فرمایا: ''مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُاللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ وَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ'' ②

فرمایا: اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتے تھے تو وہ وفات پاگئے غلبہ جب حالت کا ہوتا ہے محبت کے غلبہ میں بعض دفعہ ایسی کیفیت ہوتی ہے جس سے ہمیں زیادہ محبت ہے اور وہ گزر جائے تو ہفتوں، دنوں یقین نہیں آتا کہ کیا واقعی گزر گیا، برسہا برس کی صحبت کے بعد جب گذر جائے تو دل میں ایک قسم کا ریب اور ارتیاب پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو گویا مرنے والی چیز ہی نہیں تھی، کہاں سے مرگیا یہ شخص؟

تو ہفتوں اس میں گزرتے ہیں کہ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جیسے کہتے ہیں یقین نہیں آتا، یقین بھی ہے مگر اس کے باوجود ایک شک سا رہتا ہے، شدت تعلق کی بناء پر تو صحابہؓ سے زیادہ کس کو شدید تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا، فاروقِ اعظمؓ کے ذہن میں شدت تعلق کی بناء پر جمتا ہی نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو

① پارہ: ۲۳، سورۃ: الزمر، الآیۃ: ۳۰.

② الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ ج: ۱۳ ص: ۳۶۲ رقم: ۴۰۹۷.

تلوار لے کر کھڑے ہو گئے۔

علماء یہی لکھتے ہیں کہ غلبہ حال تھا اور غلبہ حال میں یقینی چیزیں ڈھک جاتی ہیں دب کر رہ جاتی ہیں۔

اس کی حسّی نظیر یہ ہے کہ آپ چڑیا گھر میں تو گئے ہوں گے، یہاں لندن میں بھی ایک باغ ہے جس کے اندر جانور، درندے، شیر، بھیڑیئے پلے ہوئے ہیں، آپ شیر دیکھنے کے لئے گئے، موٹی موٹی سلاخوں میں آپ نے دیکھا کہ شیر بند ہے، قطعی یقین ہے آپ کو کہ یہ باہر نہیں آ سکتا نہ مجھ پر حملہ کر سکتا ہے اسلئے آپ سلاخ کے قریب کھڑے ہوئے ہیں کہ کچھ بھی نہیں کر سکتا لیکن اگر وہ دھاڑ کر آئے تو آپ ڈر کے مارے ڈیڑھ گز پیچھے جاتے ہیں، تو کیا یہ کہا جائے گا کہ آپ کا یقین ختم ہو گیا اور شیر سلاخیں توڑ کر نکل آئے گا؟ نہیں خوف کی وجہ سے خوف کا حال اتنا غالب ہوا کہ وہ جو یقین تھا کہ نہیں آ سکتا وہ خوف کے غلبہ سے دب گیا، زائل نہیں ہوا، بعینہ یہی غلبہ محبت تھا فاروق اعظمؓ پر، موت کا یقین تھا، غلبہ محبت ہوا کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ آپ کی وفات ہو گئی، مگر صدیق اکبرؓ نے فرمایا اگر تم اللہ کی عبادت کرتے تھے تو اللہ آج بھی زندہ ہے، کوئی وجہ نہیں ہے کہ دین آگے باقی نہ رہے، دین چلے گا اور صدیوں چلے گا اور اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت پڑھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہی تو تھے اللہ کے اور ہزاروں رسول گزر چکے ہیں اگر یہ بھی گزر جائیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ فاروق اعظمؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم ہوا جیسے آج اتری ہے یہ آیت اور میں نے کبھی یہ آیت پڑھی ہی نہیں تھی۔ یہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے قلب کا تصرف تھا، ایک ایسی کیفیت فاروقِ اعظمؓ کے قلب پر طاری ہوئی کہ یہ معلوم ہوا، گویا یہ آیت آج اتر رہی ہے، اور آج میر اعقیدہ بن رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو وفات ہونے والی ہے۔ تو غلبہ حال میں بعض دفعہ یقینی چیزیں بھی مغلوب ہو کر رہ جاتی ہیں، اسی طرح سے آدمی کے اوپر اگر حالتِ رضا کا غلبہ ہو جائے کہ جو کچھ ہے وہ سب من اللہ ہے کوئی سبب کچھ نہیں کر سکتا، کرنے والا مسبب الاسباب ہے تو پھر اسباب کی طرف سے نظر اٹھ جاتی ہے، باوجودیکہ اسباب کا ہی مشاہدہ ہو رہا ہے مگر اس کے باوجود نگاہ مسبب الاسباب کے اوپر ہو جاتی ہے اسباب نگاہ میں کالعدم سے ہو جاتے ہیں۔

اسباب نہیں کرتے، مسبب الاسباب کرتا ہے..... حقیقت یہی ہے کہ اسباب کچھ نہیں کرتے، یہ آلات ہیں، کرنے والی چیز قدرتِ خداوندی ہے، اور مشیتِ الٰہی ہے، پانی نہیں ڈبوتا، مشیت ڈبوتی ہے، اگر مشیت نہ چاہے، پانی ہو، موجیں آسمان کے برابر چلی جائیں آدمی نہیں ڈوب سکتا، اور مشیت چاہے گی تو ڈوب جائے گا۔ دریائے قلزم کے اندر بنی اسرائیل بھی کودے اور فرعون بھی کودا، بنی اسرائیل پار نکل گئے، پانی نے کوئی اثر نہیں کیا بلکہ راستے بن گئے اور فرعون اور فرعونیوں کو ڈبو دیا، تو پانی ڈبونے والا نہیں تھا، مشیت ڈبونے والی تھی، مشیت متعلق ہوئی کہ یہ ڈوبیں تو ڈوب گئے، اور ان سے مشیت متعلق تھی کہ یہ پار ہو جائیں تو یہ پار ہو، تو یہ تر گئے۔ آگ نہیں جلاتی بلکہ مشیت جلاتی ہے، مشیت نہ ہو آگ کچھ نہیں کر سکتی، آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، مشیت نہیں تھی

کہ آگ جلائے وہی باغ و بہار بن گئی، کچھ نہیں کرسکی۔ چھری نہیں کاٹتی، اس کی دھار نہیں کاٹتی بلکہ مشیت خداوندی کاٹتی ہے، اگر مشیت نہ ہو دھار دار چھری ہو کام نہیں کرے گی۔ آخر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری پھیری، چھری پھر رہی ہے، چھری کاٹ نہیں رہی، اس لئے کے مشیت خداوندی نہیں تھی، تو کاٹنے والی چھری نہیں تھی، ڈبونے والا پانی نہیں تھا یہ ڈبونے کے اسباب ہیں یہ ذبح ہونے کے اسباب ہیں۔

اصل میں ان میں مسبب کی طرف سے تاثیر آتی ہے، تو اسلام کا عقیدہ یہی ہے کہ اسباب ضرور اختیار کرو تاکہ بندگی واضح ہو، مگر انہیں موثر بالذات مت سمجھو کہ انہی میں سب کچھ رکھا ہوا ہے، موثر حقیقی ذات خداوندی ہے وہ اسباب میں سے تاثیر نکال دے تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔

آدمی اولاد چاہتا ہے، بیوی کے پاس جاتا ہے، پچاسیوں دفعہ گیا نہیں ہوئی، تمنا ہے بچوں کی، بقول شخصے کہ چڑیا کا بچہ ہی ہو جائے مگر نہیں ہوا اور بعض وہ ہیں کہ نہیں چاہتے کہ اولاد ہو ہر سال ایک بچہ، ہر سال ایک بچہ، تنگ آجاتے ہیں کہ کہاں تک انہیں پالوں اور پرورش کروں، تو تمنا کیوں نہیں پوری ہوتی، حالانکہ اسباب سارے پورے ہو رہے ہیں، اس واسطے کہ مشیت نہیں ہے، مشیت کیوں نہیں؟ اس لئے کہ حکمت کے خلاف ہے یہی مصلحت ہے اس بندے کے لئے کہ اولاد نہ ہو، اس کے لئے یہی مصلحت ہے کہ اولاد ہو۔

تو اہل اللہ کی مشیت اور مرضیٔ الٰہی پر نظر ہو جاتی ہے، جب اس پر نظر ہوئی تو اسباب نہیں ہیں، مگر دھیان دوسری طرف ہوتا ہے، تو جب اس پر دھیان ہو جائے گا اور تعلق مع اللہ مضبوط ہو جائے گا، پھر تشویش بھی ختم پریشانیاں بھی ختم، دل کی بے سکونی بھی ختم، قلب کے اندر ٹھنڈک پیدا ہو جائیگی۔

دُنیوی سطح پر تعلق مع اللہ کی ضرورت...... اس سے معلوم ہوا کہ تعلق مع اللہ صرف آخرت ہی کے لئے ضروری نہیں ہے دنیا کے لئے بھی ضروری ہے، دنیا کا سکون بھی چاہتے ہو تو تعلق مع اللہ ہونا چاہئے جو لوگ صاحب وسائل ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کے دلوں میں قطعاً وہ سکون نہیں جو اہل اللہ کے دل میں ہے، باوجودیکہ سامان نہیں ہے ان کے پاس وہ ہر وقت مگن اور مطمئن ہیں، اصل یہ ہے کہ اللہ سے تعلق صحیح ہوا اور قلب کا مرکز صحیح بن جائے، ظاہر بات ہے کہ جب قلب کا مرکز صحیح ہو جائے گا، تعلق حق تعالیٰ سے قائم ہو جائے گا تو ادھر کے کمالات بھی آنا شروع ہوں گے ادھر سے اوصاف کمال بھی اس کے اندر آئیں گے، آخرت کی زندگی کے لحاظ سے بھی ضروری؟ ایک ہی سرچشمہ ہے، کہ جس سے لگ کر آدمی پریشانیوں سے اور گھٹن سے بچ سکتا ہے اور اگر ہر وقت آپ اس فکر میں ہیں کہ یہ مرے یا جیے میرا فائدہ ہو جائے یہ تو خود مطلبی خود غرضی ہے اس کا نام خدمت نہیں، خدمت کرنے والا اپنے نفس کو بھلا کر اپنے بھائی کی خدمت کرے گا کہ اس کا نفع ہو میرا چاہے نفع ہو یا نہ ہو تو اسلام نے خود غرضی کو مٹا کر ایثار پیدا کیا ہے کہ خدمت خلق اللہ اپنے اندر پیدا کرو، اس کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرو۔

ایمان کی دو بنیادیں...... ایمان کی جو تعریف کی ہے علماء نے وہ دو ہی چیزوں سے کی ہے کہ ایمان کسے کہتے

ہیں؟ اَلتَّعْظِیْمُ لِاَمْرِ اللّٰہِ وَالشَّفْقَةُ عَلیٰ خَلْقِ اللّٰہِ اللہ کے اوامر کی عظمت دل میں ہو اور مخلوق خدا کی خدمت کا جذبہ دل میں ہو، ان دو چیزوں کا نام ایمان ہے۔ یعنی ان کے مجموعہ کا، اگر ایک شخص خادمِ شخص ہے مگر اللہ کے قانون کی عظمت نہیں کرتا، وہ بھی درحقیقت ایمان دار نہیں ہے، اللہ پر بھروسہ بھی ہے مگر خدمت خلق کے بجائے خلق کو ایذا رسانیاں کر رہا ہے تکلیفیں پہنچا رہا ہے تو درحقیقت اس کے ایمان میں خلل ہے، ایمان کی دو بنیادیں ہیں کہ تعظیم ہو اوامرِ الٰہیہ کی اور جذبہ خدمت ہو خلق اللہ کے لئے ان دو چیزوں سے ایمان مضبوط ہوتا ہے تو مخلوق کے ساتھ تعلق جب قائم ہو سکتا ہے جب احسان اور ایثار اور خدمت کے جذبات ہوں اور مساوات کا جذبہ ہو کہ یہ میرا بھائی ہے اسے بھی نفع پہنچنا چاہئے اگر میرے پاس ایک روٹی ہے دوسرے کے پاس نہیں تو میں آدھی آدھی بانٹ لوں گا تاکہ دونوں کے پیٹ میں کچھ نہ کچھ پہنچ جائے، تنہا کھا لینا خود غرضی ہوگی، جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے اگر کسی کی دیوار کے نیچے پڑوسی پر فاقے گزر رہے ہیں اور وہ پیٹ بھر کر کھا رہا ہے اس کی نمازیں بھی قبول نہیں ہوں گی جب تک کہ وہ پڑوسی کی رعایت نہ کرے اور اس کا پیٹ بھرنے کی کوشش نہ کرے، تو آدمی یہ سمجھے کہ میں اتنی تلاوت کرتا ہوں اتنی نمازیں پڑھتا ہوں اور خدمت خلق کا یہ عالم کہ دیوار کے نیچے لوگ فاقہ بھر رہے ہیں تو کہا جائے گا کہ اس نے ایمانداری کا فی الحقیقت ثبوت نہیں دیا اور یہ نماز وذکر وعبادت کارآمد نہیں ہوں گی جب تک اس کے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا نہیں ہو جائے گا، کہ میرا بھائی بھی بھوکا نہیں رہنا چاہئے، بہرحال یہ جذبہ پیدا کیا جائے۔ اصول فرمادیا گیا کہ: ''اَحِبَّ لِاَخِیْکَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ'' ① (اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو) اور جو چیز اپنے لئے بری جانتے ہو اپنے بھائی کے لئے بھی بری جانو جب تک مساوات معاملے کی نہیں ہوگی ایمانداری مضبوط نہیں ہو سکے گی، اگر آپ یہ چاہتے ہیں اور آپ کو برا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کوئی گالی دے تو آپ بھی کبھی کسی کو گالی نہ دیں جو اپنے لیے برا سمجھتے ہیں وہ اپنے بھائی کے لئے برا سمجھیں، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں تو آپ بھی کسی کی بہو بیٹی پر بری نگاہ نہ ڈالیں جب تک یہ نہیں کریں گے آپ کی ایمانداری مضبوط نہیں ہوگی۔

زمین خریدنے والے ایک صحابی کی زمین سے سونا نکلنا..... فرق یہی ہے کہ ہم لوگ لڑتے ہیں اپنی اغراض کی خاطر کہ مجھے یہ مل جائے چاہے دوسرا فاقے سے مرجائے حضراتِ صحابہؓ میں ایثار وہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ لڑتے تھے اس پر کہ دوسرے کو مل جائے مجھے نہ ملے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے زمین خریدی دوسرے صحابیؓ نے اس کو جو کھدوایا تو اس کے اندر سے ایک بہت بڑا پتیلا نکلا پیتل یا تانبے کا جس میں سونا بھرا ہوا تھا، لاکھوں روپے کا سونا، انہوں نے کہا یہ بند کا بند رہنے دو اور وہ پیتل کا پتیلا لے کر ان کے ہاں پہنچے جن سے زمین خریدی تھی کہ یہ آپ کی چیز ہے آپ رکھیں، انہوں نے کہا

① مسند احمد، حدیث اسد بن کرز جد خالد القسری رضی اللہ عنہ ج: ۳۳ ص: ۴۸۶ رقم: ۱۶۰۵۷۔

کیا مطلب ہے؟ کہا میں نے جو زمین خریدی ہے اس میں سے نکلا ہے، انہوں نے کہا کہ جب میں نے زمین بیچ دی تو زمین میں تحت الثریٰ تک جو کچھ ہے وہ بھی بیچ دیا یہ تو آپ کا ہے میرا کب ہے، انہوں نے کہا کہ جب میں نے زمین خریدی تو اس میں اس کا ذکر نہیں تھا، اب وہ کہہ رہے ہیں یہ آپ کا، وہ کہہ رہے ہیں یہ آپ کا، اس پر لڑائی ہو رہی ہے۔ ہم تو اس پر لڑتے ہیں کہ ہمارا ہے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں ثابت کرتے ہیں کہ یہ زمین ہماری ہے، وہ ثابت کرنے کی فکر میں تھے کہ میری نہیں میرے بھائی کی ہے، جب جھگڑا ختم نہ ہوسکا تو مقدمہ پہنچا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک، جب دیکھا کہ یہ نہیں سمجھتے تو فرمایا تمہارے کوئی اولاد بھی ہے؟ ایک نے کہا لڑکا ہے، ایک نے کہا میرے ہاں لڑکی ہے، فرمایا دونوں کی شادی کر دو اس میں اس مال کو خرچ کر دو، تو خوش ہو کر چلے گئے، گویا اس پر کوئی تیار نہیں ہوا کہ اپنے اوپر خرچ کرے، وہ راضی ہوئے نہ یہ راضی ہوئے تو اولاد پر خرچ کر دیا اس پر راضی ہو گئے، یہ وہی جذبہ خدمت اور جذبہ ایثار تھا کہ دینے کے اوپر لڑائی ہوتی تھی۔ ہماری لڑائی لینے پر ہوتی ہے اس لیے کہ دنیائی محبت گھسی ہوئی ہے، ان کے دلوں میں اللہ اور رسول کی محبت ہوتی تھی، دنیا ان کے تابع تھی تو وہ لینے پہ نہیں جھگڑتے تھے دینے پہ جھگڑتے تھے، ہمارے دل میں تو گھٹن جب ہوتی ہے جب پیسہ پاس نہ رہے، ان کے دل میں گھٹن جب ہوتی تھی جب پیسہ بڑھ جائے۔

حضرت جابرؓ اور ان کی بیویؓ کا ایک رات میں چھ لاکھ درہم خیرات کرنا...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ لکھ پتی صحابہ میں ہیں ایک دن آئے تو چہرہ اداس تھا، بیوی بھی صحابیہ تھی انہوں نے کہا کہ آج آپ غمگین کیوں ہیں؟ کہا خزانہ میں روپیہ بہت جمع ہو گیا دل پہ بوجھ ہو رہا ہے، انہوں نے کہا بوجھ ہو رہا ہے تو غریبوں میں تقسیم کر دو اس بوجھ کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے، کہا واقعی بات تو ٹھیک کہی میرے ذہن ہی میں نہیں آئی، اسی وقت خزانچی کو حکم دیا کہ غریبوں میں تقسیم کر دو، رات بھر مدینہ کی گلیوں میں یتیموں کو بیواؤں کو مفلسوں کو مال تقسیم ہوتا رہا، صبح کو جب حساب لگایا تو چھ لاکھ درہم تقسیم ہوئے رات بھر میں، صبح کو بیوی کا شکریہ ادا کیا کہا ''اللہ تجھے جزائے خیر دے میرا دل ہلکا ہو گیا، سارا بوجھ ختم ہو گیا'' تو ہم پہ تو بوجھ جب پڑتا ہے جب پیسہ کی کمی آجائے، وہاں بوجھ جب پڑتا ہے جب پیسہ کی زیادتی ہو جائے، فرق یہی تھا کہ ہم میں تعلق مع اللہ کمزور ہے، ان کا تعلق مع اللہ مضبوط ہے اس لیے ان کی نگاہ ان چیزوں کی طرف نہیں تھی، ہمارا تعلق انہی چیزوں سے ہے یہ گھٹ جائیں تو دل میں پریشانی بڑھ جاتے تو دل میں سکون کی بجائے اس کے کہ توکل علی اللہ کریں، کسی نے توکل علی الدولت کر رکھا ہے، کسی نے توکل علی العورت کر رکھا ہے، کسی نے توکل علی البلڈنگ کر رکھا ہے، مختلف توکلات ہیں اور نہیں توکل تو اللہ کے اوپر نہیں ان کا توکل بھروسہ اور اعتماد حق تعالیٰ کے اوپر تھا اس لیے ان چیزوں کی اہمیت کوئی نہیں تھی، یہ ضروریات زندگی تھیں۔

ذرائع رزق سے تعلق کی نوعیت...... اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی آج سے کمانا چھوڑ دے، ملازمت بھی چھوڑ دے، جائیداد تجارت بھی چھوڑ دے کہ صاحب میں تو ان پر نظر نہیں رکھتا یہ بھی غلط ہے یہ افراط ہے وہ تفریط، کمانا

بھی ضروری ہے، لازم قرار دیا ہے اسلام نے۔ "كَسْبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ" ① (پاک اور حلال کمائی کرنا اسی طرح فرض ہے جس طرح سے نماز پڑھنا فرض ہے) اپنی قوت بازو سے کماؤ بھک منگے مت بنو کہ دوسرے سے مانگ کر کھاؤ، ایسے بنو کہ دس کو کھلا کر کھاؤ، قوت بازو سے کماؤ، تو کسبِ حلال کو فرض قرار دیا گیا ہے، کیوں کماؤ؟ تا کہ زندگی آسودگی سے گزرے، کیوں زندگی آسودگی سے گزرے؟ تا کہ اللہ کی عبادت کرسکو، بندگی کے فرائض انجام دے سکو تو مقصودِ اصلی کمانا نہ ہوا، بلکہ بندگی اور عبدیت ہوئی، اس کے وسائل میں سے ہے کمانا تو اسے لازم قرار دے دیا گیا، کہ کماؤ، تو حاصل یہ کہ میرے پاس اتنا ہو جائے کہ میں دوسرے سے مانگنے کے لائق نہ بنوں، لیکن اس میں اگر حق تعالیٰ برکت دے اور سو سے تم ہزار پتی ہو جاؤ اور ہزار سے لکھ پتی تو یہ نہیں کہ اس دولت کو سمندر میں بہادو، جا کر اس کی حفاظت کرو اور اس میں سے حقوق ادا کرو، اولاد کا حق، بیوی کا حق، رشتہ داروں کا حق، غریبوں کا حق۔ یہ ادا کرو تو کمانا برا نہیں ہے، حقوق کا ادا کرنا ضروری ہے، جب وہ کمائی پاک بنے گی۔

تو یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ پر توکل کر کے ان چیزوں کو آدمی ترک کردے، ملازمت، زراعت سب چیزوں کو چھوڑ چھاڑ دے بلکہ سب چیزیں اختیار کرلے اور اللہ ہی کے کہے کے مطابق انہیں خرچ کرے، پھر یہ ساری چیزیں اطاعت وعبادت میں داخل ہو جائیں گی، تو صحابہ کرامؓ میں لکھ پتی بھی ہیں، کروڑ پتی بھی ہیں، اگر دنیا کمانا مضر ہوتا تو صحابہ ملازمت کرتے نہ تجارت کرتے نہ صنعت وحرفت میں پڑتے لکھ پتی ہونا تو بعد کی چیز ہے، لیکن وہ لکھ پتی بھی تھے۔

عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی مالداری اور خشیتِ خداوندی...... حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ لکھ پتی صحابہؓ میں ہیں ان کی تجارت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا دی تو کیفیت برکت کی یہ تھی کہ ان کا مال غیر ممالک میں بھی سپلائی ہوتا تھا، نفع کا روپیہ جب آتا تھا تو یہ نہیں کہ کوئی ایک دو آدمی جیب میں ڈال کر چلے آئیں بلکہ اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جب گھر میں رکھنے کے لیے کوئی صندوق کوئی پٹارہ نہیں رہتا تو تنگ آ کر کہتے گھر کے کونے میں ڈھیر لگادو، روپے اشرفی کا ڈھیر اس طرح لگ جاتا تھا، جیسے کاشتکار کے گھر میں غلہ کا ڈھیر لگ جاتا ہے کہ زمین سے غلہ آیا انہوں نے کہا گھر میں ڈھیر کردو، یہ کیفیت تو دولت کی تھی۔

لیکن اس دولت کے ساتھ قلب کی کیفیت کیا تھی؟ قلب کی کیفیت یہ تھی کہ مہمان داری تھی چار چار سو مہمان ایک وقت میں ہوتے تھے، دسترخوان بچھتا کئی کئی کھانے اس پہ چنے جاتے جب دسترخوان چن دیا گیا مہمان کئی سو بیٹھے اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ بیٹھے، اب بیٹھ کر رونا شروع کیا بے اختیار گریہ طاری ہوا اور کہا اے اللہ! تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر تو کبھی ایک سے دوسرا کھانا نہ ہوا اور عبدالرحمٰن کے دسترخوان پر اتنے کھانے کہیں میری جنت کی نعمتیں دنیا ہی میں تو ختم نہیں کی جارہیں، یہ کہہ کر آبدیدہ ہوتے سارے مہمان روتے اور بے کھائے پیئے دسترخوان اٹھ جاتا۔

کسی کے اندر یہ ذوق نہ رہتا کہ کھانا کھائیں، غم آخرت میں مبتلا ہو گئے، شام کو دسترخوان بچھا بیٹھے اور عبدالرحمٰن

① السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب الاجارة، باب كسب الرجل وعمله بيده ج:٦ ص:١٢٨.

بن عوفؓ کو نعمتیں دیکھ کر پھر گریہ طاری ہوا اور کہا کہ: اے اللہ! تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ نے اس حالت میں انتقال فرمایا کہ کفن کے لیے چادر پاس نہیں تھی، چھوٹی چادر تھی سر ڈھانپتے تھے تو پیر کھل جاتے تھے، پیر ڈھانپتے تھے تو سر کھل جاتا تھا آخر کار سر ڈھانپ دیا گیا پیروں پر گھاس ڈال دی گئی اور قبر میں دفن کر دیا گیا تو عمِ رسول ،رسول کے چچا تو اس ناداری میں اور عبدالرحمٰن کے دسترخوان پر اتنی نعمتیں، کہیں میری جنت دنیا میں تو ختم نہیں کی جارہی کہ وہاں میں محروم رہ جاؤں اور مجھے کہہ دیا جائے ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ ① (کہ تم دنیا میں نعمتیں ختم کر چکے ہو اب ہم سے کیا چاہتے ہو؟) کہیں ایسا تو نہیں ہوگا؟ تو دسترخوان سے بے کھائے اٹھ جاتے، تین تین وقت کے فاقے تھے۔ تو لکھ پتی بھی ہیں اور قلب کا یہ حال ہے۔

مقام تفویض میں مال رکاوٹ نہیں ہوسکتا...... تو اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم کماؤ مت، یہ کہتا ہے کہ اسے معبود مت بناؤ اس مال کو مخدوم مت بناؤ، گویا قلب کا تعلق قائم کر دیا۔ تمہاری شان یہ ہونی چاہئے کہ:

دل بیار دست بکار

’’ہاتھ پیر کاروبار میں لگے ہوں، دل یار کے اندر لگا ہوا ہو‘‘ ہاتھ پیر دولت میں مصروف اور دل اللہ میں مصروف، مسلمان کی یہ شان ہونی چاہئے، بھک منگا اور مفلس ہونا مسلمان کی شان نہیں ہے، غنی ہونا مومن کی شان ہے، غنی وہی ہو کہ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہو اور پھر وہ بے پرواہو۔

”خَيْرُ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ“ ② بہترین غنا یہ ہے کہ نفس غنی بن جائے۔ خزانہ بھرا ہوا ہے مگر نفس غنی ہے ،ایسے غنی بن کر جو صرف کرے گا تو اس سے ہزاروں کے منافع ہوں گے، تو مفلس بنانا اسلام کا مقصد نہیں ہے، غنی بنانا اسلام کا مقصد ہے اور غنی بنانے کے یہ معنی ہیں کہ ساری دولت دنیا کو خادم سمجھو ضرورت ہے، ضرورت کے لئے آدمی کرتا ہے سب کچھ کراہت بھی رکھو مگر اس کے باوجود اس سے خدمت بھی لو آخر آدمی پاخانہ میں بھی جاتا ہے، تو کوئی رغبت سے جاتا ہے کہ اسے بڑا شوق ہے پاخانہ جانے کا کراہت سے بیٹھتا ہے، مگر جانا بھی ضروری ہے، یہ بھی نہیں کرسکتا کہ نہ جائے تو ضرور جائے گا بیٹھے گا، مگر کراہت بھی رہے گی اسی طرح سے ہاتھ پیر سے کما بھی رہا ہے، سب کچھ ہے مگر کراہت یوں ہے کہ کہیں یہ حارج نہ ہو جائے میری آخرت میں، تو چوکنا رہنا ہے کہ یہ دشمن بھی ہے کہیں دشمنی پر آمادہ نہ ہو اس کی نکیل میرے ہاتھ میں رہنی چاہئے، تو صحابہ اور حضرات اہل اللہ کی یہی شان تھی کہ اہل اللہ میں بڑے بڑے مال دار بھی گزرے ہیں لیکن بزرگی میں کوئی فرق نہیں، ٹھاٹ دار بھی گزرے ہیں کہ بادشاہوں کے وہ ٹھاٹ نہیں تھے، جو بعض اولیاء کرام کے تھے۔

اولیاء اللہ کا دُنیوی کروفر اور مرزا مظہر جان جاناں اور بادشاہ کا واقعہ...... خواجہ عبید اللہ احرارؒ مسندیں لگی ہوئی ہیں، خُدام کھڑے ہوئے ہیں دروازوں پر نقیب ہیں۔ بادشاہ وقت بھی آنا چاہے تو پہلے وقت لے گا منٹ

① سورۃ الاحقاف: ۲۰. ② الصحيح للبخاری، كتاب الرقاق، باب الغنی غنی النفس ج: ۲۰ ص: ۷۹ رقم: ۵۹۶۵.

مقرر ہوں گے تب آسکیں گے، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ نقشبندیہ خاندان کے اولیاء میں سے ہیں اور اکابر اولیاء میں سے ہیں، لیکن مزاج میں لطافت ونزاکت تھی تو مسندیں جو سلتی تھیں چھ چھ مہینے میں تیار ہوتی تھیں، کہیں اونچ نیچ نہ ہوجائے، طبیعت میں کوئی تکدر نہ پیدا ہو، مسندگی ہوئی ہے، خدام ہیں، بادشاہ وقت جو مغل ایمپائر کا بادشاہ تھا اس نے اجازت چاہی تو اجازت نہیں ملتی تھی آخر بادشاہ نے خدام کو ہموار کیا کہ خادم ذرا دل میں گھر کیے ہوئے ہوتے ہیں، اس کی خوشامد کی کہ مجھے پانچ منٹ کی اجازت دلا دے۔خادم نے جب عرض کیا تو اجازت ہوئی کہ بادشاہِ سلامت پانچ منٹ کے لیے آجائیں، تو مغل بادشاہ آیا بڑے ادب سے سلام کر کے مؤدب بیٹھ گیا، چپ چاپ بیٹھا ہوا ہے، حضرت مرزا صاحب کو کچھ پیاس معلوم ہوئی تو خادم کھڑا ہوا تھا فرمایا کہ پانی لاؤ، بادشاہ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں پانی پیش کروں، وہ خادم بیٹھ گیا، بادشاہ سلامت پانی لینے کے لئے گئے، گھڑونچی پر گھڑا رکھا ہوا تھا، پانی انڈیل کر اس کے اوپر جو ڈھانکنے کا ڈھکنا تھا، وہ ٹیڑھا رکھا گیا، بس تکدر پیدا ہوگیا مزاج میں، جب بادشاہ آیا، فرمایا تمہیں پانی پلانا تو آتا نہیں بادشاہت کیا کرتے ہوگے؟ وہ بے چارہ بادشاہ بھی نادم ہوا، تو بادشاہوں کے وہ کرّ وفر نہیں تھے جو ان اہل اللہ کے تھے اور بزرگی پھر بھی قائم ہے۔تو بزرگی نام کپڑوں کا نہیں ہے کہ پھٹے پرانے کپڑے والے بزرگ ہوتے ہیں اور جو فاخرہ لباس پہن لیا بزرگی ختم ہوگئی، بزرگی قلب کی صفت ہے بعض دفعہ وہ ریاست کے چولے میں نمایاں ہوتی ہے، بعض دفعہ فقر و فاقہ کے چولے میں آتی ہے، حضرت عیسیٰ کا زُہد اور یوسف وسلیمان علیہم السلام کی بادشاہت نبوت سے زیادہ بزرگی تو نہیں لیکن انبیاء علیہم السلام میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ جن کے زہد کا یہ عالم ہے کہ کل دنیا کی دو چیزیں ان کے ہاتھ میں تھیں ایک لکڑی کا پیالہ اور ایک چمڑے کا تکیہ جہاں موقعہ ملا تکیہ رکھا سو گئے، جہاں ضرورت پڑی وہ پیالہ ہاتھ میں ہے، اُسی سے وضو کرلیا اسی سے کھانا کھالیا۔

ایک دفعہ دیکھا کہ ایک شخص کہنی سر کے نیچے رکھے ہوئے سو رہا ہے تو کہا اللہ اکبر! معلوم ہوتا ہے دنیا ضرورت سے زائد ہے، بلا تکیہ بھی کام چل سکتا ہے تو وہ تکیہ بھی اسی وقت پھینک دیا، کہنی رکھ کر سونے لگے، پھر ایک شخص کو دیکھا کہ ایک تالاب پر کھڑا ہوا چلو سے پانی پی رہا ہے تو کہا افسوس یہ پیالہ بھی زائد لے رکھا ہے بغیر اس کے بھی کام چل سکتا ہے، وہ پیالہ بھی اٹھا کر پھینک دیا تو یہ کیفیت زہد کی ہے، اور ترکِ دنیا کی ہے ایک طرف تو یہ ہے نبوت کی شان اور ایک طرف حضرت یوسف علیہ السلام ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں کہ شاہانہ محلات ہیں، تختِ شاہی بچھا ہوا ہے اور جن وانس حاضر ہیں بڑا بھاری دربار ہے اور کرّ وفر اور نبوت موجود ہے، تو نبوت کا تعلق کپڑوں سے نہیں قلب سے ہے، شاہانہ ٹھاٹھ میں بھی نبوت رہ سکتی ہے، اور فقیرانہ لباس میں بھی اسی طرح ولایت شاہانہ لباس میں بھی رہ سکتی ہے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی رہ سکتی ہے، تو ولایت اور بزرگی نام کپڑے کا نہیں ہے، قلب کے تعلق مع اللہ کا نام بزرگی ہے، کہیں چولے میں ہوتی ہے ریاست کے اور کہیں چولے میں ہوتی

ہے فقر و فاقہ کے، عوام یوں سمجھتے ہیں کہ بزرگ وہ ہے جو فاقہ مست ہو، نہ لباس پاس، کپڑے پھٹے ہوئے اور پرانے وہ بزرگ ہے، لیکن خواص سمجھتے ہیں کہ بزرگی کپڑوں کا نام نہیں، قلب کا تعلق اگر اللہ سے صحیح ہے مضبوط ہے نسبت مضبوط ہے وہ بزرگ ہے، لباس کچھ ہی پہن لے، غرض انبیاء علیہم السلام کی شانیں بھی الگ الگ ہیں کہ ٹھاٹھ بھی ہیں اور فقر و فاقہ بھی ہے، اولیاء کی بھی یہی شانیں ہیں۔

دنیاداروں پر مالدار انبیاء اور اولیاء کے ساتھ حجت قائم ہوگی...... حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن جب اہل دولت حاضر ہوں گے اور ان کی غفلتیں پیش کی جائیں گی کہ تم نے یہ کیوں نہیں کیا؟ وہ عذر پیش کریں گے کہ آپ نے ہمیں دولت دی تھی کاروبار دیا تھا، اب اس میں لگتے یا ہم مسجد میں بیٹھتے، اس میں لگتے یا ہم نمازیں پڑھتے اور فرائض ادا کرتے، آپ کی دی ہوئی نعمت تھی اس میں لگ گئے، اس میں لگنے سے فرائض رہ گئے تو نظیر میں ایسے اہل اللہ کو اور انبیاء علیہم السلام کو پیش کیا جائے گا جن کو سلطنتیں دی گئی تھیں، فرمائیں گے کہ سلطنت کے کاروبار میں رہ کر بھی ان کی عبادت میں فرق نہیں آیا اور چند ہزار روپے لے کر تمہاری عبادت میں فرق آگیا، ان میں فرق کیوں نہیں آیا؟ یہ بھی تو انسان تھے تو ان لوگوں پہ حجت تمام کی جائے گی، بہر حال حاصل یہ ہے کہ بزرگی نام قلب کی صفت کا ہے، بزرگی نام لباس کا نہیں ہے، پیسہ کا نہیں، پیسہ کمانے کا نہیں۔

اس لیے شریعت یہ نہیں کہتی کہ کہ تم کمانا چھوڑ دو، پیسہ تمہارے ہاتھ میں نہ رہے یہ نہیں کہتی، سب کچھ کرو، تم تجارت بھی کرو زراعت بھی کرو اور اللہ تمہیں لکھ پتی بنائے تو لکھ پتی بھی بنو اور کروڑ پتی بنائے تو کروڑ پتی بھی بنو، مگر قلب کا ناس مت مارو اس کا تعلق اپنے مالک کے ساتھ قائم رکھو، اور یہ سمجھو کہ ہم اس دولت کے حق میں امین ہیں، ہم خزانچی ہیں، تو خزانچی اتنا ہی خرچ کرے گا جتنا مالک آرڈر دے گا، خزانچی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر جتنا چاہے خزانے کو لٹا دے، یا دبا کر بیٹھ جائے، ایک پائی نہ دے، وہ انتظار کرے گا، مالک کس کے لیے کہتا ہے۔

مالک نے کہا دس ہزار اسے دے دو، خزانچی کا فرض ہے دے دے، مالک کہے گا فلاں کو مت دو تو روک لے گا، اس لیے کہ خزانچی مالک نہیں ہے وہ تو امانت دار ہے مالک وہ ہے جس کی رقم ہے، اس لیے جتنی بھی دولت ہمارے ہاتھ میں ہے حقیقتاً مالک حق تعالیٰ ہیں، ہم امین ہیں، وہ یوں کہیں کہ اس طرح خرچ کرو اسی طرح خرچ کرنا پڑے گا۔

ایک غریب بیوہ آئی آرڈر دیا گیا کہ خرچ کرو، اور سینما تھیٹر سامنے آگیا تو آرڈر یہ ہے کہ ہرگز ایک پائی خرچ نہ کرو، ورنہ تمہارا حرام خرچ ہوگا، لہو ولعب میں مت خرچ کرو، طاعت وعبادت میں خرچ کرو، مالک کو حق حاصل ہے جہاں چاہے خرچ کرائے ہم کون ہیں کہ اپنے ارادے سے خرچ کریں! اپنی مرضی سے خرچ کریں! مرضی مالک کی چلے گی، تو اہل اللہ باوجود مالدار ہونے کے ان کی نگاہ اصل مالک پر رہتی ہے کہ ان کا حکم کیا ہے! اس کے مطابق ہم چلیں، بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کمائیں بھی، آپ لکھ پتی بھی بنیں مگر اپنے غریب بھائیوں کو

نہ بھلائیں، خدمتِ خلق آپ کا شیوہ ہونا چاہئے، اگر کوئی نادار ہے تو آپ اس کو سہارا دیں، کوئی پریشان حال ہے تو آپ قال سے حال سے اس کو سہارا دیں، کہ اس کی پریشانی رفع ہو، اگر دو کلمہ کہہ کر آپ تسلی دے سکتے ہیں تو آپ دریغ نہ کریں، چار پیسے خرچ کر کے تسلی دے سکتے ہیں تو خرچ میں دریغ نہ کریں، غرض دامے درمے قدمے سخنے قلمے کسی طرح سے آپ تسلی دیں وہ آپ کے فرائض میں داخل ہے۔

اعلیٰ ترین عبادت...... حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، اعلیٰ ترین عبادت انسان کی کیا ہے؟ ’’اَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللہِ‘‘ سب سے زیادہ محبوب اللہ کو کیا ہے۔ اِلْقَاءُ السُّرُوْرِ فِیْ قَلْبِ کُلِّ مُسْلِمٍ کسی مسلمان کے دل میں خوشی پیدا کر دینا یہ سب سے بڑی عبادت ہے۔ انسان کے لئے کوئی کلمہ ایسا کہہ دیا کہ دل خوش ہو گیا، کوئی خدمت ایسی کر دی کہ آدمی مطمئن ہو گیا، کوئی بات کی اور ڈھنگ ایسا اختیار کیا کہ فرحت پیدا ہو گئی، فرماتے ہیں کہ سب سے بڑی طاعت وعبادت یہ ہے، تو طاعت وعبادت محض مسجد ہی میں نہیں، یہ بھی طاعت وعبادت ہے: ’’اِلْقَاءُ السُّرُوْرِ فِیْ قَلْبِ کُلِّ مُسْلِمٍ‘‘ کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کی فضیلت بیان کی کہ صدقہ دینے میں یہ فضیلت ہے، یہ برکت ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر پیسہ پاس نہ ہو؟ فرمایا پیسہ پاس نہیں ہے تو چند کلمے ہی خیر کے کہہ دو وہ بھی تمہارے حق میں صدقہ ہو گا تو عرض کیا کہ اگر کہنا بھی نہ آتا ہو؟ فرمایا کم سے کم تکلیف مت پہنچاؤ، یہ بھی تمہارے حق میں صدقہ ہے غرض خدمت مسلم خدمتِ خلق اللہ یہ بڑا اہم فریضہ قرار دیا گیا ہے مسلمان کا، یہ ایمان کا ایک بٹہ دو ہے، آدھا حصہ ایمان کا خدمتِ خلق ہے اور آدھا حصہ تعظیم الامر اللہ ہے اس لیے میں نے عرض کیا کہ سب سے بڑی بنیاد تعلق مع اللہ ہے کہ اس کے بغیر قلبی سکون نہیں مل سکتا اور دوسری چیز کی بنیاد تعلق مع اللہ ہے کہ بغیر ایثار کے بغیر خدمت کے یہ چیز نہیں بن سکتی۔

تربیت نفس کے درجات...... اب تیسری چیز یہ ہے کہ اپنے نفس سے کیا تعلق ہے! تو بھئی نفس جو ہے یہ شرور کا منبع ہے یعنی ہر برائی نفس سے ابھرتی ہے، ہر بداخلاقی نفس سے ابھرتی ہے تو نفس درحقیقت آدمی کا دشمن ٹھہرا، اور یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ خود حدیث میں فرمایا گیا ہے، فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے: ’’اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ الَّذِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ‘‘ ① تمہارا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان بیٹھا ہوا ہے، یعنی تمہارا نفس ہے، مثل مشہور ہے ہمارے یہاں، اپنا آپا دشمن ہوتا ہے کوئی کسی کا دشمن نہیں تو نفس درحقیقت دشمن ہے اس لیے کہ جتنی ذلت اور رسوائی متعلق ہے وہ نفس کی خواہشات سے متعلق ہے نفس کی خواہشات کو روک دیں، ذلت نہیں ہو گی، آپ بازار میں گئے اور دیکھا کہ دکان پر بڑی عمدہ مٹھائیوں کی لگن لگی ہوئی ہے، کھانے کا جی چاہا نفس نے چاہا کہ مٹھائیاں کھاؤں اب ظاہری بات ہے کہ پیسہ تو ہاتھ پلے تھا نہیں آپ نے جلدی سے جھپٹا مارا اور بھاگے

① کنز العمال، باب الجهاد الاكبر من الاكمال ج:۴ ص:۴۳۱ رقم:۱۱۲۶۳۔ علامہ عجلونیؒ فرماتے ہیں: رواه البيهقي في الزهد باسناد ضعيف وله شاهد من حديث انسؓ.... دیکھئے: كشف الخفاء ج:۱ ص:۱۴۳۔

اور دکاندار اٹھ کر آپ کے پیچھے، آپ نے جلدی سے کچھ منہ میں رکھا اور کچھ جیب میں رکھا یہاں تک کہ اس نے آ کے پکڑا اور جوتیاں مارنی شروع کیں اور پولیس آ گئی معلوم ہوا کہ یہ تو جھپٹا مار کر غصب کر کے لے گئے تھے تو مقدمہ چلا جیل گئے، مار پٹائی ہوئی جیل گئے اور ذلیل ہوئے۔

کس نے ذلیل کیا؟ اس نفس کی خواہش ہی نے تو کیا، اور اگر اللہ کی مرضی پر اور عقل پر چلتے تو عقل یہ کہتی تھی کہ غیر کے مال پر بلا اس کی مرضی کے ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے، دیکھنا بھی مناسب نہیں تھا، نگاہ نیچی کر کے جاتے وقار کا تقاضا یہ تھا، یہ کر کے جاتے تو دکاندار کے دل میں بھی عزت ہوتی، گورنمنٹ کے دل میں بھی عزت ہوتی کہ باوقار آدمی ہے۔ معلوم ہوا کہ نفس کی پیروی کرنے میں ذلت ہے اور نفس کے خلاف کرنے میں عزت ہے، نفس نے خواہش کی جذبہ آ گیا کہ مار کھاؤ پٹائی ہو لہٰذا مار کٹائی شروع ہو گئی اور عقل یہ کہتی تھی صبر وتحمل سے کام لو یہ موقع نہیں ہے، عقل کی سنتے تو وقار بڑھ جاتا، مار پٹائی شروع ہوئی تو بلوہ قائم ہو گیا اور مقدمہ بازی، ذلت اور رسوائی شروع ہوئی، تو جتنا آدمی نفس کی پیروی کرے گا اتنا ہی ذلت میں پڑے گا، ہاں البتہ اس نفس کو اگر آپ نے سدھا کر تربیت سے مزکیٰ اور مصفّٰی بنالیا اب اس نفس کے اشاروں پر چلیں کوئی مضائقہ نہیں تو نفس ابتدا میں نفسِ امارہ ہوتا ہے، ہر برائی کا حکم دیتا ہے اور اخیر میں جا کر بنتا ہے نفس مطمئنہ، جب وہ مطمئن ہو جائے اللہ کی تقدیرات پر، تو ابتدائی حالت میں نفس کی پیروی ذلت اور رسوائی ہے اور نفس کو مطمئن بنا کر اس کی پیروی کرنا وہ حق کی پیروی ہوگی، کیونکہ نفس مطمئن وہی چاہے گا جو اللہ چاہتا ہے، اس میں ذلت نہیں بلکہ عزت ہوگی اس کا انجام یہ ہے:

﴿ يَـاَيَّتُهَـا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً o فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ o وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴾ اے نفس مطمئنہ! يَـاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ لوٹ اپنے پروردگار کی طرف، تو ادھر سے گیا تھا پیدا ہو کر لوٹ اپنے رب کی طرف ﴿ اِرْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ ﴾ کس حالت میں؟ ﴿ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴾ تو اللہ سے راضی اللہ تجھ سے راضی ﴿ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ o وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴾ (1) میرے خاص بندوں میں داخل ہو، میری جنت میں جا داخل ہو۔ تو ایک نفس مطمئنہ ہے جو تابع حق بن جاتا ہے اس کی مرضی پر چلنا حق کی مرضی پر چلنا ہے اور ایک نفس امارہ ہے جس کے اندر برائی ہے ابھی تربیت نہیں ہوئی، اس کی مرضی پر چلنا ذلت اور رسوائی کی راہ پر چلنا ہے، تو نفس کو مُزکیٰ کیا جائے محنت سے عبادت سے ریاضت سے، اور وہ پاک صاف بن جائے، اولیاء کا نفس ہو جائے، انبیاء علیہم السلام کے نفس کے نقشِ قدم پر چلنے لگے، وہ فی الحقیقت حق پر راضی ہوتا ہے، بلکہ حق کی مرضی اس میں ہوتی ہے۔

یہی وہ مقام ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "دَارَ الْحَقُّ مَعَهٗ حَيْثُ دَارَ" حضرت عمرؓ کی شان فرمائی کہ جدھر عمرؓ جھکتے ہیں حق بھی ادھر جھک جاتا ہے، بظاہر تو یہ سمجھ میں آتا تھا کہ جدھر حق چلتا ہے حضرت

(1) پارہ: ۳۰، سورۃ: الفجر، الآية: ۲۷-۳۰.

عمرؓ ادھر جھکتے ہیں اور کہا جا رہا ہے جدھر کو حضرت عمرؓ چلتے ہیں ادھر کو حق چلتا ہے تو ایک مقام ہے مبتدی کا اور ایک مقام ہے منتہی کا، مبتدی کا مقام تو یہ ہے کہ جدھر حق چلے ادھر کو یہ چلے تابع بنے اور جب کمال کی انتہا کو پہنچ جائے تو پھر حق ادھر کو چلے گا جدھر کو یہ چلے گا، اس لیے کہ اتنا پاک بن جائے گا کہ اس کے اندر جو مرضی آئے گی وہ مرضی حق ہوگی، نفس کی ہر خواہش حق کے مطابق ہوگی، خلاف ہو نہیں سکتی جدھر یہ چلے گا حق ادھر کو جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جس کو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی شان عجیب ہے "اِنَّ رَبَّکَ یُسْرِعُکَ فِیْ ھَوَاکَ" ①

آپ کا پروردگار آپ کے نفس کی خواہش پوری کرنے میں اتنی جلدی کرتا ہے کہ ادھر دل میں آیا کہ یہ ہوا ادھر ہوگئی وہ چیز۔ تو یہ وہی مقام ہے انتہائی کہ جدھر نفس چلے گا حق ادھر چلے گا اس لیے کہ نفس فنا ہوگیا ہے حق کے اندر تو اس میں کوئی خواہش ابھرے گی ہی نہیں خلافِ حق اور جب حق کے مطابق خواہش ابھری تو حق ہی چلا ادھر ہی شان حضرت عمرؓ کی فرمائی گئی۔ "دَارَ الْحَقُّ مَعَهٗ حَیْثُ دَارَ" حق بھی ادھر کو ہی گھوم جاتا ہے جدھر کو عمرؓ گھومتے ہیں، یہ انتہائی مقام ذکر کیا گیا ہے جو سالک کا انتہائی مقام ہے، نفس اتارہ اور مبتدی کا مقام یہ ہے کہ جدھر کو حق چلے جی چاہے یا نہ چاہے اس کی پیروی کرے تب جا کر اس کے اندر صفائی پیدا ہوگی، تب جا کر اس کے اندر جلا پیدا ہوگی تو نفس بہرحال اپنی ابتدائی حالت میں آدمی کا دشمن ہے "اِنَّ اَعْدٰی عَدُوِّکَ الَّذِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ" تمہارے دو پہلوؤں میں جو بیٹھا ہے وہ ہے تمہارا دشمن، تو جتنی مصیبتیں آتی ہیں وہ اس نفسِ امارہ کی خواہشات پوری کرنے پر آتی ہیں حقیقت میں یہ بنیاد ہوتا ہے، ظاہر میں آپ کچھ عذر پیش کریں کہ فلانے نے مجھے مارا فلاں نے ظلم کیا، حقیقت میں ظلم آپ نے خود کیا دوسرا ذریعہ بنا اس ظلم کا قرآن کریم میں بھی یہی ہے کہ قیامت کے دن یہی کہا جائے گا ﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ ② اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا یہ تو آدمی نے خود اپنے نفس پر ظلم کیا۔

تو آدمی ظالم اپنے نفس کے لئے خود بنتا ہے دوسروں پر وبال خواہ مخواہ وہ ڈالتا ہے، اور اس کی مثال بالکل ایسی واضح ہے کہ ایک شخص کو مثلاً پھانسی دی گئی اس کی لاش ٹنگی ہوئی تھی تو چند عقلاء جمع ہوئے کہ بھئی اس کی موت کا سبب کیا ہوا؟ ایک نے کہا کہ کھلا سبب موجود ہے گلے میں پھندا پڑا ہوا ہے، پھندا پڑنے سے سانس گھٹ گیا، موت واقع ہوگئی، دوسرے نے کہا تم نہیں سمجھے اصلیت، پھندا خود بخود تھوڑا ہی پڑ گیا اصل میں اس کی موت کا سبب وہ تختہ ہے جو پاؤں کے نیچے تھا، وہ بھنگی نے کھینچ لیا تو پھندا پھنسا اور پھندا پھنسا تو جان نکل گئی، تو موت کا سبب پھندا نہیں بلکہ تختہ ہے، تیسرے نے کہا کہ تو بھی بے وقوف احمق ہے، تو بھی نہیں سمجھا تختہ کیسے مٹ گیا وہ تو بھنگی نے سرکایا ہے، جب

① الصحیح لمسلم، کتاب الرضاع، باب جواز هبتها نوبتها لضرتها ج:۷ ص:۳۸۵ رقم:۲۶۵۹.

② پارہ:۱۴، سورة: النحل، الآية:۳۳.

بھنگی نے تختہ کھینچا تو پھندا لگا اور پھندا لگنے سے سانس گھٹا اور موت واقع ہوئی، تو موت کا سبب نہ پھندا ہے نہ تختہ ہے بلکہ بھنگی ہے، چوتھے نے کہا تو بھی بے وقوف ہے بھنگی کو کوئی ذاتی عداوت تھی کہ خواہ مخواہ اس نے تختہ کھینچ لیا مجسٹریٹ کا حکم اسے ملا تھا اس آرڈر کے سبب سے بھنگی نے تختہ کھینچا اور تختہ کھینچنے سے پھندا پڑا پھندا پڑنے سے جان نکلی تو موت کا سبب، مجسٹریٹ کا حکم ہے، پانچویں نے کہا تم بھی اصلیت کو نہیں پہنچے، مجسٹریٹ کو کوئی ذاتی عداوت تھی، کوئی عداوت تھوڑی ہی تھی، اس کو اصل میں مجسٹریٹ نے اس لیے حکم دیا کہ اس نے قتل ناحق کیا تھا، اور پیشتی ثابت ہو گیا کہ یہ قاتل ہے، مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ اسے بھی پھانسی دے دو تو موت کا سبب یہ خود ہے، نہ مجسٹریٹ ہے نہ بھنگی ہے نہ تختہ ہے، نہ پھندا ہے اصل میں یہ خود ہے موت کا سبب، تو جتنا بھی آدمی کے اوپر وبال آتا ہے وہ کسی کو بھی سبب بنائے کسی پر بھی اس کا وبال ڈالے حقیقت میں انجام کار نکلے گا کہ وہ خود ظالم ہے اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

تعلیم و تربیت کے آثار...... تو اس نفس ظالم کو اگر آپ عادل بنا دیں اور بے رُخ ہو کر عدل پیدا کر دیں وہی نفس کامل ہو جائے گا، اسی کو کامل بنانے کے لیے شریعتیں آئیں کہ نفس کا ظلم ہٹا کر اس میں عدل پیدا کیا جائے، نفس کا جہل مٹا کر اس میں علم پیدا کیا جائے، ایک طرف تعلیم کا سلسلہ جاری ہو جس سے علم آئے ایک طرف تربیت کا سلسلہ جاری ہو جس سے اعتدال عمل اور اخلاق میں پیدا ہو، دنیا کی چیزیں تعلیم اور تربیت نکل آئیں جس قوم میں تعلیم نہیں ہے یقیناً تنزل اور پستی میں گرے گی، دنیا کی کوئی قوم بھی عروج نہیں پا سکتی جب تک کہ اس کے اندر تعلیم اور ٹریننگ نہ ہو، کوئی دنیا کو مقصد بنا لے تو دنیاوی تعلیم لے گا، دنیوی طور پر ٹریننگ کرے گا، کوئی دین کو مقصد بنا لے تو دینی تعلیم لے گا، دینی تربیت حاصل کرے گا، بہر حال جو قوم تعلیم میں نہیں پڑتی وہ ذلت اور رسوائی کی طرف جاتی ہے۔

اس لیے کہ دل و دماغ بنانے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے، تعلیم سے جس طرح چاہو ڈھال دو دل و دماغ کو اچھی تعلیم دو گے اچھے بن جائیں گے دل و دماغ کو بری تعلیم دو گے برے بن جائیں گے، جب انگریزوں کا ابتدائی تسلط ہوا ہندوستان میں تو مسلمانوں کو عام طور سے تنفر تھا اور نفرت کی بناء بھی ظاہر تھی کہ ان کے ہاتھ سے حکومت چھیننے والے تو انگریز ہی تھے، تو ان کے دل میں کب گنجائش ہو سکتی تھی، ایک تنفر قائم تھا اس کے لاکھ جتن کیے کہ نکل جائے نفرت نہیں نکلی، میکالے نے تدبیر بتائی کہ میں تعلیم سکیم لے کر چلتا ہوں، اس تعلیم سے ان کے دل و دماغ بدل دو تو نفرت آپ ہی نکل جائے گی، پھر تو تمہارا کلمہ پڑھیں گے تو تعلیم سکول اور کالج کی شروع ہوئی، اب اس نے اعلان کیا کہ ''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں فکر اور دل و دماغ کے لحاظ سے فرنگستانی ہوں'' تو تعلیم کامیاب ہوئی دل و دماغ بدل گئے اور اس درجہ بدلے کہ نظریات ہی بدل گئے، قلوب کا رخ ہی بدل گیا پھر وہ ہر چیز انگریز ہی کی پسند کرنے لگے، تو غلط طریق ہوا کہ انگریزوں کی جو صنعت و حرفت تھی، ترقیات تھیں ٹیکنیکل ترقیات اور مکینکل ترقیات وہ عملی چیزیں حاصل کرتے مگر نظریات اسلامی قائم رکھتے، الٹا کر دیا کہ نظریات تو ان کے لیے اور عملیات ان کے ترک کر دیئے تو پستی میں پڑ گئے، دین کے لحاظ

سے بھی دنیا کے لحاظ سے بھی، دنیوی ترقیات میں ان کے طریق عمل کو لیتے اور نظریات واعتقادیات دین کے مطابق رکھتے الناقصہ کردیا کہ تعلیم پا کر نظریات تو وہ ہوگئے جوان کے تھے اور عمل اپنا ختم ہوگیا کہ ان کے عمل سے کوئی عبرت نہ پکڑی بہرحال میکالے نے یہ ایک اعلان کیا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں۔

اس وقت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ یہ بزرگ کھڑے ہوئے انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی اور اس کے تحت میں ہزارہا مدارس ملک میں قائم کیے اور انہوں نے بھی اعلان کیا کہ :''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں فکر اور دل ودماغ کے اعتبار سے عربستانی اور اسلامستانی ہوں۔'' تو ایک کنبہ کو بچالے گئے ورنہ بہہ پڑا تھا یہ سیلاب اور پورا ہندوستان بہہ جاتا،مگر ایک بڑا کنبہ بچ گیا ان لوگوں کے اعلان سے۔

تعلیم بقاءِ مذہب کا ذریعہ ہے......انہوں نے دینی مدارس کا جال پھیلا دیا جس سے آج ہم اور آپ اسلامی صورت لیے ہوئے ہیں، اسلام کا نام لیتے ہیں، اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ہندوستان میں مدارسِ دینیہ نہ ہوتے تو شرک وبدعت کے سوا ہندوستان میں کچھ نہ ہوتا کوئی مسئلہ بتانے والا نظر نہ آتا، یہ ان مدارس اور ان علماء کے طفیل ہے کہ آج مسئلہ بتلانے والے موجود ہیں، تو دین کا تحفظ مذہب کا تحفظ اس کی تعلیم کے تحفظ سے ہوتا ہے جس مذہب کی تعلیم گم ہوجاتی ہے وہ مذہب گم ہوجاتا ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ ضروری ہمارے انگلستانی بھائیوں کے لیے یہ ہے کہ اگر وہ اپنے دین کو سنبھالنا چاہتے ہیں تو اپنا تعلیمی نظام درست کریں ایسے مدارس قائم کریں کہ جن میں اللہ اور رسول کا قانون ان کے ذہنوں میں جمے وہ دوسری تعلیم بھی پائیں اس سے کوئی انکار نہیں ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ سائنس حاصل نہ کریں آپ فلسفہ حاصل نہ کریں سب کچھ حاصل کیجئے، مگر اپنی بنیاد تو قائم کرلیجئے، بنیاد آپ اپنی قائم نہ کریں اور دوسرے کی بنیاد پر آپ تعمیر کریں تو کل کو وہ کہہ سکتا ہے کہ زمین میری ہے ملبہ اٹھاؤ یہاں سے، آپ کے ہاتھ میں نہ زمین رہے گی نہ ملبہ رہے گا، لیکن اگر آپ کی بنیاد اپنی ہے اور تعمیر کر رہے ہیں تو دوسرے کی مجال نہیں ہے کہنے کی کہ ملبہ اٹھاؤ زمین میری ہے، آپ کہیں گے زمین ہماری ہے، اپنی بنیاد پر قائم ہوجائے پھر دوسرے کی ترقیات سے چیزیں لیجئے، کوئی مضائقہ نہیں ہے، اسلام کوئی مانع نہیں ہے، وہ بنیاد تو قائم کیجئے، اور بنیاد بلاشبہ قائم ہوتی ہے تعلیم سے، نہ پروپیگنڈہ سے قائم ہوتی ہے نہ کسی اور سلسلہ سے دل ودماغ کی تعمیر ہمیشہ تعلیم نے کی ہے، تو تعلیم کا نظام مضبوط کیجئے، مدارس قائم کیجئے علماء پیدا کیجئے جب تک پیدا نہ ہوں بلایئے علماء کو ان کو رکھیئے، ان کے ذریعے سے علماء بنایئے، یہاں سے بچے بھیجئے کہ وہ عالم بن کر آئیں اور دین کی تعلیم دیں جب تک یہ سلسلہ نہیں کریں گے تعمیر ممکن نہیں ہے آپ کے دل ودماغ اور ذہن نہیں بنے گا آپ کا ذہن تو بنتا ہے تعلیم سے، آج میں تقریر کر رہا ہوں، تقریر کرنے سے فائدہ ہے، ضرور ہے کچھ بھولا ہوا سبق یاد آجائے گا، لیکن

ذہن بن جائے وہ تو تربیت سے بنے گا، تقریریں ذہن نہیں بناتیں وہ تو بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہیں، لیکن سبق پڑھانا یہ مقرر کا کام نہیں یہ معلم کا کام ہے کہ سبق پڑھا کر دل میں جمائے ایک چیز کو اور تربیت کر کے اس کو ابھارے، یہ مربی کا اور معلم کا کام ہے۔

عبادت بلا علم...... تو جب تک آپ اپنا تعلیمی نظام درست نہیں کریں گے نہ تعلق مع اللہ صحیح ہوگا نہ تعلق مع الخلق صحیح ہوگا نہ تعلق مع النفس صحیح ہوگا تینوں تعلقات کی اُستواری جبھی ہوگی جب قرآن وحدیث کی تعلیم آپ کے اندر عام ہو، قرآن سے مسائل بھی آپ حاصل کریں، دلائل بھی آپ حاصل کریں، فضائل بھی آپ حاصل کریں، حدیث کے مضامین لیں، فقہ سے استفادہ کریں، سلف کا اتباع کریں دل بن جائے گا، ذہن بن جائے گا، اس واسطے تعلیم وتربیت انتہائی ضروری ہے اور اسی پر مبنی ہے، ان تینوں تعلقات کا درست ہونا خواہ تعلق مع اللہ ہو یا تعلق مع الخلق ہو یا تعلق مع النفس ہو، یہ نفس دشمن قابو میں نہیں آسکتا، جب تک کہ اس کی چالوں اور داؤ سے واقف نہ ہوں آپ اس کی مکاریوں سے کیسے واقف ہوں، وہ شریعتِ اسلام سکھلائے گی، حدیث میں فرمایا ہے کہ: **فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ** [1] ایک عالم دین سمجھدار شیطان پر بھاری ہے ہزار عابدوں سے۔

ہزار عابد عبادت کر رہے ہیں مگر دینی علم یا بصیرت نہیں تو ان پر شیطان بے ڈھانتی سوار ہو جائے گا، اس لیے کہ اس کے داؤ بھات سے واقف نہیں ہے، لیکن ایک عالم کے سر پر سوار ہوگا تو وہ ایک راستے سے آئے گا، وہ دس رستوں سے اس کی کاٹ کر دے گا، اس لیے کہ علم رکھتا ہے، نفس ہی کسی عالم کا مغلوب ہو جائے اور خود نفسی میں مبتلا ہو وہ تو الگ بات ہے لیکن راستہ بند نہیں ہوگا، عابد نیک نیتی سے شیطان کے راستوں پر چلے گا، اس لیے کہ اس کے مکروفریب سے واقف نہیں، عالم اگر چلے گا نفسانیت سے چلے گا، مگر راز سے واقف ہے، کاٹ کا راستہ جانتا ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ **فَقِيْهٌ وَّاحِدٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ** ایک فقیہ، ایک دین کا عالم ہزاروں عابدوں سے بھاری ہے شیطان پر۔ اور وہ اس لیے بھاری ہے کہ ایک عالم اپنے علم اور تعلیم سے دل ودماغ کو بنا دیتا ہے، واقف کر دیتا ہے شیطان کے مکر سے اور اس کے راستوں سے کہ یہ مداخل ہیں جن سے داخل ہوتا ہے، اور یہ مخارج ہیں جن سے دھکیلا جاتا ہے شیطان کو اگر وہ قادر ہو جائیں اور عابد پر وہ بے ڈھانتی سوار ہوتا ہے اس لئے کہ وہ بے چارہ عبادت میں لگا ہوا ہے، مگر مکروفریب کے راز سے اور اس کی کاٹ سے واقف نہیں، تو نیک نیتی کے راستے اسے تباہ کر دیتا ہے۔

احادیث میں ایک واقعہ آتا ہے، سیر کی کتابوں میں ہے، حدیث کی متداول کتب میں تو نہیں ہے، سیر کا کہو تاریخ کا کہو کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا، زاہد تھا اور بہت بڑا عابد اور رہبان تھا، مگر نہایت عبادت گزار، رات دن مصروف اور اس کی جھاڑ پھونک میں بھی اثر تھا، ہزاروں آدمی اس کے پاس آتے اور کوئی پانی پڑھوا کر کوئی تعویذ لکھوا کر

[1] السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ج: ۹ ص: ۲۹۵.

لے جاتا اور لوگوں کو فائدہ ہوتا، دو حقیقی بھائی تھے جن کو ایک تجارتی سفر پیش آیا اور ان کی ایک بہن تھی جوان، انہوں نے کہا کہ اس جوان بہن کو کس کی نگرانی میں دیں، رائے یہ ہوئی کہ اس عابد اور رہبان کی نگرانی میں دے جاؤ وہ دونوں بھائی حاضر ہوئے، اور ادب سے عرض کیا کہ ہماری بہن جوان ہے اسے آپ نگرانی میں لے لیں۔

فرمایا یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا کسی اور کے سپرد کرو میں خانقاہ کا بیٹھنے والا ہوں، میں عورت کی نگرانی کیسے کروں گا، مجھ سے نہیں ہوگا، انہوں نے منت کی، کہا یہ ممکن نہیں میں نہیں رکھوں گا وہ چار پانچ دن لگے رہے غرض منت خوشامد کر کے راضی کرلیا کہا اچھا میں اس طرح سے راضی ہوں کہ اس خانقاہ میں جو سب سے کنارے کا حجرہ ہے، اس میں اپنی بہن کو چھوڑ کر تالی باہر ڈال دو، اندر سے بند کرلے، میرا کام اتنا ہوگا کہ میں سیڑھیوں پر کھانا رکھ آؤں گا وہ اٹھا لے جایا کرے گی، برتن وہاں رکھ دے گی میں برتن اٹھا لوں گا، اس سے زیادہ میرا کوئی واسطہ نہیں، انہوں نے کہا بس اتنا کافی ہے، بس آپ کی نگرانی میں ہے، چنانچہ یہ ہوا وہ اس حجرے میں چھوڑ گئے، یہ عابد کھانا لے کر جاتا اور سیڑھیوں پر رکھ آتا وہ کھا پی کر برتن سیڑھیوں پر رکھ دیتی، یہ اٹھا لاتا، یہ روز کا معمول ہوگیا، برس دو برس اس میں گزرے تو شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ تو بڑی بے عزتی کی بات ہے کہ وہ تیری مہمان ہے تو اچھوتوں کی طرح سے کھانا رکھ آیا اور برتن اٹھا لیے اور لے آیا یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے اچھوت اقوام میں سے ہو کہ اس کے سائے سے بھی بچنا اس مہمان کے دل پر کیا گزرے گی، یہ بری بات ہے کم سے کم کھانا اسے خود پکڑا دینا چاہئے، یہ نہیں کہ سیڑھیوں پر رکھ آیا وہ بے چاری لے گئی، نیک نیتی سے یہ خیال جمایا۔ اب یہ کیا اس نے کہ بجائے سیڑھی پر رکھنے کے دستک دی وہ عورت آئی اس کے سپرد کر دیتا وہ لے جاتی برتن لینے آتا وہ عورت برتن دے دیتی ایک آدھ سال اس میں گزرا، اس کے بعد شیطان نے پھر وسوسہ ڈالا، یہ بھی احترام پورا نہیں ہے، مہمان کی بات تو جب ہے کہ کم سے کم میزبان ساتھ تو کھاوے، اگر ساتھ نہ کھاوے تو کم سے کم اس وقت تک پاس تو بیٹھا رہے جب تک وہ کھانا کھائے تا کہ اسے معلوم ہو کہ میری کچھ آؤ بھگت میری کچھ مدارت ہوئی، اب یہ خیال جما تو بجائے اس کے کھانا پکڑا دے کھانے کا دستر خوان بچھاتا اور وہ کھاتی رہتی اور اس کے بعد یہ برتن لے کر آتا، اس کے بعد ایک دوسرا وسوسہ یہ پیدا ہوا کہ میزبان کا حق تو یہ ہے کہ ساتھ کھائے بیٹھ کر یہ تو یہ معنی ہوگئے کہ گویا مہمان کوئی اچھوت ذات ہے کہ اس کے پاس کے کھانے کو بھی ہاتھ نہ لگائے، یہ بڑی بے عزتی کی بات ہے کم سے کم مل کر کھانا تو کھالینا چاہئے۔ عرب میں تو عام دستور ہے کہ اگر دستر خوان بچھ جائے تو پہلے میزبان ابتدا کرتا ہے، مہمان ہاتھ نہیں ڈالتا جب تک پہلا لقمہ میزبان نہ کھائے، احترام اسی کو کہتے ہیں، اب اس نے ساتھ مل کر کھانا شروع کیا، اب ظاہر ہے کہ ساتھ مل کر کھانا کھانے میں وقت خلوت بھی میسر ہوئی اور جب کچھ عرصہ بڑھا تو تعلقات بڑھے روابط بڑھے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عابد اس عورت کے ساتھ بدکاری میں مبتلا ہوگیا جب بدکاری میں مبتلا ہوا تو اب سوچا کہ اگر باہر آکر اس نے کہہ دیا تو میری تو ساری زندگی کرکری ہوجائے گی یہ لوگ جو عقیدت مند ہیں کہیں گے کہ یہ تو بڑا بدکار ہے تو

اس نے چھری سے قتل کیا اس عورت کو اور اپنی خانقاہ کے قریب دفن کیا اس کے بعد چند دن کے بعد اس کے بھائی آ پہنچے وہ آئے بہن کو لینے، کہا بہن کہاں ہے، اس نے کہا اس کا تو انتقال ہو گیا اور میں نے دفن کر دیا۔

بھائی بے چارے، بہت روئے پریشان ہوئے مگر جہاں شیطان نے یہ وسوسہ ڈال کر اسے مبتلا کیا تھا، وہاں ان بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال ڈالا کہ اگر وہ مرتی تو دو چار دس آدمی اس کے لیے دعا کرتے کوئی نماز پڑھتا کوئی چرچا ہوتا فلاں کی بہن مری، یہ کیسی موت ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں وہ مر بھی گئی دفن بھی ہوگئی۔ خانقاہ کے جس آدمی سے پوچھتے ہیں اسے کچھ پتہ نہیں ان کے دل میں کھٹکا گزرا، انہوں نے کہا کہ قبر کھود کر دیکھنی چاہئے، قبر جو کھودی تو کٹی ہوئی لاش نکلی، اب ثابت ہوا کہ اس عابد نے مارا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو اطلاع دی گئی، اس عابد کے پیروں میں رسی باندھ کر سارے شہر میں اسے گھمایا اور اس کے بعد اس کو قتل کیا گیا، انتہائی رسوائی اور ذلت ہوئی تو عابد زاہد تھا، مگر علم نہیں رکھتا تھا تو اسی کے رستے سے شیطان نے ورغلایا نیک نیتی کے رستے سے، آج یہ نیک نیتی پیدا ہوئی کہ ساتھ کھائے، پھر نیک نیتی پیدا ہوئی کہ اس کے پاس بیٹھے اور وہ بدنیتی نہیں تھی، مگر نتیجہ نکلا کہ وہ مبتلا ہو گیا، لیکن اگر عالم ہے اور جانتا ہے کہ خلوتِ اجنبیہ حرام ہے صورت دیکھنا بھی نامحرم کی ناجائز ہے اس کے حق میں، اسے نہیں آنا چاہیئے پاس تو بہرصورت اس کا علم اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ نیک نیتی کے لاکھ خیال آتے وہ کہتا کہ نیک نیتی صحیح مگر قواعد شرعیہ کے خلاف ہے نبوت کی تعلیم کے خلاف ہے، یقیناً میں خطا میں مبتلا ہوں گا اور پھر بچ جاتا، لیکن اس بے چارے کو علم تھا نہیں، نیک نیتی تھی عبادت کا جذبہ تھا، اسی جذبہ عبادت میں حسنِ نیت کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تو تعلیم اور علم ہی ہے جو انسان کے دل و دماغ کو بناتا ہے، یہ نہ ہوگا تو مذہب کی جو حدود ہیں، اب اخلاق کے ہر خلق کی ایک حد ہے ہر عمل کی ایک حد ہے، حدود کا پتہ نہیں چل سکتا ان کی وجوہات سامنے نہیں آسکتیں، وہ ذوق پیدا نہیں ہوسکتا اس واسطے تعلق مع اللہ ہو، یا تعلق مع الخلق ہو یا تعلق مع النفس ہو ان تینوں کے لیے تعلیم اور تربیت ضروری ہے اور اس کا نظام قائم کرنا ضروری ہے اور امید یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان کرلیں گے، ہم جب ارادہ کر رہے تھے یہاں آنے کا تو یہ تصور بھی نہیں تھا ہمارے ذہن میں کہ اتنے مسلمان ہوں گے ہم سمجھتے تھے کہ سو دو سو میں کوئی ایک آدھ زلا ملال جائے گا، ماشاء اللہ یہاں بستیاں کی بستیاں ہیں، ہزاروں کی تعداد اور مدارس بھی الحمد للہ قائم کر رکھے ہیں اور سلسلہ جاری ہے اس سلسلہ کو بڑھایا جائے تعلیم مکمل کی جائے۔

دینی ذوق کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی ضروری ہے...... آج ابتدائی تعلیم ہے اس کو بڑھا کر اتنی کیجئے کہ قرآن و حدیث کی تعلیم شروع ہو جائے اور دلوں کے اندر وہ نورانیت اور وہ ذوق پیدا ہو اور اس کے ساتھ آپ دنیوی عصری تعلیم کچھ بھی پائیں اسلام اس میں حارج نہیں ہے، وہ تو اس وقت حارج ہوگا جس وقت کوئی چیز دین کے اندر حارج بننے لگے وہ روکے گا، لیکن جب تک حارج نہیں آپ کوئی بھی فن حاصل کریں مگر بنیاد اپنی قائم کرلیں، تو یہ تین مقصد مجھے عرض کرنے تھے، تعلق مع اللہ، تعلق مع الخلق، تعلق مع النفس، اور یہ آیت اس لیے اختیار

کی کہ اس سے مستنبط ہوتے ہیں تینوں مقاصد، فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ o الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ اے لوگوں عبادت اپنے رب کی کرو۔ معلوم ہوا کہ رب کے ساتھ تعلق بغیر عبادت کے نہیں جڑ سکتا اور عبادت جب تک کہ نسبتِ عبودیت نہ ہو کہ بندہ اپنے کو سمجھے عابد اور اپنے خالق کو سمجھے معبود اور عابد اور معبود کے درمیان کے راستے کے راز کو سمجھے اس وقت تک نسبتِ عبودیت قائم نہیں ہوگی تو ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ سے اور وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے تو نسبت عبودیت نکلتی ہے، لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ o الَّذِىْ خَلَقَكُمْ﴾

تقویٰ کسے کہتے ہیں...... تقویٰ کہتے ہیں نفس کو بچا دینا اس کی خواہشات سے، اگر نفس کی خواہشات پر چل پڑے یہی فجور کہلاتا ہے، اس سے بچ گیا تو اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ اِنْتِهَاءُ النَّفْسِ عَنْ مَرَاغِبِهَا نفس کو روک دینا اس کے مالوفات سے اس کے مرغوبات یہ ہے تقویٰ تو ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ سے تعلق مع النفس کا پتہ چلا اور بیچ میں ہے وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ تم عبادت کرو اس رب کی جس نے تمہیں پیدا کیا، تمہارے آباؤ اجداد کو تمہارے بھائی بندوں کو، تو معلوم ہوا کہ رب کے ساتھ بندگی کرنے میں ہم سب کے سب برابر کے شریک ہیں اور جب کسی ایک مرکز سے سب جڑ جاتے ہیں تو ان کے ساتھ تعلق اور ربط خود بخود قائم ہوگا اور شفقت کا تعلق قائم ہوگا تو ﴿اِتَّقُوْا رَبَّكُمْ﴾ سے تقویٰ نکلا اور وہ ہے بنیاد نفس کی اصلاح کی اور ﴿اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ سے نسبتِ عبوذیت نکلی جو بنیاد ہے، بندے اور خدا کے درمیانی تعلق کی اور وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ساری مخلوق کو ملا کر ایک سے مربوط کرنے کا باہمی ربط نکلا تو تعلق مع الخلق کی طرف بھی اشارہ ہوگیا، اس لیے میں نے یہ آیت پڑھی تھی کہ یہ سارے مضامین صراحتاً الگ الگ آیتوں میں بھی موجود ہیں، لیکن ایک جگہ جڑے ہوئے ہوں بلاغت کے ساتھ کنایہ اور اشارہ سے ہوں وہ زیادہ بلیغ سمجھا جاتا ہے، اس لیے یہ آیت میں نے تلاوت کی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ آیت کی بقدرِ ضرورت کچھ تشریح ہوگئی اس لیے کہ کما حقہ، اس کے علوم کو ادا کرنا یہ تو کسی بڑے عالم کا کام ہے ہم جیسے طالب علم کا کام نہیں ہے، جن کے اندر علم سے زیادہ جہل غالب ہو وہ کیا قرآن کی تشریح کریں گے، لیکن بالا جمال اپنی بساط اور اپنی استطاعت کے مطابق جتنی تفسیر ہوسکتی تھی وہ ایک درجہ میں تفسیر بھی ہوگئی تو حق تو ادا نہیں ہوا قرآن کا اور کون کر سکتا ہے، مگر اپنا حق تو ادا ہوگیا کہ جتنا ہمارا فرض تھا سامعین کا تھا انہوں نے سنا تو ہم نے بھی بول کر حق ادا کر دیا، آپ نے بھی حق ادا کر دیا، اور اس پر عمل نصیب ہو جائے تو ہمارے لیے سعادت ہے اور خوش قسمتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ سب کو علم اور عمل اور حال اور کمال اخلاق کی توفیق عطاء فرمائے اور ہمارے سارے تعلقات حق تعالیٰ درست فرمائے اور شرعی اصول کی ہمیں رہنمائی فرمائے اور علومِ الٰہیہ سے ہمیں بیگانہ نہ رکھے، آشنا بنائے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْ اَمْرِنَاوَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ اَللّٰهُمَّ وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَامَفْتُوْنِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِکَ يَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

آثارِ صحبت اور اس کی ضرورت

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!

تاثیرِ صحبت غیر اختیاری ہے...... ایک حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا ذوق اور رنگ ہے کہ وہ کس طریقے سے زندگی بسر کرتے ہیں، ان کی طبائع کا کیا رنگ ہے، اصل میں مسلمان کو وہ رنگ حاصل کرنا مقصود ہے وہ بغیر صحبت کے حاصل نہیں ہوتا، مثل مشہور ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ انسان کو دیکھ کر انسان رنگ پیدا کرتا اور قبول کرتا ہے، پھر یہ چیز انسان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کائنات کی ہر شے میں صحبت کا اثر قدرتی بات ہے آپ کپڑے میں گلاب کے پھول ڈال کر رکھ دیں تین دن کے بعد نکالیں گے تو پورے کپڑے سے خوشبو آئے گی، محض گلاب کے پھول کی صحبت سے کپڑے نے بھی وہ رنگ و بو قبول کرلیا جو گلاب کے پھول میں تھی، سردیوں میں آپ اون کے کپڑوں میں تمباکو بھر کے رکھ دیتے ہیں کہ کیڑا نہ لگے جب آپ اگلی سردیوں میں نکالتے ہیں تو پورے کپڑوں میں تمباکو کی بھنک سی آتی ہے، تو کپڑے نے تمباکو کا اثر قبو کرلیا، لوہار کی بھٹی میں آپ لوہا ڈال دیں، بیس منٹ بعد آپ نکالیں گے تو لوہا بھی آگ بنا ہوا ہوگا، حتیٰ کہ آگ کی صورت بھی قبول کرلے گا، اس مین اور آگ کے انگارے میں کوئی فرق نہیں ہوگا، کام بھی وہی کرے گا جو انگارا کرتا ہے، محض اس لئے کہ اسے آگ کی صحبت میسر آ گئی اور اس نے اس کا اثر قبول کرلی۔ آپ کسی ایسی بستی میں رہتے ہوں جس کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہو تو قدرتی طور پر مزاج میں رطوبت آ جائے گی، ایسے ریگستان میں رہتے ہوں جہاں میل و میل پانی نہ ہو تو مزاج میں ایک قسم کی خشکی اور گرمی ہوگی، کوہستان میں آپ رہتے ہوں جہاں پتھر ہی پتھر ہوں تو مزاج میں ایک قسم کی خشونت اور سختی ہوگی جیسے پہاڑی لوگوں میں ہوتی ہے، الغرض ہر چیز کا قدرتی طور پر اثر ہے، تو حجارات بھی اثر قبول کرتے ہیں، نباتات بھی اثر قبول کرتے ہیں، حیوانات بھی اثر قبول کرتے ہیں ایک طوطے کو آپ اپنے پاس رکھ لیں چند دن کے بعد وہ ویسے ہی بولیاں بولنے لگے گا، جیسے آپ بولتے ہیں، چاہے سمجھے نہ سمجھے اثر قبول کرلے گا، جو

جانور انسانوں کے پاس مکانوں میں رہتے ہیں، ان میں وہ وحشت باقی نہیں رہتی جو جنگلی جانوروں میں ہوتی ہے، یہ تبدیلی محض صحبت کے اثر سے ہوتی ہے، انس جو انسانیت کا خاصہ ہے اگر کسی انسان کو آپ جنگل میں پرندوں کے پاس چھوڑ دیں، وحشت پیدا ہو جائے گی، انسانوں سے انس باقی نہیں رہے گا، وہ حیوانات کی صحبت کا اثر قبول کرلے گا۔

ذوقِ دین...... الغرض ہر چیز کی صحبت کا ایک اثر ہے، تو دین بھی بہرحال فقط ایک راستے کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک کیفیت ہے ایک ذائقہ ہے ایک مزہ ہے، جب تک اسے استعمال نہ کیا جائے اس کا مزہ نہیں آئے گا، اس لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا مَنْ رَّضِیَ بِاللّٰہِ رَبًا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَسُوْلًا وَّنَبِیًّا ① اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھ لیا جو اللہ سے بحیثیت رب ہونے کے راضی ہو گیا، اسلام سے بحیثیت رسول اور پیغمبر ہونے کے راضی ہو گیا، یعنی ان تمام حیثیتوں سے وہ راضی ہے، اگر اللہ تعالیٰ سے راضی تو ہوا لیکن رب ہونے کی حیثیت ہونے سے نہیں بلکہ فلاسفہ کی طرح علت تامہ ہونے کی حیثیت سے راضی ہوا، اس لئے کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ عالم کے لئے علت تامہ ہیں جیسے سورج دن کے نکلنے کے لئے علت تامہ ہے، علت کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ وہ ارادہ کرے یا نہ کرے، وہ شی اس علت پر مرتب ہوگی، چنانچہ جب سورج نکلے گا تو سورج ارادہ کرے یا نہ کرے دن کا نکلنا لازمی ہے تو سورج کو دن کی علت کہیں گے، وہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ عالم کے لئے علت ہیں۔ جب سے اللہ تعالیٰ ہیں اسی وقت سے عالم چل رہا ہے، جب تک رہیں گے جب تک عالم چلے گا، ان کے ارادہ سے عالم کی پیدائش کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ ان کی ذات سے عالم سرزد ہو رہا ہے وہ ارادہ کریں یا نہ کریں، حتیٰ کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ میں صفات نہیں ہیں، نہ ارادہ ہے نہ مشیت ہے نہ قدرت ہے، بلکہ وہ سورج کی طرح سے ہیں کہ ان کے لئے مخلوقات لازم ہیں وہ ارادہ نہیں کرتے مخلوقات ان سے سرزد ہوتی ہیں جیسے دھوپ آفتاب سے سرزد ہوتی رہتی ہے، بہرحال اللہ تعالیٰ سے اگر کوئی بلحاظ علت ہونے کے راضی ہوا تو وہ مسلم نہیں ہوسکتا، وہ مسلم ہوگا جو اللہ تعالیٰ سے بحیثیت رب ہونے کے بحیثیت خالق ہونے کے، بحیثیت رحمٰن ہونے کے بحیثیت صاحب ارادہ ہونے کے راضی ہو یعنی صفات کو بھی مانے، وہ اللہ تعالیٰ کا ماننے والا سمجھا جائے گا۔

اسی طرح اسلام سے کوئی شخص بلحاظ ایک لاء اور قانون ہونے کے راضی ہو، جیسے آج دنیا میں ہزاروں قانون ہیں، اسلام بھی ایک قانون ہے، چنانچہ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ اسلام ایک لاء اور قانون ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنا کر دیا ہے، جیسے چند قانون دانوں نے بیٹھ کر تعزیرات ہند وضع کرلی ہیں، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضع کر کے قانون مسلمانوں کو دیا ہے تو کوئی شخص اسلام سے بلحاظ قانون ہونے کے راضی ہوا، مگر بلحاظ دین ہونے کے راضی نہیں۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی من رضی باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد نبیاً ج: ۱ ص: ۱۳۷ رقم: ۴۹.

دین اور قانون کا باہمی فرق......اس لئے کہ دین اور قانون میں فرق یہ ہے کہ دین وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ بھیجے اور قانون فقط افعال پر بریک لگاتا ہے، کوئی چوری کرے گا قانون کی دفعہ لگ جائے گی چوری کا فعل بند کر دیں گے، کوئی زنا کرے گا قانون کی دفعہ لگے گی اور جیل بھیج دیں گے تاکہ یہ فعل رک جائے، لیکن قانون سے جذبات پر اثر نہیں پڑتا کہ دل میں بھی زنا و چوری سے نفرت پیدا ہو جائے، دین وہ ہے جو افعال کو بھی روکتا ہے اور دل میں بھی گناہوں اور معصیت سے نفرت بھی پیدا کر دیتا ہے، تو دین ظاہر اور باطن دونوں پر لاگو ہوتا ہے، اور قانون فقط ظاہری افعال پر لاگو ہوتا ہے قلب سے اسے کوئی تعلق نہیں، گھر میں بیٹھ کر کوئی جتنے بھی جرائم کرے حکومت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن اگر گھر میں بیٹھ کر تنہائی میں کوئی جرم کرے گا، دین اسے ٹوکے گا کہ یہ کیا حرکت کی؟ کوئی دیکھنے والا نہیں اللہ تو دیکھ رہا ہے، تو خدا کا قانون انسان کے ظاہر و باطن دونوں پر عائد ہوتا ہے اور دنیوی بادشاہوں کے قوانین فقط ظاہر پر لاگو ہوتے ہیں، افعال کو تو روکتے ہیں مگر اخلاق سے ان کا کوئی تعلق نہیں، تو آدمی میں جب دین آئے گا تو قلب اس کا رنگ قبول کرے گا، اخلاق بھی بدل جائیں گے اعمال بھی بدل جائیں گے۔

مقصدِ دین الفاظِ محض نہیں ذوقِ نبوت پیدا کرنا ہے.....تو دین اسے کہتے ہیں کہ رنگ پیدا کرے اور رنگ بلا صحبت کے پیدا نہیں ہوتا بغیر معیت کے پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نیک لوگوں میں رہیں گے کوئی علم نہ ہو پھر بھی قدرۃً نیکی کے راستے پر چل پڑیں گے، نیک لوگوں کی صحبت کا یہی اثر ہے، بری سوسائٹی میں رہیں گے آپ کو ان کی معلومات حاصل ہوں یا نہ ہوں برے افعال خود بخود سرزد ہوں گے، بری سوسائٹی اور صحبتِ بد کا اثر ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک صحبت کو عطار کی دکان سے تشبیہ دی ہے کہ عطر فروش کی دکان پر کوئی جائے اور عطر نہ بھی خریدے کم از کم دماغ میں خوشبو آ ہی جائے گی آدمی کچھ نہ کچھ معطر ہو کے ہی اٹھے گا، اور بری صحبت کی مثال لوہار کی بھٹی سے دی ہے کہ اگر آدمی اس کی دکان پر چلا جائے تو کپڑوں کو کچھ نہ کچھ سیاہی لگ ہی جائے گی، چنگا ہی لگ جائے گا، ناک کو کچھ بدبو ہی آ جائے گی، الغرض کوئی نہ کوئی مضرت ہی لے کر آئے گا، جیسے عطار کی دکان سے تھوڑی بہت قلبی راحت ہی لے کر آئے گا، نیک کی صحبت میں بیٹھ کر اگر چہ علم بھی نہ ہو، کم از کم دین کا نفع لے کر ہی اٹھتا ہے، اس صحبت کا قدرتی اثر ہے، الغرض دین کا مقصد علم کے الفاظ یاد کرنا نہیں بلکہ وہ رنگ قبول کرنا ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کا رنگ ہے اور سلسلہ بسلسلہ چلا آ رہا ہے، اس لئے صحبت ضروری سمجھی گئی ہے۔

صحبت کا اثر دل پر اور الفاظ کا دماغ پر ہوتا ہے......ایک بات یہ بھی ہے کہ صحبت سے عمل کی امنگ پیدا ہوتی ہے، آپ ہزار نصیحتیں کر لیں آدمی اسے عقلاً اچھا سمجھے گا کہ واقعی بڑی اچھی بات ہے، لیکن دل قبول کرنے کے لئے مجبور ہو جائے، یہ کوئی ضروری نہیں، لیکن نیک عالم یا کسی باخدا کی صحبت میں بیٹھیے وہ کچھ بھی نہ کہے، خواہ مخواہ دل چاہے گا کہ وہ ایسا ہی کرے دل پر دباؤ پڑے گا تو صحبت کا اثر براہ راست جا کر دل پر ہوتا ہے، علم کا اثر دماغ پر ہوتا ہے کہ ایک اچھی چیز سامنے آ گئی، عقلی طور پر اچھی معلوم ہونے لگی، آدمی کرے نہ کرے لیکن صحبت میں عقلاً کچھ سمجھے نہ

سمجھے عمل کرنے کو دل چاہے گا کہ یہ کام کرنے کا ہے، یہ صحبت سے اثر پڑتا ہے اس واسطے صحبت ضروری سمجھی گئی ہے۔

مدارِ دین صحبتِ اہل اللہ ہے...... اور دین کا دارو مدار ہی صحبت ہے، آپ کو معلوم ہے کہ صحابہ کرامؓ کی زندگی سب سے زیادہ اونچی تھی، اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ امت میں کتنا ہی بڑا کوئی غوث، قطب بن جائے، ولایت کے مقامات طے کرے، مگر صحابیت کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا، کیوں؟ اس لئے کہ صحابی صحبت یافتہ کو کہتے ہیں جس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی، اپنی ان آنکھوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلمکے چہرہ مبارک کا دیدار کیا ہو، اپنے اِن کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کلام سنا ہو اور تاثیر کلام نبوت کی اس کے قلب میں ہے اس درجہ میں بعد والوں کے قلب میں نہیں ہوسکتی، جتنا اس کے قلب میں نبوت کی عظمت ہے اتنی دوسرے میں نہیں ہوسکتی، کیونکہ نبوت کو آنکھوں سے دیکھا معجزات کو دیکھا اور سن کر ایمان لائے ہیں دیکھ کر ایمان لائے ہیں، بغرض دیکھنے اور سننے میں بڑا فرق ہے تو صحبت کا اثر ہے کہ صحابہ کرامؓ کا دین اتنا مضبوط ہوگیا کہ عالم میں کسی بھی جماعت میں خواہ کتنی بڑی سے بڑی ہو، وہ مضبوطی دین میں نہیں ہوگی جو حضرات صحابہ کرامؓ کو نصیب ہے یہ محض صحبت کا اثر ہے۔

علم نہیں بدلا صحبت بدلتی رہی...... علم آج بھی وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن وحدیث کا صحابہ کرامؓ کو سکھلایا، لیکن صحبت محفوظ نہیں، راہِ راست وہی مگر وہ رنگ محفوظ نہیں آخر کوئی تو فرق ہے۔؟ چنانچہ حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور ہم تدفین میں مشغول تھے۔ ابھی ہم نے پوری طرح مٹی بھی نہیں دی تھی کہ اَنْکَرْنَا قُلُوْبُنَا قلوب میں دین وایمان کی وہ کیفیت باقی نہ رہی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارک میں ہوتی تھی۔ تو علم تو وہی تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا تھا، اس میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی تھی، مگر صحبت میں کمی آئی تھی جس کو قلب نے محسوس کیا کہ کوئی چیز تھی جو کم یا گم ہوگئی؟

صاحبِ صحبت کے فقدان کے آثار...... مجھے یاد ہے کہ جب حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی وفات ہوئی ایک دم یہ محسوس ہوا کہ وہ جو آثارِ صحبت تھے، ان میں نمایاں کمی ہوئی جو جماعت اہل حق کی اہل اللہ کی، دارالعلوم دیوبند یا مظاہر العلوم سہارنپور کے حضرات پر مشتمل تھی عام طور پر ان سب بزرگوں نے یہ محسوس کیا کہ ایک خاص کیفیت جو نورِ ایمان کی تھی، اس میں کوئی پھیکا پن پیدا ہوگیا ہے۔

اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ جب کوئی ربانی عالم دنیا سے اٹھتا ہے تو عام قلوب دین کی کمی اور رنگ کا پھیکا پن محسوس کرتے ہیں جو قلوب میں قوت ایمانی ہوتی ہے اس میں قدرے ضعف محسوس ہونے لگتا ہے، اسی کو صحابہ کرامؓ فرمارہے ہیں کہ ابھی ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مٹی بھی پوری نہیں دی تھی کہ اَنْکَرْنَا قُلُوْبُنَا کہ قلوب متغیر ہوگئے اور وہ کیفیت باقی نہیں رہی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں تھی، یہ وہی صحبت کی قلت کا اثر تھا یا صحبت کے گم ہوجانے کا اثر تھا۔ بعینہٖ یہی بات حضرات تابعینؒ فرماتے ہیں جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے صحبت یافتہ

ہیں کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم اٹھ گئے تو ہم نے اس عالم کی وہ نبض نہیں دیکھی جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی میں تھی!

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ جب چودھویں صدی شروع ہوئی، حضرت مولانا کی وفات ۱۳۰۱ھ میں ہے، مولانا مزاجاً کچھ مجذوب تھے، تو صدی کے آغاز میں آسمان کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا: اس وقت پوری دنیا میں انوارِ صحابیت گم ہو گئے۔

یعنی اب تک صحابہؓ کا نور محفوظ تھا، خواہ وہ صحابی جنات میں موجود ہوں مگر صحابیؓ دنیا میں موجود تھا، فرمایا اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صحابیت کی نورانیت ختم ہوگئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو جنات سے بہت سابقہ پڑتا تھا کہ کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی جنات میں موجود ہو اس کی برکات وانوار پورے عالم میں چھائے ہوئے تھے فرمایا آج وہ نوعیت مجھے معلوم نہیں ہوتی جو صحابیت کے انوار کی تھی۔

عالم ربانی کی صحبت اور کیسٹ کے بول کا فرق...... صحبت کا اثر ایک ایسی بدیہی بات ہے جس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، اب یہی ریڈیو ہے، آپ ریڈیو سے دینی تقریر سنیں جو ایک عالم ربانی نے کی ہے، قلب پر وہ اثر نہیں پڑے گا جو آپ براہ راست اس کی زبان سے سنیں، مشین بولے گی مگر اس میں وہ رنگ اور کیفیت نہیں ہوگی، یہ تو صرف الفاظ نقل ہوں گے جب متکلم بولے گا اس کے الفاظ میں اثر ہوگا، کیونکہ زبان قلب کی ترجمانی کرتی ہے قلبی کیفیات بھی زبان سے ادا ہو رہی ہیں، الفاظ کے اندر لپٹ کر آ رہی ہیں اور قلب میں پہنچ رہی ہیں، تو یہ کیفیت لفظوں کے ذریعہ پہنچی، تو وہ برکت اور نورانیت مشین کے بول میں نہیں ہوتی بس کانوں کو حظ حاصل ہو جاتا ہے کہ بہر حال کلمات تو خیر ہی کے ہیں، کوئی اہل دل ہو تو اسے اپنی کیفیات کا استحضار ہو جاتا ہے، ریڈیو کے اندر سے کوئی کیفیت نکل کر قلب میں نہیں آتی، بلکہ ان الفاظ سے اپنی کیفیات یاد آ جاتی ہیں، اور تازگی دل میں پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح ہم قرآن کریم اس سے سنیں تو اس سے کوئی کیفیت نکل کر قلب میں نہیں آئے گی، الفاظ قرآن سن کر اپنی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اجاگر ہو جائے گی، بخلاف ایک عالم اور ایک درویش ربانی کے کہ وہ جب کلام کرے گا تو اس کے اندر سے نکل کر ہمارے قلب میں پیوست ہوگا وہ اس کی قلبی کیفیات ہوں گی جو لفظوں کے واسطے اور زبان کے واسطے سے ہمارے دلوں میں پہنچیں گی، یہ چیز سوائے صحبت کے نہیں آ سکتی، مشین کی صحبت سے وہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی جو متکلم کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے۔

تاثیر محبت میں مواجہت کا اثر...... حتیٰ کہ یہاں تک فرق ہے کہ ایک مجلس میں سو آدمی بیٹھے ہوئے ایک عالم کا کلام سن رہے ہیں جو سامنے بیٹھا ہوا ہے، اس کے قلب پر جو تاثیر ہوگی پشت پر بیٹھے ہوئے کی نہیں ہوگی، یہ قدرتی چیز ہے، اس لئے کہ قلب کا قلب سے مواجہ ہوتا ہے جب کیفیت براہ راست ٹکر کھاتی ہے، وہ زیادہ متاثر ہوتا ہے اور پچھلا آدمی ریڈیو کی طرح الفاظ سن رہا ہے، پوری طرح کیفیات منتقل نہیں ہو رہی ہیں اس لئے اس پر وہ اثر نہیں ہوتا۔ امام ابو حنیفہؒ کے واقعات میں ہے کہ جو ذہین طلباء کرام ہوتے تھے، انہیں فرماتے کہ وہ سامنے بیٹھیں، جو غبی

اور کند ذہن ہوتے ، انہیں پیچھے بھیج دیتے تھے خدانخواستہ اگر وہ نہ بھی قبول کریں تو کوئی پرواہ کی بات نہیں، اس سلسلہ میں دلیل یہ بیان فرمائی کہ زبان جس چیز کوادا کرے گی وہ قلبی کیفیات ہوں گی اور قلب کا قلب سے مواجہ ہوگا تو کیفیات ٹکر کھائیں گی، تو وہ براہِ راست جا کر قلب میں اتر جائیں گی، پشت پیچھے بیٹھنے سے کیفیت نہیں ٹکراتی صرف آواز ٹکراتی ہے تو کان میں معمولی سی کیفیت پیدا ہوگی، یہ بھی صحبت کی بات ہے۔

صحبت سے جو دین پیدا ہوتا ہے وہ کتاب سے نہیں پیدا ہوتا......اس واسطے قرآن کریم نے تاکید فرمائی ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ ① اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کی معیت اختیار کرو، معلوم ہوا سب سے بڑی موثر چیز معیت وصحبت ہے، ماحول سے جو دین پیدا ہوتا ہے وہ کتاب وکاغذ سے پیدا نہیں ہوتا، اسلام نے جہاں عظیم الشان قانون پیش کیا ہے وہاں ایک ماحول بھی بنایا اس لئے کہ ماحول کے دائرے میں جو آجاتا ہے وہ دین کا رنگ قبول کر لیتا ہے۔

---

① پارہ: ۱۱، سورۃ: التوبۃ، الآیۃ: ۱۱۹.

حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ کے چشم دید تین ماحول

اوران کے آثار میں نے اپنی زندگی میں تین ماحول دیکھے اور تینوں کے مختلف اثرات دیکھے

گنگوہ کا ماحول......سب سے پہلے حضرت اقدس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کا ماحول، اس وقت میری عمر سات آٹھ برس تھی، کوئی زیادہ شعور نہیں تھا بچپن کی بات تھی کوئی زیادہ تمیز نہیں تھی لیکن میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اینٹ اینٹ سے اللہ اللہ کی آواز نکل رہی ہے، یہ کیفیت طاری ہوتی تھی، خانقاہ کے سامنے ایک تالاب تھا اب بھی ہے، اور بڑا تالاب ہے، شہر بھر کے کپڑے دھوبی اسی تالاب میں دھوتے تھے کوئی پچاس ساٹھ دھوبی ہوتے، اور ہر دھوبی کا ایک لکڑی کا پٹڑا لگا ہوا ہوتا جس پر وہ کپڑوں کو دے دے کر مارتے ہیں اور دھوتے ہیں تو روزانہ پچاس ساٹھ دھوبی کپڑے دھوتے ہیں، تو میں نے یہ خود سنا دھوبی ان پڑھ جاہل، کوئی شعور انہیں نہیں، بس سیدھے سادھے مسلمان تھے، لیکن کپڑے پٹڑے پر دے کر مارتے ہیں، اور الا اللہ الا اللہ کی ضربیں زبان سے نکل رہی ہیں اور اللہ کے ذکر سے تالاب گونج رہا ہے، ہر کپڑے کی ضرب کے ساتھ ایک ضرب الا اللہ کی بھی ہے تو دور تک آواز آتی تھی کہ ذکر اللہ ہو رہا ہے، لوگ یہ سمجھے کہ یہ ذکر خانقاہ میں ہو رہا ہے، حالانکہ وہ خانقاہ سے باہر دھوبی ہیں، مگر خانقاہ کے ماحول کا اثر ان دھوبیوں پر بھی ہے، اس لئے کہ خانقاہ میں ہر وقت چونکہ ذکر اللہ ہوتا تھا ذاکرین وشاغلین جمع ہوتے اور اللہ اللہ کر رہے ہوتے، تلاوت میں مشغول ہوتے، ان کے اثرات ان پر بھی پڑتے تو ان کی زبان سے بھی اللہ اللہ نکل رہا ہے اور الا اللہ کی ضربیں لگا رہے ہوتے۔ بہرحال یہ ماحول کا اثر ہے غرض ایک ماحول میں نے اپنی زندگی میں ابتدائی دور بچپن میں یہ دیکھا۔

حضرت امام ربانی قدس سرہ کے وصال کے اثرات......جب حضرت امام ربانی گنگوہی قدس اللہ سرہ کا وصال ہو گیا تو حضرت شیخ الہندؒ میرے والد مرحوم، مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا میاں اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہم، یہ سب حضرات گنگوہ روانہ ہوئے اور ایک ٹٹو کرایہ کا لے لیا کہ باری باری سے اترتے چڑھتے چلے جائیں گے، سادہ زندگی تھی، گنگوہ دیوبند سے بائیس کوس ہے، غرض یہ بڑے بڑے بزرگوں کا قافلہ چلا کہ میل بھر یہ سوار ہوں گے پھر یہ اتر جائیں گے میل بھر فلاں سوار ہوں گے، مجھے بھی ساتھ لیا اور یہ طے پایا کہ اس بچے کو اپنے آگے بٹھا دیا جائے، میری عمر نو برس ہوگی، اور اس وقت زیادہ بچہ بھی نہیں تھا، مگر بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بائیس کوس تک میں ہی بیٹھا رہا، سارے اکابر پیدل ہی چلتے رہے، کوئی بیٹھا ہی نہیں، خیر گنگوہ پہنچے، خانقاہ میں جب قدم رکھا تو میرے بچپن کی

بات تھی، مگر میں نے پریشان ہو کر کہا کہ: ابا جان! خانقاہ کو کیا ہو گیا؟ فرمایا! ہاں ہاں کیا ہوا بھائی؟ میں نے کہا کہ اس میں یوں معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی روکھا پن ہو، کوئی رونق ہی نہیں رہی، کہ برکت ہی معلوم نہیں ہوتی؟ ان بزرگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور فرمایا دیکھو حضرت کے وصال کا اثر اس بچے نے بھی محسوس کیا کہ کسی چیز کی خانقاہ میں کمی ہو گئی، اینٹیں وہی ہیں حجرے وہی ہیں، مدرسہ بھی ہے مگر اس نے محسوس کیا کہ کوئی چیز گم ہو گئی، تو یہ اس بچے تک کا احساس ہے تو بڑے کتنا محسوس کرتے ہوں گے، صاحب دل کتنا احساس کرتے ہوں گے وہ فی الحقیقت اسی ماحول کا اثر تھا جسے میں پہلے دیکھ چکا تھا، برس دن کے بعد آ کر دیکھا تو رنگ پھیکا پڑ چکا تھا، تو اس عمر میں مجھے بھی احساس ہوا کہ یہاں سے کوئی چیز گم ہو گئی ہے، یہ تو تھا وہاں کے ماحول کا اثر کہ ذکر اللہ کی توفیق خود بخود ہوتی۔

تھانہ بھون کے ماحول کے آثار...... دوسرا ماحول تھانہ بھون کا دیکھا کہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے یہاں معاملات کی صفائی پر بہت زیادہ زور دیا جاتا کہ دیانت کو ملحوظ رکھا جائے، تنہائی ہو مجمع ہو، اصول شریعت کے مطابق جو معاملات کی روش ہو وہ ہونی چاہئے، ہر شخص یہ چاہتا کہ میرے سے کسی کو اذیت نہ ہو، ہر معاملہ میں سچائی ہو، مجھے یاد ہے کہ ایک شخص اپنا رومال مسجد کے صحن میں بھول گیا تین دن رومال وہیں پڑا رہا، اس کی اجازت بھی نہیں تھی کہ اٹھا کر حفاظت سے رکھو، ممکن ہے مالک آئے اسے یاد آئے کہ وہاں چھوڑا تھا اور نہ ملے تو اسے چیز کے نہ ملنے سے اذیت ہو، تو تین دن تک وہیں پڑا رہا، یہ قلب کی دیانت کا اثر تھا کہ کسی کو یہ جرأت نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر کہیں رکھ دے، خانقاہ میں جتنے حجرے تھے کبھی کسی حجرے میں تالہ نہیں لگتا تھا، زنجیر نہیں لگتی تھی سامان رکھا ہے، صندوق کھلے پڑے ہیں، زنجیریں کھلی پڑی ہیں، طلبہ باہر گئے ہوئے ہیں، مریدین موجود نہیں ہیں، کسی چوری چکاری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، ماحول کے اثرات سے اتنی دیانت قلوب میں تھی کہ نہ کسی کی کوئی چیز گم ہوتی تھی اور نہ کوئی کسی کے لئے اذیت کا باعث بنتا تھا غرض یہ ماحول تھانہ بھون کا دیکھا۔

دارالعلوم دیوبند کے ماحول کے آثار...... تیسرا ماحول دارالعلوم دیوبند کا دیکھا، وہاں اعمال پر زیادہ توجہ ہے اخلاق پر توجہ بالواسطہ ہے، بلا واسطہ جیسے خانقاہوں میں تربیت اخلاق ہے وہ رنگ نہیں، مگر اعمال کے واسطے سے اصلاح اخلاق کی تربیت کرتے ہیں بہر حال اعمال کا زور ہے، اس ماحول میں رہ کر کوئی چاہے نہ چاہے مگر اسے نماز پڑھنی پڑے گی، جب ڈیڑھ ہزار آدمی اذان ہوتے ہی حجروں سے نکل کر ایک دم مسجد میں پہنچیں گے تو ایک آدمی کیسے بیٹھا رہے گا، اسے بھی مسجد میں جانا ہی پڑے گا، بقول مولانا سعید احمد صاحب مرحوم جب مجلس شوریٰ میں آئے تو ٹھنڈی جگہ تہہ خانہ قیام تھا، ظہر کی اذان ہوئی تو میں نے کہا حضرت! چلئے نماز کے لئے، نماز کو آ گئے دو گھنٹہ بعد عصر کی اذان ہوئی، تو میں نے کہا چلئے نماز کے لئے، پھر مغرب نماز کا وقت آیا، میں نے کہا چلئے نماز کے لئے کہنے لگے!

بھائی! تمہارے ہاں جو پچاس نمازیں معراج میں فرض ہوئی تھیں، ساری کی ساری یہاں باقی ہیں، جب دیکھو نماز کو کہو، غرض ایک ماحول کا اثر ہے کہ نماز کے لئے طبیعت میں امنگ پیدا ہوتی ہے، وہ اس ایریا اور ماحول کا

اثر ہے، بہرحال تین قسم کے ماحول دیکھے اور تینوں کے اثرات جدا تھے، اور وہ اثرات طبیعت پر پڑتے تھے، دیوبند آ کر نمازی بننے کا شوق ہوتا تھا، تھانہ بھون جا کر صفائی معاملات کا شوق ہوتا تھا، گنگوہ پہنچ کر ذکر اللہ کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، اس لئے کہ تینوں جگہوں کے ماحول کے یہی اثرات ہیں اور وہی قلوب پر پڑتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دین کی مضبوطی نبوی ماحول کی وجہ سے تھی...... اس لئے قرآن کریم نے جہاں تقویٰ وطہارت کی تعلیم دی ہے وہاں یہ بھی فرمایا کہ ﴿كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ سچوں کی معیت اور صحبت اختیار کرو اور ماحول ایسا بناؤ کہ خواہ مخواہ دین تمہارے اندر رچ جائے، دین کی طرف تمہاری توجہ ہو جائے، بہرحال سب سے بڑی چیز اسلام میں ماحول ہے، حضراتِ صحابہ کرامؓ کا دین اسی لئے مضبوط تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ماحول میں رہے ہوئے ہیں اور رنگ اٹھائے ہوئے ہیں، سیکھے ہوئے ہیں۔

حضراتِ متقدمین کے ہاں صحبتِ شیخ کا درجہ...... اسی واسطے سلف کے زمانے میں یہ اصطلاح نہیں تھی جو ہمارے دور میں ہے کہ فلاں استاذ ہیں اور یہ ان کے شاگرد ہیں، بلکہ شاگردوں کو صاحب کہتے تھے اصحابِ ابی حنیفہؒ، اصحابِ شافعیؒ، اصحابِ عبداللہ بن مسعودؓ، اصحاب ابن عباسؓ اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ کہ جو شاگرد صحبت نہیں اٹھائے ہوئے تھے، ان کے علم کا بھی سلف میں اعتبار نہیں کیا جاتا تھا کہ معلوم نہیں صحیح سمجھا ہے کہ نہیں؟ اس نے صحبت تو اٹھائی نہیں، محدثین کے ہاں جو سند بیان کی جاتی ہے اور سند میں افراد کے نام آتے ہیں کہ فلاں نے فلاں سے روایت کی اس نے مجھ سے کی، اس نے مجھ سے، تو امام بخاریؒ کے ہاں شرط یہ ہے کہ جس کو اپنے استاذ اور شیخ سے صحبت زیادہ ہوگی، اتنی ہی اس کی حدیث زیادہ قابل اعتبار اور قابل قبول ہوگی، اور جس نے محض کانوں سے سنا اور صحبت نہیں اٹھائی اس کی روایات کم درجے کی سمجھتے ہیں، امام بخاریؒ قبول نہیں کرتے، تو صحبت یافتہ ہونے سے وہ جو قلبی کیفیات ہیں وہ قلب کے اندر منتقل ہو جاتی ہیں اور دور سے آدمی سنے تو علم کے الفاظ منتقل ہوتے ہیں، قلب کی کیفیات منتقل نہیں ہوتیں۔

صحبت سے قلبی کیفیات پیدا ہو کر محرک عمل بنتی ہیں...... اور عمل کا تعلق انہی قلبی کیفیات سے ہے جن سے جذبات عمل پیدا ہوتے ہیں، اس واسطے ضرورت سمجھی گئی کہ صحبت اختیار کی جائے ملازمت اور معیت کو اپنایا جائے جو زیادہ صحبت یافتہ ہوگا اس کا دین زیادہ پکا ہوگا، جو کم صحبت یافتہ ہوگا اس کے دین میں کمی آئے گی اور اگر صحبت بالکل نہیں تو اور زیادہ کمی رہے گی۔

غیر صحبت یافتہ علماء ظہور فتن کا سبب بنتے ہیں...... تجربہ ہے کہ دنیا میں جتنے فتنے پھیلے ہیں جس سے مذاہب اور پارٹیاں بن جاتی ہیں یہ زیادہ تر ان علماء سے پھیلتے ہیں جو صحبت یافتہ نہیں ہوتے، فقط قرآن وحدیث کے الفاظ ان کے سامنے ہوتے ہیں اسلاف کا وہ رنگ ان کے قلوب میں نہیں ہوتا جو بزرگوں میں ہوا کرتا ہے اس لئے ان

سے فتنہ زیادہ پھیلتا ہے، اور جو عالم زیادہ صحبت یافتہ ہوگا، زیادہ دیانت قائم کئے ہوئے ہوگا اس سے فتنہ نہیں پھیلے گا، زیادہ فتنہ پردازوہ ہوتے ہیں کہ ان کے پاس علم موجود ہے۔ صحبت میسر نہیں ہوتی، اخلاق درست نہیں ہوتے، اخلاق کے اندر پختگی نہیں پیدا ہوتی، تو ان کے کلمات سے زیادہ تر بے ادبی اور گستاخی کا فتنہ پھیلتا چلا جاتا ہے، یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ مصر، شام یا عراق ہوا ول تو وہاں علم کی ہی کمی ہے لیکن اگر علم بھی ہے تو چونکہ صلحاء اور اہل اللہ کی صحبت میسر نہیں وہ علم اور وبالِ جان اور مارِ آستین ان کے حق میں بنا ہوا ہے، بقول حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ۔

علم را بردل زنی یارے بود　　　علم را برتن زنی مارے بود

علم کو نوک زبان پر رکھو گے تو سانپ اور بچھو ہے، یہ ڈسے گا اور علم کو دل میں اتارو گے تو یار اور دوست بن جائے گا جو آخرت تک پہنچائے گا۔

بلاصحبت علم زبان تک رہتا ہے...... اس لئے کہ دل میں علم ہوتا تو دل کی کیفیات دل کے اخلاق تک کو درست کردے گا، اور اگر علم کا دل پر اثر نہیں زبان پر ہے تو وہ علم کی نمائش ہے، جیسے آدمی لباس سے اپنے کو بڑا ظاہر کرتا ہے، یہ اپنے کلمات سے اپنے کو بڑا ظاہر کرتا ہے، تو وہ علم تجمل کے لئے ہے نمائش کے لئے ہے دل کی اصلاح کے لئے نہیں ہے، اصلاح جب ہوگی جب علم کو دل کے اندر اتار لیا جائے، اخلاق درست کئے جائیں، وہ بلاصحبت اور بلامعیت کے نہیں ہوتے۔

تکمیل علم کی سَند بغیر صحبت نہیں ملتی تھی...... ہمارے طالب علمی اور بچپن کے زمانے میں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ نو دس سال رہ کر ایک طالب علم نے علم حاصل کرلیا، لیکن اکابر اس کو سند نہیں دیتے تھے، جب تک جماعت کے بزرگوں میں سے کسی کے پاس چھ مہینے رہ کر اپنی اصلاح نہ کرائے، اور صحبت یافتہ ہو کر اس کا رنگ نہ قبول کرلے، اس کے بغیر وہ سند نہیں دیتے تھے، کیونکہ صحبت کے بغیر محض ایک نمائش اور گرمی بازار اور گرمی محفل کا ذریعہ رہ جاتا ہے۔

ازالہ شبہات میں تاثیرِ صحبت، حضرت تھانویؒ کا واقعہ...... ایک دفعہ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ کے یہاں ایک شخص کا خط پہنچا، اس نے لکھا کہ میں ایم، اے ہوں اور لندن میں رہا ہوں، کیمبرج یونیورسٹی میں میں نے پڑھا ہے، مجھے اسلام کے بعض مسائل میں شبہ ہے، یا تو آپ انہیں حل کردیں ورنہ میں عیسائی ہو جاؤں گا۔ حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ ایسی باتوں کے تفصیلی جوابات تحریر میں نہیں آسکتے، اگر کبھی اس لائن سے گذر ہو تو آپ چند گھنٹوں کے لئے تھانہ آجائیں تو زبانی بات چیت ہوگی، اس میں کچھ عرض کروں گا، حضرتؒ نے یہ جواب دے دیا، ہفتہ بھر نہیں گذرا تھا کہ ایک شخص آپ سے ملنے سوٹ بوٹ میں ہیٹ لگائے ہوئے بالکل انگریز صورت اچانک تھانہ بھون آگیا، حضرتؒ کو اطلاع کرائی گئی، کسی نے کہا حضرت! کوئی گریجویٹ ہے بالکل انگریز کی صورت ہے فرمایا، بلالو اور مجلس میں وہ حاضر ہوئے، اس نے آکر سلام علیکم کہا، اور سلام کرتے ہی کہا کہ میں وہی ہوں جس نے خط لکھا تھا کہ میں نے ایم اے کیا ہوا ہے یا تو میرے سوالات کا جواب دیا جائے ورنہ میں عیسائی ہو جاؤں

گا، حضرتؒ نے فرمایا اچھا بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گیا حضرتؒ کے ہاں مختلف علمی مسائل کا تذکرہ ہورہا تھا وہ سنتا رہا، جب وہ مجلس ختم ہوئی تو حضرتؒ نے فرمایا: ہاں اب آپ فرمایئے کیا کہنا ہے؟ تو بجائے اس کے وہ کوئی شبہ ذکر کرتا پھر وہی جملہ کہا کہ صاحب! مجھے اسلام پر شبہات ہیں یا تو آپ انہیں حل کردیں، ورنہ میں عیسائی ہوتا ہوں، اور کچھ زور سے کہا، حضرتؒ کو غصہ آیا، اس زور سے کے طمانچہ رسید کیا کہ اس کا منہ پھر گیا، فرمایا: مردود! اگر تو عیسائی ہوگیا تو تیرے عیسائی ہونے سے اسلام میں کمی آجائے گی، دور ہوجا، چاہے یہودی بن چاہے عیسائی! اسلام کو تیری کوئی پرواہ نہیں، تو اسلام پر دباؤ ڈالتا ہے۔

بہرحال اس زور سے مارا کہ اس کا منہ پھر گیا، حالانکہ حضرتؒ کی عمر بڑھاپے کی اور وہ جوان آدمی، بہرحال اس زور سے مارا اس نے سوائے اس کے کہ رونا شروع کیا اور کچھ نہیں بولا، اور حضرتؒ نے فرمایا اس کو نکال دو یہاں سے خدام نے نکال دیا اب وہ خانقاہ کی سیڑھیوں میں بیٹھا رورہا ہے، صبح کا وقت تھا گیارہ بجے حضرتؒ مجلس سے اٹھے، اور وہاں سے گذرے تو وہ وہاں رونے میں مشغول، حضرتؒ دیکھ کر چلے گئے حضرتؒ نے کچھ نہیں فرمایا، مکان چلے گئے، گرمی کی دوپہر تھی، ظہر کے وقت جب حضرت آئے تو وہ وہیں سیڑھیوں کے اوپر بیٹھا ہوا ہے، خیر ظہر کی نماز ہوئی پھر مجلس شروع ہوئی تو فرمایا کہ اسے بلاؤ۔ اب وہ آئے، بٹھلا کے فرمایا، کیا شبہات ہیں؟ اس نے کہا ایک بھی شبہ نہیں اسلام حق ہے، بالکل میرے دل میں یہ بات بیٹھ چکی ہے کہ اسلام ہی حق ہے، اس کے سوا کوئی چیز حق نہیں ہے اور اب مجھے کوئی شبہ نہیں ہے، بس وہ ایک ہی تھپڑ میں سارا کام ہوگیا، پھر حضرتؒ نے نصیحت فرمائی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محض تھپڑ نہیں مارا، بلکہ روحانی لحاظ سے کوئی توجہ فرمائی جس میں کوئی باطنی تصرف بھی شامل تھا، ورنہ اگر نفسانی جذبے سے مارتے تو اسے جوش اٹھتا کہ صاحب! آپ کو کیا حق تھا، یہ کون سی تہذیب کی بات ہے کہ ایک آدمی مفتی کے پاس سوال کرنے آئے، فتویٰ پوچھنے آئے وہ تھپڑ مارے، اگر نفسانی جذبہ سے ہوتا تو وہ دس نخیں نکالتا، چونکہ روحانی جذبہ تھا اور مقصود اس کی تربیت تھی ایذاء نہیں تھی، تو اس تصرف کا اس پر یہ اثر پڑا کہ اس نے رونا شروع کیا، ورنہ ایک تھپڑ کھا کے آدمی چھ گھنٹے بیٹھ کے روئے، اور اس درجہ میں اس کا باطن پاک ہوجائے کہ اسے کوئی شبہ ہی باقی نہ رہے، نفسانی جذبے سے یہ تاثیر ممکن نہیں۔ اس کے بعد پھر حضرتؒ نے اس کو نہایت شفقت سے نصیحت فرمائی، اور فرمایا کہ انسان کو شبہ طبعی طور پر پیش آتا ہے لیکن یہ صورت اختیار نہیں کرنی چاہیئے کہ یا شبہ حل ہو ورنہ میں اسلام سے پھر جاؤں گا، بسا اوقات شبہ اتنا قوی ہوتا ہے، یا شیطان کا اثر اتنا قوی ہوتا ہے کہ جواب بن نہیں پڑتا، مگر دل مطمئن ہوتا ہے، کہ بہرحال دین حق یہی ہے گو شبہ بھی اپنی جگہ قائم ہے شبہ اوپر اوپر ہوتا ہے دین دل کے اندر گھسا ہوا ہوتا ہے ہزاروں وسوسے پیش آتے ہیں، ان کو آدمی اس طرح پیش کرے کہ یا تو جس طرح میں چاہوں حل ہوں ورنہ میں دین سے پھر جاؤں گا یہ بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے، پھر وہ صاحب وہاں سے ایسے دیندار بن کے واپس ہوئے کہ نہ ان کی وہ کرّ و فر رہی

، نہ گریجویٹی رہی، نہ وہ کیمبرج یونیورسٹی کے آثار رہے، ایک سچے دیندار بن گئے۔ پھر انہوں نے حضرتؒ کے ہاں وقتاً فوقتاً آنا شروع کیا، خاصا اس کا دین مضبوط ہوگیا، تو یہ آثار کتاب کے پڑھنے سے نہیں ہوتے، صحبت سے ہوئے، اور صحبت میں تھپڑ کھانے سے ہوئے، وہ بھی دراصل صحبت ہی تھی، الغرض سب سے بڑی چیز دین کی پختگی ہے وہ صحبت سے ہی آتی ہے۔

سو برس کی عبادت سے چند لمحات کی صحبت کیوں افضل ہے؟...... اس وجہ سے حضرت مولانا رومی نے کہا کہ ؎

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

سو برس تک بلا ریا کاری عبادت کرے، اس سے ایک گھنٹہ کی اہل اللہ کی صحبت بہتر ہے، تو اس کی بناء یہی ہے کہ اس ایک گھنٹے کی صحبت میں قلب کا راستہ اتنا صحیح ہو جاتا ہے کہ سو برس کی عبادت کی لائن بچھ جاتی ہے، اس لئے اس کو افضل کہا گیا۔

ہمارے بھائی ادریس، جو آج کل جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہیں، مولانا ادریس کاندھلویؒ میرے بے تکلف ساتھیوں میں سے ہیں، ہم ایک ہی ساتھ میں مولوی بدر عالمؒ، مولوی ادریسؒ اور مفتی شفیعؒ ہم چار آدمیوں کی بہت دوستی تھی، ایک ہی ساتھ پڑھتے تھے، تو مولوی ادریسؒ نے ایک رسالہ مسئلہ تقدیر پر لکھا، اور بڑے عالمانہ انداز سے لکھا، حضرت اقدس تھانویؒ کی خدمت میں دکھلانے کے لئے لے گئے، اور یہ سمجھ کے لے گئے کہ یہ نہیں کہ فقط حضرت والا تائید فرمائیں گے، بلکہ کہیں گے کہ بھائی ایسا لکھا کہ کوئی لکھ ہی نہیں سکتا، اب جا کے حضرتِ اقدسؒ کی خدمت میں لکھا ہوا پیش کیا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی فرصت میں دیکھوں گا، دوپہر کو جب آؤں گا تو مطالعہ کروں گا، پھر کچھ لکھ دوں گا، حضرتؒ نے دوپہر کو مطالعہ فرمایا، ظہر کے بعد سب لوگ جمع ہوئے اور مولوی ادریسؒ بھی موجود تھے، حضرتؒ نے فرمایا مولوی ادریس! یہ رسالہ تم نے لکھا ہے؟ کہا حضرت! میں نے لکھا ہے فرمایا اتنا غلط کہ اوّل سے لے کر آخیر تک سرتا پا غلط، اہلسنت کا یہ مسلک ہی نہیں، تم جیسا فاضل آدمی اتنا غلط لکھے؟ اس کے بعد حضرتؒ نے اغلاط سمجھائیں، تو واقعی ان پر منکشف ہوا کہ یہ یہ اغلاط ہیں، اس پر حضرتؒ نے فرمایا اس کو یوں بدلو، پھر مجھے دکھلاؤ، پھر انہوں نے صحیح کیا، اس پر حضرت اقدسؒ نے ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ بھائی! نظر تمہاری وسیع ہے، ہماری نظر اتنی وسیع نہیں، مگر تم بڈھوں سے مستغنی نہیں ہو سکتے، فرمایا جو تم بیس برس میں کتابیں کھنگال کر رائے قائم کرو گے، بڈھوں کے ہاں وہ تجربہ شدہ منٹوں میں مل جائیں گی، تم بڈھوں سے مستغنی نہیں بن سکتے کتنے ہی بڑے عالم بن جاؤ۔ اس میں اشارہ ہی صحبت کی طرف تھا کہ کتاب سے علم کے الفاظ حاصل ہوں گے، اور صحبت سے حقائق حاصل ہوں گے علم کی کیفیات قلب میں پیدا ہوں گی۔

تو دین کی بنیاد صحبت سے پیدا ہوتی ہے، اگر یہ ضروری نہ ہوتا تو قرآن کریم اتار دیا جاتا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں نہ بھیجا جاتا، کیا اہل عرب قرآن کریم نہیں سمجھ سکتے تھے۔؟ پیغمبروں کو ہر کتاب کے ساتھ بھیجا کہ وہ صحبت کے ذریعے ان کیفیات کو دل کے اندر اتار کر دین پیدا کریں، بہر حال صحبتِ اہل اللہ جز اور بنیاد ہے دین کی، بلا صحبت دین کی بنیاد نہیں ہوتی، وہ کسی وقت بھی متزلزل ہو سکتا ہے، اس میں پائیداری ناممکن ہے اس لئے الفاظ علم سے بھی زیادہ ضروری صحبتِ اہل حق ہے۔

حکیم الاسلام
حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ
کی علمی خدمات کتابیاتی جائزہ

مرتبہ
حافظ قاری بشیر حسین حامد صاحب
(ایم اے اردو) ایم اے اسلامیات

گورنمنٹ کالج شیروان، ایبٹ آباد کے شکریہ کے ساتھ

محترم المقام بھائی بلال صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر وعافیت ہوں گے ''خطبات حکیم الاسلام'' (گیارہ جلدوں میں'' بلاشبہ آپ کے ادارے کا عظیم کارنامہ ہے، واقعی علوم قاسمیہ کی اشاعت میں آپ کا بہت حصہ ہے، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائیں، حضرت قاری صاحب کے علوم بحر ذخار کی مانند ہیں، جن کا احاطہ ہم جیسے بے مایہ انسانوں کے بس سے باہر ہے، ان خدمات کا احاطہ (جن میں آپ کی تصنیفات/ تقاریر وخطبات، تقاریظ ومقدمات، مکتوبات وملفوظات شامل ہیں) ایک مستقل کام ہے، اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے چند سالوں کی کوشش وسعی سے یہ کام انجام کو پہنچا، میں اگر چہ اس کی جامعیت ومانعیت کا دعویٰ نہیں کرسکتا، مگر میں نے اپنی بساط کے مطابق بہت تلاش وجستجو کے بعد یہ مواد اکٹھا کیا تا کہ کم از کم حضرت قاری صاحب پر کام کرنے والوں کے سامنے ان کی خدمات کا ایک خاکہ موجود ہو، اللہ تعالیٰ اس حقیری کوشش کو قبول فرما کر آخرت کا ذخیرہ بنادیں۔ اگر آپ حضرات کا مشورہ اس مسودہ کی طباعت کے بارے میں ہوجائے تو یہ یقیناً بندۂ ضعیف پر احسان عظیم ہوگا۔ اس کے علاوہ حضرت قاری صاحب کے مختلف کتابوں پر جو مقدمات/ تقاریظ/ پیش لفظ/ تصدیقات تحریر فرمائے ہیں وہ بھی اکٹھے کیے گئے ہیں ۲۵/۳۰/ کے لگ بھگ ہوں گے، ان کی فہرست اسی مسودہ کے ص: ۸ پر موجود ہے، ان کی اشاعت بھی یقیناً حضرت قاری صاحب کی روح کی ٹھنڈک کا سامان ہوگی۔ دعاؤں کا متمنی

والسلام......بشیر حسین حامد

حافظ قاری بشیر حسین حامد

(ایم اے اردو) ایم اے اسلامیات

گورنمنٹ کالج شیروان (ایبٹ آباد)

تاریخ......۹۸/۲/۲۱ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّابَعْدُ!

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وجود مسعود اس امت کیلئے باعث رأفت ورحمت تھا وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک جماعت تھے،اکیلئے آپ نے اپنی زندگی میں جتنا کام کیا وہ مستقل ایک ادارے کے بس کا بھی نہیں تھا وہ ایک عہد آفرین اور عہد ساز شخصیت تھے،جنہوں نے نہ صرف پورے عالم میں دارالعلوم کا تعارف کرایا بلکہ علمائے دیوبند کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کی علمیت وثقاہت کا لوہا منوایا،پورے عالم اسلام میں فکر ولی اللہی اور حکمت قاسمیہ کے ترجمان کی حیثیت سے پہچانے گئے،انھوں نے ہر لائن میں چاہے وہ تصنیف وتالیف کا شعبہ ہو،درس وتدریس کا فن ہو،تقریر وخطابت کا میدان ہو یا اہتمام وانصرام کا دائرہ ہو،اپنی خداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عزم وہمت،بصیرت ودانائی،طبعی حلاوت،مٹھاس اور شخصی کشش وجاذبیت،قدرتی فہم وذکا اور آبائی نسبت کی بدولت ایسے جوہر دکھلائے کہ صدیوں ان کا مثیل پیدا ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

حضرت قاری صاحب کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں علمی دنیا میں ان کا نام نہ ذہنوں سے بھلایا جاسکتا ہے،نہ زبانوں سے مٹایا جاسکتا ہے،وہ تو عالم اسلام کے علمی حلقوں میں اپنا مقام منوا چکے ہیں،افسوس اس بات کا ہے کہ اتنی عظیم شخصیت پر حلقہ علماء اور خصوصاً حلقہ دیوبند میں کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوسکا اس وقت میرے سامنے آپ کی شخصیت وسوانح پر چند کتب ورسائل میں شامل چھوٹے بڑے مضامین کے علاوہ صرف دو کتب ہیں۔ 1 تذکرہ طیب،مرتبہ محمد ابوبکر غازی پوری،المکتبہ الاثریہ،قاسمی منزل سیدواڑہ غازی پور (انڈیا) 2 ذکر طیب مرتبہ حافظ محمد اکبر شاہ بخاری،ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور (پاکستان) میری اس حقیری کوشش وکاوش کا مقصود یہ تھا کہ تحریر وتقریر کے میدان میں حضرت قاری صاحبؒ کی خدمات کا ایک ایسا خاکہ (جسے کتابیات کا نام بھی دیا جاسکتا ہے) سامنے لایا جائے جس میں حضرت قاری صاحبؒ کی تصانیف کی فہرست،آپ کے مقدمات،تصدیقات وتقاریظ،آپ کے مطبوعہ خطوط،آپ کے خطبات وتقاریر (چاہے وہ کتابی شکل میں طبع ہو چکی ہوں یا رسائل میں) نیز وہ مختلف مضامین وتحریریں جو مختلف کتب ورسائل میں شامل ہوں وہ سب یکجا ہو جائیں تاکہ آپ پر کام کرنے والوں کے لیئے سہولت کا سبب ہو۔میں اپنی کوتاہی وسائل کے پیش نظر ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرسکتا (وہ اگرچہ کئی سالوں کی جستجو وتلاش کا ثمرہ ہے) حضرت قاری صاحب کی تحریری وعلمی خدمات کی تمام

جہتوں پر حاوی ہے، کیونکہ ہندوستان کے پریس سے حضرت قاری صاحب سے متعلق جو کچھ طبع ہوا یا وہاں کے ماہناموں اور ہفت روزوں میں آپ کے مضامین وخطبات طبع ہوئے وہ تمام تر مواد پاکستان میں نہیں پہنچ پاتا، جس کی وجہ سے تحقیق وجستجو کا حق ادا نہیں ہوسکتا، البتہ جو کسی ذریعے سے پاکستان پہنچ پایا، اس سے ضرور استفادہ کیا گیا، امید ہے اس جہت پر کام کرنے والوں کے لئے یہ حقیری کوشش سنگ میل کا کام دے گی۔ ابتدا میں حضرت قاری صاحب کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ حیات طیب کی تقریباً پون صدی پر محیط جدوجہد کا دوسرا رخ بھی سامنے آجائے، اور کام کرنے والے ہر رخ، اور ہر عنوان پر مستقل کام کرسکیں، یہ پون صدی کی جدوجہد اپنے دور کی عکاس ہے اور اگر حضرت قاری صاحب کی زبان سے یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

میری تصویر کے یہ نقش ذرا غور سے دیکھو ان میں اک دور کی تاریخ نظر آئے گی

حافظ بشیر حسین حامد عفی عنہ